(کلام و سوانح)

ترتیب

پیغامات

حرفِ آغاز

یارانِ نو

سروِ رفتہ

رگِ تاک

پیغامات

خوشا وہ قافلہ جس کے امیر کی ہے متاع
تخیلِ ملکوتی و جذبہ ہائے بلند

(اقبال)

ملک خدا بخش

انجمن ترقیِ ادب ماڈل ٹاؤن لاہور کے جشنِ صد مشاعرہ کی ادبی تقریب اور اس کے تذکرۂ شعرا و ادبا "یارانِ نو" کی اشاعت کے موقع پر میں یہ گزارش کرنے کی جسارت کر سکتا ہوں کہ صرف زندگی آمیز اور زندگی آموز شاعری ہی ملک و ملت کے لئے باعثِ خیر و برکت، ذہن و وجدان کے لئے سامانِ جلا اور قلب و نظر کی تسکین کا با اعتماد ذریعہ ہوتی ہے۔ اگر شاعری میں یہ وصف موجود ہے کہ وہ اعلیٰ و ارفع جذبات کی نشو و نما کرے تو یہ فنِ لطیف نسلِ انسانی کے لئے ایک باعثِ تشکر نعمت ہے۔ اور مبارک ہے وہ قوم جس کی دسترس میں یہ پاکیزہ چشمے موجود ہوں۔ بقولِ اقبال ؎

شاعری بے قاہری جادوگری است
شاعری با قاہری پیغمبری است

اگر مشاعرے محض ذہنی تفریح یا ذہنیت کی آسودگی کا ذریعہ ہیں تو ان کی افادیت محلِ نظر ہے۔ ایسی تفریح بسا اوقات انسان کو بے عمل اور گمراہ کر دیتی ہے۔ لیکن اگر مشاعرے اعلیٰ زندگی کی تعلیم کا ذریعہ بن جائیں تو سیرت کی تشکیل و پختگی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

انجمن ترقیِ ادب کے سامنے ہمیشہ شاعری کا وہی روشن پہلو رہا ہوگا جس کی نشان دہی حکیم الامت کر چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انجمن اس سے قبل "اذانِ کارزار" جیسی ولولہ انگیز کتاب منصۂ شہود پر لانے میں کامیاب ہوئی۔ "اذانِ کارزار" کی اشاعت اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ انجمن کے مقاصد میں زندگی کا وہ شرارہ موجود ہے جو بدی کے خرمن پر برق کا ہیولیٰ بن کر لپکتا ہے۔

ملک خدا بخش
وزیر اریگیشن، پاور اینڈ ایجوکیشن (حکومتِ مغربی پاکستان)

۲۰ جون ۱۹۶۶ء

ملک محمد حیات

مجھے یہ جان کر بہت مسرت ہوئی کہ انجمن ترقیٔ ادب ماڈل ٹاؤن لاہور اپنا جشنِ صد مشاعرہ منعقد کر رہی ہے اور ساتھ ہی اس تقریب پر ایک کتاب "یارانِ نو" شائع کر رہی ہے جس میں انجمن کی پنج سالہ سرگرمیوں کا جائزہ اور اس کے ممبر شعرا کا کلام و تذکرہ ہوگا۔

انجمن ترقیٔ ادب ماڈل ٹاؤن لاہور کی یہ ادبی سرگرمیاں بڑی قابلِ ستائش ہیں۔ ان ادبی سرگرمیوں کی قدر و قیمت اس لئے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ اس انجمن نے مبتدی اور نوآموز اہلِ قلم کی جو حوصلہ افزائی کی ہے اُس سے نوجوان شعراء کی ذہنی اور فکری صلاحیتوں کو جلا ملے گی اور ہو سکتا ہے کہ ان نوآموز شعرا میں سے چند ایسے شاعر پیدا ہو جائیں جن کا نام ادب و شعر کی دنیا میں ہمیشہ زندہ رہے۔

مجھے انجمن کے ارکان سے پوری توقع ہے کہ انہوں نے بیش بہا ادبی خدمات کا جو سلسلہ شروع کیا ہے اُسے خلوص کے ساتھ بہر حال جاری رکھیں گے۔ انجمن نے جو کتابیں شائع کی ہیں وہ بھی میری نظر سے گزری ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ادبی ذوق رکھنے والے حضرات انہیں یقیناً پسند کریں گے۔

میری دعا ہے کہ انجمن ترقیٔ ادب ماڈل ٹاؤن لاہور کا جشنِ صد مشاعرہ کامیاب ہو اور "یارانِ نو" قبولِ عام کی سند پائے۔ اور اللہ تعالیٰ انجمن کو اس قسم کے کئی جشن منانے اور ایسی کئی کتابیں شائع کرنے کی توفیق دے۔

والسلام

محمد حیات
وزیر ریلوے، حکومتِ مغربی پاکستان

۵ رجون ۱۹۶۶ء

جسٹس ایس اے رحمن

انجمن ترقی ادب ماڈل ٹاؤن کے صدر جناب عبدالرشید تبسم تشریف لائے۔ کہنے لگے "پیغام دیجئے"۔ پرانے زمانے میں "پیغام" سے مراد شادی خانہ آبادی کی قبیل کی کوئی تجویز ہوتی تھی۔ آج کل "یوم" منانے، ادارہ سازی، خصوصی شمارے یا سیاسی ہنگامہ طرازی کے لئے "پیغام" کا تقاضا ہوتا ہے۔ لیکن تبسم صاحب کا مطالبہ "پیغام" کے پرانے نہ نئے تصور سے لگا کھاتا تھا۔ وہ تو کہہ رہے تھے کہ ان کی انجمن نے سو مشاعرے کر ڈالے ہیں۔ ایک نہیں، دو نہیں، پورے سو۔ وہ بھی اکثر طرحدار اور کسی حد تک بے طرح! بھئی واللہ یعنی سو مشاعرے؟ صاحب! بڑی زیادتی ہے انجمن کی! اور اس پر طرّہ یہ کہ اب وہ اپنے ارکان کا منتخب کلام کتابی صورت میں پیش کر رہی ہے۔ یہ دوسری زیادتی ہوئی! پھر پیغام طلبی۔ کیا یہ تیسری زیادتی نہیں ـــــ؟

مگر یہ سب زیادتیاں گوارا ہیں اگر ان کے ساتھ ادب کی تخلیق وابستہ ہے۔ اور جب ادب کا نام لیتا ہوں تو وہ تمام بے ادبیاں نظر کے سامنے گھومنے لگتی ہیں جو آج کل ادب کے نام پر بے لگام ہو رہی ہیں۔ کوئی تو ان میں سے پرانی اور کوئی تازہ ترین روایت کی پرستار ہے۔ یعنی بعض میں تو محض قافیہ پیمائی جلوہ آرا ہے اور بعض میں وہ بھی نہیں۔ خدا اُن کی کھوکھلی فن کاری سے قوم کو بچائے یہ تو ہماری اقدارِ حیات کی جڑوں کو کاٹ دے گی۔ ہمارے نونہالوں کو یاس اور قنوطیت کے اندھے کنوئیں میں دھکیل دے گی۔ ہماری پھلواری سے رنگ و بُو اڑا کر اسے حشیش کنج میں تبدیل کر دے گی۔ اگر انجمن کے ارکان نے اس سے دامن بچایا ہے تو فطرت انجمن کی سب تقصیریں معاف کر دے گی۔ خدا کی کتاب کا گمراہ شاعروں پر محاکمہ یہی ہے کہ جو کچھ وہ کہتے ہیں اس پر عمل نہیں کرتے۔ اگر

انجمن کے نام لیواؤں نے فکر اور عمل کا رابطہ قائم رکھا ہے تو وہ مبارک بندے ہیں ۔ علم و فن کو معاشرتی ماحول سے الگ رکھنا علم و فن کو بے رُوح بنانا ہے ۔ میری نظر میں جمالیاتی تسکین بھی نسبتِ معاشرہ سے بیگانہ نہیں ۔

۶۵ گلبرگ ۔ لاہور
۹ جون ۱۹۶۶ء

(مسٹر جسٹس) ایس اے رحمٰن
سپریم کورٹ آف پاکستان

لفٹیننٹ جنرل بختیار رانا

پاکستان اور بھارت کے درمیان گزشتہ جنگ کے موقع پر ملک کے ادبی اداروں میں سب سے پہلے انجمن ترقی ادب ماڈل ٹاؤن لاہور نے اپنا اندازِ فکر بدلا اور اس کے شاعر ممبروں نے اس کے ہنگامی مشاعروں میں پاکستان کی عسکری شجاعت کے آتشیں نغمے الاپ کر وطنِ عزیز کی رگوں میں آگ بھر دی۔ پھر اس انجمن کی تقلید میں دوسرے ادبی اداروں کے شعرا بھی آگ اگلنے لگے اور دنیا نے دیکھ لیا کہ کس شدت سے ہمارے ٹینک دشمن کے ٹینکوں سے ٹکرائے، کس برق رفتاری سے ہمارے ہوا باز دشمن کے ہوائی جہازوں پر جھپٹے، کس جرأت اور بیباکی سے ہمارے فوجی کمانڈر ہتھیلی پر سر دھرے دیوانہ وار آگے بڑھے اور کس سرمستی کے عالم میں ہمارے سرفروش سپاہیوں نے دشمن پر یلغار کی اور کس چابکدستی سے ہمارے جانبازوں نے دشمن کے دہانِ توپ کے جبڑے اکھاڑ کر رکھ دیئے۔ قدم قدم پر خدا تعالیٰ نے ہمیں اپنی معجزانہ مدد سے نوازا اور ہم نے اپنے خون کی سرخی سے تاریخِ عالم کا ایک نیا تابناک باب لکھ ڈالا جس پر دنیا حیرت سے انگشت بدنداں رہ گئی۔

ہمارے آتش نوا شعرا کے نغمے میدانِ جنگ میں مجاہدوں کا خون برابر گرماتے رہے اور مجاہدوں کو یہ کامل احساس رہا کہ شعرا کا طبقہ اپنے انداز میں برابر شریکِ جنگ ہے۔ مجھے یاد ہے جب انجمن ترقی ادب ماڈل ٹاؤن لاہور کے پریذیڈنٹ محترم عبدالرشید صاحب تبسم ایم اے نے شعرائے انجمن کی آتشیں نظموں پر مشتمل کتاب "اذانِ کارزار" کی ایک جلد مجھے بھیجی اور اس کے ساتھ اپنے مختصر سے خط میں بتایا کہ انجمن نے اس عسکری شعری تخلیق کے علاوہ بڑی تعداد میں کتب، کپڑے، نقد روپیہ اکٹھا کر کے ملکی دفاع کے لئے دیا ہے تو ہم بے حد متاثر ہوئے۔

تبسم صاحب ملک کے بہترین شاعر و ادیب ہیں۔ اس کے علاوہ یہ خدمتِ ملک و قوم کا کوئی موقع

ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کی تعمیر میں تبسم صاحب کا بڑا حصہ ہے۔ موجودہ دورِ حکومت سے اُنہوں نے بھرپور تعاون کیا ہے۔

مجھے یہ معلوم کر کے بہت مسرت ہوئی ہے کہ انجمن ترقی ادب ماڈل ٹاؤن لاہور اپنی سرگرمیوں کا ایک دور مکمل کر کے عنقریب ایک جشنِ صد مشاعرہ منا رہی ہے جس کی وہ ہر طرح مستحق ہے اور ساتھ ہی "یارانِ نو" کے نام سے ایک کتاب شائع کر رہی ہے جس میں اس کے ممبر شعرا و ادبا کا کلام اور تذکرہ ہوگا۔ میں اس نہایت مخلص انجمن کی تقریبِ صد مشاعرہ کی غیر معمولی کامیابی اور اس کی تصنیف "یارانِ نو" کی ابدی مقبولیت کے لیے دست بدعا ہوں اور اس کی مزید تخلیقی مطبوعات کا بڑے شوق سے منتظر رہوں گا۔

۴ رجون ۱۹۶۶ء

بختیار رانا
لیفٹیننٹ جنرل

محمود اے ہارون

مجھے انجمن ترقیٔ ادب ماڈل ٹاؤن لاہور کی قابلِ قدر سرگرمیوں کا علم بھارت اور پاکستان کے درمیان گزشتہ جنگ کے موقع پر ہوا جب اس نے ادبی محاذ قائم کر کے دوسرے ادبی اداروں کے لیے ایک بڑی اچھی مثال قائم کی۔ جہاں اس انجمن کے ممبر شعرا نے اپنے آتشیں نغموں سے وطن کی فضا کو گرمایا اور دلوں کو سرگرمِ عمل ہونے پر اکسایا وہاں انہوں نے اجتماعی رنگ میں اپنی خدمات حکومت کے سپرد کرنے کے علاوہ میری اپیل پر کتابوں کی ایک خاصی بڑی تعداد اکٹھی کر کے ریڈ کراس کے حوالے کی۔ کپڑوں کا عطیہ اور قومی دفاعی فنڈ میں کافی نقد چندہ جمع کر کے انجمن کے ممبران نے یہ ثابت کر دیا کہ ملک کے دفاع میں وہ کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ اور یہ کہ تخیلات کی دنیا میں بسنے والے ہمارے شاعر اور ادیب وقت آنے پر زندگی کی کھردری اور ناگوار حقیقتوں کا بھی خوب مقابلہ کر سکتے ہیں۔ یہ صورتِ حال ملک کی خوش قسمتی کی دلیل ہے۔

صحت مند ادب کی یہی نشانی ہے کہ اس سے متعلقہ قوم کے بلند کردار کی تعمیر ہوتی ہے اور معاشرہ [illegible] حاصل کرتا ہے۔ جہاں شاعر اور ادیب معاشرے سے متاثر ہو کر اس کی عکاسی کر کے اس [illegible] کو نمایاں کرتے ہیں وہاں وہ اپنی تخلیقات سے معاشرے پر اثر انداز بھی ہوتے ہیں اور [illegible] ہے کہ انجمن ترقیٔ ادب ماڈل ٹاؤن ایک زندگی سے بھرپور ادارہ [illegible] اپنے دائرہ کار میں قومی تقاضوں کو خوب سمجھتی ہے۔ اور ان تقاضوں کو پورا کرنے میں لگی رہتی ہے۔

[illegible] انجمن اپنی قابلِ ستائش تعمیری سرگرمیوں کا ایک دور بڑی کامیابی سے پورا کرنے کے بعد اب جشن منا [illegible] ہے اور اپنے ممبر شعرا و ادبا کا تذکرہ "یارانِ نو" کے نام سے شائع کر رہی ہے۔ میں اس کی اس خوشی میں [illegible] ہوں۔ اور اس کے آئندہ عزائم کی کامیابی کے لیے دستِ بدعا ہوں۔

محمود اے ہارون
وزیر امداد باہمی، معاشرتی بہبود (حکومتِ مغربی پاکستان)

۲۸ مئی ۱۹۶۶ء

میاں محمد شفیع پی سی ایس

شعر و ادب کا ملکہ خدا تعالیٰ کی ایک خاص نعمت ہے جو ہر کسی کو میسر نہیں ہوتی ۔ خدا جسے چاہتا ہے یہ جوہر عطا کرتا ہے ۔ اس لئے اس کی اہمیت اور قدر و قیمت بہت زیادہ ہے ۔ اِس نعمت کا کم از کم اظہارِ تشکر یہ ہے کہ شاعر اور ادیب نوکِ قلم پر وہی بات لائے جسے وہ صحیح سمجھتا ہو ۔ اس کے اظہارِ خیالات سے دنیا میں خوشی کی لہر دوڑ جائے، اُسے پھولوں کے ہار پہنائے جائیں یا اُس سے ساری دنیا ناراض ہو جائے اور یہ اُسے تختہ دار پر کھینچ دینے کی کوشش ہو ۔ شاعر اور ادیب کو ان ہر دو صورتوں کے نتائج سے بالکل بے نیاز ہونا چاہیئے ۔ اُسے بہر حال سچی بات کہنی چاہیئے اور خلوص کو ہاتھ سے نہیں دینا چاہیئے ۔ میں سمجھتا ہوں شاعر اور ادیب کی یہی ایک خوبی ہے جو اسے دوسرے انسانوں سے ممتاز کرتی ہے ۔ اگر اُس میں یہ خوبی نہیں اور وہ خود ہی زمانے کی کسی رَو کے ساتھ بہہ جائے تو وہ میرے نزدیک نہ شاعر ہے نہ ادیب ۔

مجھے اس حقیقت سے بے حد خوشی ہوئی ہے کہ انجمنِ ترقیِ ادب ماڈل ٹاؤن لاہور لمبے عرصہ سے اپنی ادبی و شعری سرگرمیوں سے نہ صرف شعر و ادب میں قیمتی اضافہ کر رہی ہے بلکہ یہاں نو آموز اور مبتدی شعرا و ادبا کی صحیح ذہنی و فکری اصلاح بھی ہو رہی ہے ۔ مجھے یقین ہے کہ اِس انجمن کی پُر خلوص تخلیقات معاشرے کے لئے باعثِ رحمت ثابت ہوں گی اور انہیں اہلِ نظر طبقہ ہاتھوں ہاتھ لے گا ۔

میں اس انجمن کو اِس کے یک صد مشاعروں کی تقریبِ انعقاد اور اس کے شعرا و ادبا کے تذکرہ کی تالیف پہ تہِ دل سے مبارکباد دیتا ہوں اور اس کی کامیابی کے لئے دست بدعا ہوں ۔

میاں محمد شفیع پی سی ایس

ایڈیشنل سیکرٹری پلاننگ اینڈ ڈویلپمنٹ حکومتِ مغربی پاکستان

۱۵ مئی ۱۹۶۶ء

ڈاکٹر مس انور علی محمد

مَیں سمجھتی ہوں کہ ہر وہ تحریک اور ہر وہ ادارہ قابلِ تحسین اور درخورِ حوصلہ افزائی ہے جو انسانی زندگی کے مضمرات اور تعمیری قوتوں کو اُجاگر کرنے میں کوشاں ہو ۔ پھر قومی سطح پر تو ایسی کوششیں اور بھی زیادہ لائقِ تحسین ہیں ۔

مجھے یہ دیکھ کر ہمیشہ خوشی ہوتی رہی ہے کہ اس ادارے کے مطابق انجمن ترقی ادب ماڈل ٹاؤن لاہور بیش بہا خدمات سرانجام دیتی رہی ہے ۔ بالخصوص ملک کے گزشتہ ہنگامی حالات میں اس کے ممبر شعراء نے حُبِ وطن اور غیرتِ قومی کے شجاعت آموز نغمے لکھ کر ملک کے طول و عرض میں ہمارے شعراء و ادبا کے سامنے جو نیا اندازِ فکر پیش کیا اور صحیح وقت پر صحیح جہت میں رہنمائی کی اُس نے معاشرے میں اس انجمن کا مقام بہت اونچا کر دیا ہے ۔

انجمن ترقی ادب ماڈل ٹاؤن اب اپنا جشنِ صد مشاعرہ منعقد کر رہی ہے اور اس موقع سے فائدہ اٹھا کر یہ اپنے ممبر شاعروں اور ادیبوں کا ایک تذکرہ "یارانِ نو" بھی شائع کر رہی ہے جو ان ممبروں، ان کے کلام اور نگارشات کو تمام دُنیائے ادب سے نہ صرف روشناس کرائے گا بلکہ اُن کے افکار کو موقع دے گا کہ وہ دُنیائے ادب و معاشرہ پر اپنے اثرات ثبت کر سکیں ۔ یہ اقدام بذاتِ خود انجمن کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے ۔

میرے نزدیک انجمن کی اس نمایاں کامیابی میں اس کے پریذیڈنٹ محترم عبدالرشید صاحب تبسم کے بے انتہا خلوص، بلند نظری، فراخ مشربی اور وسیع ذاتی اثر و رسوخ کو بہت دخل ہے ۔

میں اشاعتِ تذکرہ یارانِ نو کی بروقت اشاعت اور جشنِ صد مشاعرہ کے مجوزہ انعقاد پر انجمن ترقی ادب ماڈل ٹاؤن کو تہِ دل سے پُرخلوص مبارکباد پیش کرتی ہوں اور اس کی لاتعداد کامیابیوں کے لئے دست بدعا ہوں ۔

(مس) انور علی محمد

ایم اے ۔ پی ایچ ڈی ۔ ڈی ایس سی ۔ پرنسپل ۔ لاہور کالج فار ویمن ۔ لاہور

یہ معلوم کرکے مجھے بے پایاں مسرت ہوئی ہے کہ انجمن ترقیٔ ادب ماڈل ٹاؤن لاہور اپنی شعری و ادبی سرگرمیوں کا ایک پنج سالہ دور کامیابی سے مکمل کرکے ایک نئے دور میں داخل ہو رہی ہے اور اس تقریب پر اُس نے ایک جشنِ صد مشاعرہ منعقد کرنے اور ارکانِ انجمن کی شعری نگارشات کا انتخاب اور تذکرہ ایک ضخیم کتاب "یارانِ نو" کی صورت میں منصۂ شہود پر لانے کا اہتمام کیا ہے - انجمن کی یہ تعمیری مساعی یقیناً بڑی تعریف کی مستحق اور حوصلہ افزائی کی سزاوار ہیں -

میں اس نہایت مبارک موقع پر انجمن کے فاضل صدر محترم عبدالرشید صاحب تبسم، اُن کے سرگرم رفقائے کار اور مخلص ارکانِ انجمن کو دلی گرم جوشی سے پُرخلوص مبارکباد پیش کرتی ہوں اور دست بدعا ہوں کہ خدا تعالیٰ اس انجمن کی سرگرمیوں کو برکت دے کر مزید بے شمار کامرانیاں عطا فرمائے - خلوص ہی افراد اور انجمنوں کا بہترین سرمایہ ہوتا ہے اور اس انجمن میں اس کی کمی نہیں -

مس تمکین سلیم الحق حقی دہلوی ایم اے
پروفیسر آف سوشیالوجی

۱۲ رمئی ۱۹۶۶ء

خواجہ محمد شفیع دہلوی

اہلِ مشرق کی فطرت میں شعر کو بدرجۂ اتم دخل ہے ۔ یہ خود ستائی اور محض کہنے کی بات نہیں بلکہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے ثابت کیا جا سکتا ہے اور منوایا جا سکتا ہے ۔

ہم نے جس چیز کو منہ لگایا اسے ادب میں جگہ دے کر زندۂ جاوید کر دیا ؎

نوشتہ بماند سیہ بر سپید
نویسندہ را نیست فردا امید

لکھنے والے نہ رہے ، لکھا سینۂ قرطاس پر محفوظ ہے ۔ مثلاً ہم پان کھاتے منہ رچاتے تھے ۔ اس برگِ سبز کا حق ادا کر دیا مشتے از انبارے نمونہ ملاحظہ فرمائیں ؎

پان کہتا ہے کہ میں سوکھ کے مر جاؤں گا
اے لبِ یار اگر منہ نہ لگایا تو نے

حقہ سے شوق کیا ، ادب کی محفل میں لا بٹھایا مثلاً ع بے جان بولتا ہے مسیحا کے ہاتھ میں

عاشقِ قلیاں میں رکھا ہے اس نے ابرِ مردہ کر
ڈوب مر رو رو کے تو اے ابرِ بہمن آب میں

قہوہ یا فنجان کے کنارے ہمارے لب و دہن سے روشناس ہوئے ۔ بزمِ شعر میں موجود ہیں ۔ غور فرمائیں سینہ کی تعریف میں سراپا نگاری کرتے ہوئے کہتا ہے ؎

ہستند شمعِ طور کہ فانوس کردہ
فنجانِ قہوہ اند کہ معکوس کردہ

غرض کہ ہم جس شے سے دوچار ہوئے اُس پہ دو چار شعر نہیں متعدد کہے اور خوب کہے۔

گو آج دورِ پریشانی ہے اور عالمی طبائع مائل بہ نثر تاہم مشاعرے ہوتے ہیں، محافلِ سخن منعقد کی جاتی ہیں۔ ادب نواز دوش بدوش بیٹھتے اور دادِ سخنوری دیتے ہیں۔

ازاں جملہ ہماری انجمن ترقیٔ ادب، ماڈل ٹاؤن لاہور خدمتِ ادب کر رہی ہے۔ اِس میں اہلِ ادب بھی ہیں۔ ادب نواز بھی اور اہلِ دل بھی۔ ہر ایک اپنا فرض انجام دیتا ہے اور فراخ حوصلگی سے۔ اِن کوششوں اور کاوشوں کا نتیجہ جنابِ والا کے سامنے ہے۔ ؎

مشک آں باشد کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید

میری ناقص رائے میں سعیٔ مشکور ہے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ نیز جذبۂ ادب با د زیادہ۔

محمد شفیع (دہلوی) یکم جون ۱۹۶۶ء

حرفِ آغاز

وہ شعر کہ پیغامِ حیاتِ ابدی ہے
یا نغمۂ جبریل ہے یا بانگِ سرافیل

اردو ادب اپنی آفرینش سے لے کر آج تک نشو و ارتقا کے مراحل برابر طے کرتا آیا ہے۔ برِصغیر پاک و ہند اس کی جنم بھومی ہے اور یہیں اس نے ارتقا کے مراحل طے کئے۔ یہ برِصغیر امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ بڑی معاشی، سیاسی، تہذیبی تبدیلیوں سے دوچار رہا۔ اس کے باوجود اردو ادب کے ارتقا میں فرق نہیں آیا۔ بلکہ اردو ادب نے ایک طرف ان تبدیلیوں کو بڑی خوش اسلوبی سے اپنے اندر سمو کر اپنی اقدار کو زیادہ پائیدار اور متنوع بنایا تو دوسری طرف ان بدلتے ہوئے حالات کو متاثر کیا اور ان پر اپنے نقوش مرتسم کئے۔

اردو ادب کی تاریخ پر گہری نظر ڈالی جائے تو اردو ادب کے متعلق ایک بات بڑے وثوق سے کہی جا سکتی ہے وہ یہ کہ اس کی ترقی میں کسی حکومت، کسی مقتدر گروہ یا متمول افراد کا ہاتھ نہیں رہا ہے۔ یہ درست ہے کہ ہمارے متقدمین میں سے بعض اساتذہ درباروں سے منسلک رہے اور اُن کی کچھ مالی حوصلہ افزائی ہوتی رہی۔ مگر دربارداری کے انداز کچھ ایسے تھے جن سے ان اساتذہ کی تخلیقی قوت مجروح تو ہو سکتی تھی اُسے تنومندی نہیں مل سکتی تھی۔ بایں ہمہ وہ اتنے عظیم فنکار تھے کہ دربارداری نے اُن کے فن کو مجروح نہیں کیا۔ اردو ادب میں صرف انشاء اللہ خان انشا کی ایک ایسی مثال ہے کہ وہ اودھ کے درباری ماحول میں اپنا تخلیقی جوہر گنوا بیٹھے لیکن تباہی کے بعد اُن کی عمر کے آخری حصے میں اُن کا فن بھی سنبھالا لے چکا تھا۔ اس حقیقت پر اُن کے وہ غزل گواہ ہے جس کا مطلع ہے ؎

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

پس اِن حالات کا تفصیلی اور تحقیقی تجزیہ کیا جائے تو یہ وا انکشاف حقیقت سامنے آجاتی ہے
کہ اردو ادب محض اپنی مضمر توتوں کے بل بوتے پر پنپا اور پروان چڑھا ۔ اپنے اپنے وقت میں اور
اپنی اپنی سطح پر جن عناصر نے اردو ادب کی کچھ سرپرستی کی یا زیادہ صحیح الفاظ میں اردو ادب کی سرپرستی جن عناصر سے
منسوب کی جاتی ہے وہ خود کسی نہ کسی اعلیٰ طاقت کی سرپرستی کے محتاج اور چرندہ رہے ۔ انہوں نے اردو ادب پر جو تھوڑی
بہت توجہ کی اس سے اردو ادب کو کچھ فائدہ ہوا یا نہ ہوا ان کی اپنی ذات کو ضرور فائدہ ہوا ۔

اردو ادب پر کئی دَور آئے ہیں ۔ اِن ادوار کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ہر نئے دَور نے اپنے سے
پہلے دَور کی نسبت ادب کی نوک پلک کو زیادہ سنوارا ، زیادہ تنوع عطا کیا ، زیادہ وسعت ،
زیادہ ہمہ گیری اور زیادہ جدتیں دیں ۔ اس طرح ادب میں ہر پہلے دَور کے خصائص موجود تو رہے
لیکن وہ ہر آئندہ دَور میں پہلے کی نسبت زیادہ ماند پڑتے گئے ۔ ولی دکنی کے دَور اور دورِ اقبال
میں صدیوں کا بُعد ہے ۔ بظاہر آپس میں ان کا کوئی رابطہ نظر نہیں آتا مگر یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ
اقبال کے دورِ ادب میں ولی دکنی کے دَور کی خصوصیاتِ ادب سو فی صد ناپید ہیں ۔ مختصر یہ کہ
اندازِ ادب کا جو دریا آج ہمارے سامنے ہے یہ تمام گزشتہ ادوارِ ادب کے ندی نالوں کا مجموعہ ہے ۔

دراصل ادب و زبان کا مسئلہ ایک بہت ہی پیچیدہ مسئلہ ہے ۔ زبان ایک متحرک اور
توانا قدر ہوتی ہے ۔ اس میں اپنے دَور کی خصوصیات کو سمو لینے اور از کار رفتہ خصوصیات کو
متروک کرنے کی قدرتی صلاحیت ہوتی ہے ۔ پھر اصل، قدیم اور جدید کا امتزاج اتنا گھلا ملا بھی
نہیں ہوتا کہ ہم اصل، قدیم اور جدید طرزِ بیان کے تیور ہی نہ پہچان سکیں ۔ اردو ادب میں تو
بالخصوص ایک ایسی صنفِ سخن موجود ہے جس کی بدولت اردو ادب کا رشتہ اپنے اصل و قدیم سے
ہمیشہ وابستہ رہے گا ۔ یہ صنفِ سخن غزل ہے ۔ غزل ابدیت سے ہمکنار ہو چکی ہے ۔ غزل زمانے
اور انقلابات کے ہر امتحان سے کامیاب و کامران گزر چکی ہے ۔ اسے "نیم وحشی صنفِ سخن" اور
"از کار رفتہ" اور "نئے زمانے کے تقاضوں سے عاری صنف" کا نام بھی دیا گیا ۔ مگر اردو ادب
میں غزل واحد صنفِ سخن ہے جس کا ارتقا تمام مخالفتوں کے باوجود جاری رہا اور جس نے اپنے
قد و قامت کو بلند سے بلند تر کیا ۔ غالب کے دورِ ادب میں اردو غزل کو مزید پائیدار اقدار
میسّر آئیں ۔ اور غزل و ادب میں منطقی اور سائنسی طرزِ فکر، سماجی اور معاشی تجربات کا

بیان شروع ہو گیا۔ خود غالب نے فلسفہ اور سائنس کو یکجا کرنے کی کوشش کی اور اس طرح اُس نے نہ صرف اپنے دَور کو ایک خاص امتیاز بخشا بلکہ آئندہ دَور کے اندازِ فکر کی نشان دہی بھی کر دی۔

کوئی دَورِ ادب کب شروع ہوا! اس سلسلہ میں کوئی خاص تاریخ متعین نہیں کی جا سکتی۔ اس لئے کہ ہر نئے دَور کے محرکات بہت پہلے سے اثر انداز ہونے لگتے ہیں اور ان اثرات کا نمایاں ثبوت بہت بعد میں جا کر ملتا ہے۔ تاہم برصغیر پاک و ہند کے سیاسی، معاشی، تہذیبی حالات پہ گہری نظر ڈالی جائے اور اس مشاہدہ کی روشنی میں اردو ادب کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ اقبال کے دَورِ ادب کے ساتھ ساتھ ۱۹۲۶ء سے ایک نیا دَورِ ادب پیدا ہو رہا تھا جس کے نقریباً تمام خدوخال ۱۹۳۵ء تک نمایاں ہو گئے۔ اقبال کا انتقال ۱۹۳۸ء میں ہوا۔ مگر نیا دَورِ ادب ۱۹۳۵ء میں جنم لے چکا تھا۔ یہ دَور ۱۹۵۰ء تک جاری رہا۔ اس دَور کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ کیونکہ اس کا تعلق ہمارے زمانے سے ہے۔

جہاں تک میری بصیرت راہنمائی کرتی ہے میں سمجھتا ہوں کہ ۱۹۳۵ء سے شروع ہونے والے اردو ادب کا دَور، بعض دوسرے کم اہم عوامل کے علاوہ مندرجہ ذیل محرکات کا پیدا کردہ تھا۔

۱۔ معاشی بدحالی۔ یہ ۱۹۲۷ء میں شروع ہوئی اور ۱۹۳۴ء کے اخیر میں پورے عروج پہ پہنچی۔ ملک کے طول و عرض میں بیروزگاری کا دَور دورہ تھا۔ بے روزگاری نے فاقہ کشی کو جنم دیا اور فاقہ کشی نے بغاوت، جرائم، خودکشی کو۔ برصغیر پاک و ہند، انگلینڈ کا محکوم تھا اور اس کی منڈی بھی۔ اس لئے یہاں اس کساد بازاری نے عوام کو زیادہ ہی بے حال کیا۔ متوسط اعلیٰ تعلیم یافتہ اور بار کو شعرا کو چھوڑ کر ان کی باقی پوری کی پوری کھیپ اس بیروزگاری میں سرِ فہرست تھی۔

۲۔ ملک میں امارت اور غریبی کے درمیان فاصلہ بہت بڑھ گیا تھا۔ انگریز نے چند بڑی بڑی زمینداریاں پیدا کر کے دولت کے تمام ذرائع صرف چند گھرانوں کے ہاتھ میں دے دیئے تھے۔ اُنہیں غریب عوام سے کوئی ہمدردی نہ تھی۔ اُدھر ساہوکار نہ صرف ملکی تجارت کے اجارہ دار تھے بلکہ غریبوں کی تھوڑی بہت پونجی کو بھی قرض کے بدلے صرف سود میں وصول کر لینا اور اُن کے مکان اور زمین قرق کر لینا ان کا معمول تھا۔ مختصر یہ کہ امیر اور غریب کے درمیان منافرت بڑھتی جا رہی تھی اور وادی دستد یہ سب ڈرامے شعرا و ادبا کے سامنے ہوتے تھے بعض دفعہ یہ خود بھی

ساہوکار کی لپیٹ میں آجاتے رہے۔

۳ - انگریز کی غلامی سے بیزاری - سیاسی طور پر ملک بیدار ہو رہا تھا۔ ہندو، مسلمان، سکھ سب انگریز کی غلامی سے بیزار تھے - برصغیر پاک و ہند کے شعرا و ادبا بھی اسی فضا میں سانس لے رہے تھے - یہ لوگ تو ویسے ہی فطری طور پر بڑے حساس اور آزادی پسند ہوتے ہیں اس صورت حال سے یہ کیسے متاثر نہ ہوتے۔

۴ - مغربی فلسفوں سے نئی روشناسی۔

۵ - صحیح اسلامی تعلیم سے نوجوانوں کی ناواقفیت - وعظوں میں بعض علما نے اسلام کی متشددانہ انتہا پسندی کے ردِ عمل، تعیش پسند مغربی تہذیب کے اثر، تقدیر سے دولت کی غلط تقسیم کے انتساب، افلاس اور بے روزگاری سے پیدا شدہ تنفر طبیعت نے نوجوانوں پر سے جن میں ادبا و شعرا بھی شامل تھے، مذہب اور تہذیبی روایات کی گرفت یکسر ڈھیلی کر دی - اس سے اخلاق کی قدریں نئے سانچوں میں ڈھلنے لگیں - جن کی زیادہ بنیاد ہر قسم کی آزادی پر تھی۔

۶ - ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ ۱۹۱۷ء میں روس کے سرخ انقلاب نے اشتراکیت کی وجہ سے دولت کی تقسیم حکومت کو سونپ دی تھی اور حکومت مزدوروں کی تھی - وہاں روٹی کپڑا اور سر چھپانے کیلئے جگہ ہر کسی کو میسر تھی - پاک و ہند کے شعرا و ادبا کی نگاہیں بار بار اس نظام کی طرف اٹھنے لگیں۔

۷ - اردو ادب کے حلقے میں اقبال کی شاعری بہت مقبول تھی - اقبال نے فلسفۂ خودی کو شعر میں داخل کر کے نمایاں انفرادیت حاصل کر لی تھی - نوجوان شاعروں کے دل میں بھی نئی راہیں اختیار کر کے انفرادیت حاصل کرنے کا شوق چٹکیاں لینے لگا جو بالکل بجا تھا۔

۸ - سخن کی صنف قصیدہ شخصی حکومتوں کے ساتھ ساتھ مٹتی گئی تھی - اس کا احیا یا فروغ اب ممکن نہیں تھا - اس افراتفری کے زمانہ میں مثنوی اپنی طوالت کی وجہ سے گوارا نہ تھی - لے دے کر ایک ہلکی پھلکی صنف غزل تھی جس پر نئے تجربات کئے جا سکتے تھے - اس کے بحر، قوافی، ردیف کی جو قیود اس صنفِ سخن پر اس کی آفرینش کے وقت عائد ہوئیں معمول

تبدیلی سے ابھی تک دو دو ہی کی رہی تھیں۔ اب اس تیز رفتار زمانہ کو تخیل کے راستے میں یہ قیود ایک ناگوار رکاوٹ محسوس ہونے لگیں اور محض اس رکاوٹ کی وجہ سے غزل کو ایک از کار رفتہ صنفِ سخن سمجھا جانے لگا۔ پھر غزل میں گل و بلبل، زلف و گیسو وغیرہ جیسی فرسودہ تراکیب کی تکرار اور تخیل و معاملہ بندی کا فقدان اکثر غزل گو شعرا کا سرمایہ شاعری بن کر رہ گیا تھا۔ اس لحاظ سے یہ صنف بہت سبک سر ہو رہی تھی۔

مجموعی طور پر اس صورتِ حال نے اردو کے ادبا و شعرا کے ذہن میں ایک شدید خلجان اور دل میں اضطراب پیدا کر دیا۔ وہ اپنی ادبی و شعری تخلیقات کے لئے نئے اسلوب اور نئے سانچے تلاش کرنے لگے۔ یہاں تک کہ اس تجسس میں اُن کی نظریں برِ عظیم پاک و ہند کی حدود کو پھلانگ کر روس اور فرانس تک پہنچیں اور وہاں کے ادب کا ہر گوشہ کھنگال ڈالا۔

۱۹۳۵ء میں نوجوان شعرا کی ایک پوری کھیپ نیا تعلیمی و ذہنی رجحان لے کر میدانِ عمل میں آئی۔ اور ادب کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ یہ حضرات ترقی پسند مصنفین کہلائے۔ ترقی پسند مصنفین کی بڑی اٹھان تھی۔ اُن سے بڑی توقعات وابستہ ہوئیں اور یوں محسوس ہوا کہ ان کی ادبی و شعری نگارشات، ملک و قوم کے فکر و نظر کو ایسی جلا دیں گی جس سے ملک و قوم کا کردار بلند، بہت بلند ہو جائے گا۔ انہیں ایک خاص سہولت بھی میسر تھی۔ وہ یہ کہ یہ حضرات ملک کے اخبارات، رسائل، ریڈیو پر حاوی تھے۔ یوں سمجھئے کہ نشر و اشاعت کے تمام رائج وقت ذرائع اُن کے اپنے تصرف میں تھے۔ اپنے نئے اسالیب بیان کا پراپیگنڈہ کرنے کے لئے انہیں کسی کے پاس جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ چنانچہ انہوں نے ان تمام ذرائع سے خوب کام لیا اور اپنے افکار کی خوب اشاعت کی۔ ان کے افکار کا خلاصہ حسبِ ذیل ہے۔

۱۔ قدیم اردو ادب قطعاً بیکار ہے۔

۲۔ غزل کی ہیئت اور مضامین جاگیردارانہ دور کی پیداوار ہیں لہٰذا یہ ناگوار ہیں۔

۳۔ عاشقانہ اظہارِ فکر کے لئے غزل کی ہیئت ضروری نہیں۔ قافیہ، ردیف، بحر کی قیود میں اصل مطلب کا دم گھٹ کر رہ جاتا ہے۔ وقت آگیا ہے کہ یہ قیود دُور کر دی جائیں۔

۴۔ ادب ایک مقصدی شے ہے۔ اس سے زندگی کو زیادہ مؤثر کیا جا سکتا ہے۔ اور یہ ایک

انقلاب برپا کرنے کا ذریعہ بن سکتا ہے۔

۵۔ مذہبی معتقدات افیون کا درجہ رکھتے ہیں۔ جب تک ان سے پیچھا نہ چھڑایا جائے مادی ترقی کا صحت مند شعور پیدا نہیں ہو سکتا۔

۶۔ جنسی بھوک اتنی ہی اہم ہے جتنی شکم کی بھوک۔ ادب کا یہ وظیفہ بھی اولیت رکھتا ہے کہ اس سے جنسی مسائل حل کیے جائیں۔

۷۔ مذہب سے زستگاری، دولت کی مساوی تقسیم، جنسی آزادی جیسے عناصر صرف اشتراکی نظام ہی میں پوری طرح نشوونما پا سکتے ہیں اس لیے برصغیر پاک و ہند کے لیے اشتراکی نظام ہی موزوں ہے اور اسے رائج کرنے کے لیے ایک ویسے ہی خونیں انقلاب کی ضرورت ہے جو روس میں ۱۹۱۷ء میں ہوا۔ ضروری ہے کہ ادب کے ذریعے وہ "سرخ سویرا" جلدی لایا جائے۔

۸۔ روس میں علاقائی زبانوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ وہاں ہر جگہ ابتدائی تعلیم علاقائی زبان میں دی جاتی ہے اور اس کے کئی فوائد ہیں۔ اس برصغیر میں بھی علاقائی زبانوں کو اولیت حاصل ہونی چاہیئے۔ بے شک ایک مرکزی اور اعلیٰ تعلیمی زبان بھی رہے۔ مگر اہمیت کے اعتبار سے اس کا درجہ ثانوی ہونا چاہیئے۔

چنانچہ ان خطوط پر ترقی پسند ادب پیدا ہونا شروع ہوا اور جلد ہی اس ادب کے انبار لگ گئے۔ شعر میں آزاد نظم اور بلینک ورس کو اظہارِ خیال کا ذریعہ بنایا گیا۔ اس طرح اردو شاعری میں دو نئی اصناف کا اضافہ ہوا جو یقیناً ایک قابلِ ستائش بات تھی۔ یہ اصناف انگریزی سے لی گئیں اور انگریزی میں یہ اپنی اپنی مستقل قدر رکھتی ہیں۔ اس طرح اردو شاعری کا دامن، ہیئت کے اعتبار سے زیادہ وسیع ہو گیا۔ جہاں تک مضامین کا تعلق ہے اس نظم کے ذریعے سیاسی اور جنسی افکار کو فروغ دیا جانے لگا۔ سیاست میں اشتراکیت کا پراپیگنڈہ مقصود تھا اور برصغیر کا حکمران انگریز اشتراکیت کا دشمن تھا اس لیے ترقی پسند شعرا اشتراکیت کے حق میں کوئی بات کھل کر نہ کہہ سکے۔ اُدھر جنسی افکار کو عریاں صورت میں برداشت کرنے کے لیے معاشرے کا سنجیدہ طبقہ تیار نہ تھا۔ اس لیے ترقی پسند شعرا کو سیاسی اور جنسی افکار کا اظہار کرنے کے لیے ابہام سے کام لینا پڑا۔ یہ ابہام مجبوری کی وجہ سے پیدا ہوا۔ لیکن یہ ابہام رفتہ رفتہ ترقی پسند ادب کا جزو قرار دیا گیا اور یہ ایک

خوبی شمار ہونے لگا ۔ افسانہ، ناول، ڈرامہ، مضامین بھی ان ہی خطوط پر لکھے جانے لگے ۔ نظم ونثر میں خدا تعالیٰ پر طنز و مزاح اس ادب کی ایک اور خصوصیت قرار پایا ۔ اور پرانی اقدار سامانِ مسخر بن گئیں ۔

آزاد نظم اور بلینک ورس میں اولیت ن ۔م ۔ راشد کے حصے میں آئی ۔ اشتراکیت کے پرچار میں فیض احمد فیض سب سے آگے تھے ۔ ۱۹۳۹ء میں دوسری عالمگیر جنگ چھڑی تو روزگار کے راستے کھل گئے ۔ جنگ روس اور انگریزوں کے درمیان تھی لیکن جن ترقی پسند شعرا و ادبا کو انگریزی حکومت کے تحت نوکری مل گئی ۔ انہوں نے شکر کیا اور انگریز کے خلاف زورِ قلم آزماتے آزماتے نہایت خلوص سے اس کی نوکری کرنے اور گن گانے لگے ۔ مگر کچھ عرصہ بعد روس اور انگریز اس جنگ میں جرمنی کے خلاف ایک دوسرے کے حلیف بن گئے تو انگریز کے ان ملازم اہلِ قلم حضرات کا بھرم رہ گیا ۔

برِصغیر میں جہاں ترقی پسند شعرا و ادبا کام کر رہے تھے وہاں دوسرے شعرا و ادبا بھی بدستور سابق نگارشات پیدا کر رہے تھے ۔ پرانی اقدار کا حامل ادب بھی خاصی مقدار میں پیدا ہو رہا تھا اور اس طرح بحیثیتِ مجموعی اس دور میں بڑا ادب پیدا ہوا ۔

اُدھر سیاسی تحریکیں برِصغیر میں زوروں پر تھیں ۔ ان سیاسی تحاریک سے نظریاتی طور پر ترقی پسند ادبا و شعرا کی حوصلہ شکنی ہی ہوئی ۔ حوصلہ افزائی نہیں ہوئی ۔ یہاں تک کہ ۱۹۴۷ء میں برِصغیر دو حصوں میں تقسیم ہو کر آزاد ہو گیا اور یہاں کی صورتِ حال یکسر بدل گئی ۔ آزادی مل گئی ۔ لیکن یہ "سرخ سویرے" کے ذریعے نہیں ملی تھی ۔ اس سے ترقی پسند شعرا و ادبا کی مزید حوصلہ شکنی ہوئی اور وہ چلا اٹھے کہ یہ آزادی وہ آزادی نہیں ہے جو ہمارے تصور میں تھی ۔ چنانچہ انہیں ابھی تک اس ملک میں اُس "سرخ سویرے" کا انتظار ہے جو قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید کبھی نہ آسکے ۔

آزاد نظم اور بلینک ورس خود مستقل اقدار کی حامل تھیں ۔ کسی دوسری صنفِ شاعری سے اُن کا تقابل غیر مناسب تھا ۔ مگر غزل پرانی قدر رکھتی تھی ۔ اور اس پرانی قدر کو مٹانا ضروری تھا اس لئے غزل کی جگہ آزاد نظم اور بلینک ورس کو دی جانے لگی جس سے خود آزاد نظم اور بلینک ورس کا وقار بھی مجروح ہوا ۔

ترقی پسند ادب کا دور ۱۹۳۵ء میں شروع ہوا تو چند سال میں یہ محسوس کیا جانے لگا کہ یہ اہلِ قلم

حضرات جو عزائم لے کر میدان میں آئے تھے وہ پورے نہیں ہوئے۔ ان میں جو دُور اندیش تھے وہ جہاں آزاد نظم اور بلینک ورس لکھتے رہے وہاں اُنہوں نے غزل کا دامن بھی نہ چھوڑا اور آگے چل کر اُن کا اصل سرمایۂ شاعری غزل ہی محسوب ہوئی۔ فیض خالص سیاسی افکار کو نہ صرف شاعری کے حلقے میں لے آیا بلکہ اُس نے اِس انداز میں تغزل پیدا کرنے کی بھرپور کوشش کی جس سے اردو شاعری کی وسعت اور زیادہ ہوگئی۔ اب یہ جُدا بات ہے کہ فیض کی اس شاعری میں ابہام اور گنجلک پن ہے۔ اِس میں زبان کا الجھاؤ اور فکر کی ژولیدگی ہے۔ فیض کی مجبوریاں اپنی جگہ ہیں لیکن امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ اس کی مجبوریوں کا نقش دھندلاتا جائیگا۔ یہاں تک کہ ایک وقت آئے گا جب اُس کی مجبوریوں پر کسی کی نظر نہیں ہوگی۔ صرف اُس کا کلام سامنے ہوگا۔ فیض شاعر کے طور پر اُس وقت بھی زندہ رہ جائے گا لیکن اپنی غزل کے سہارے۔ اور غزل وہ صنفِ شاعری ہے جو ترقی پسند شعرا کی نظر میں سب سے زیادہ کھٹکی اور جسے مٹانے کے لئے اُنہوں نے پوری کوشش کی۔

یہ بات فیض تک ہی محدود نہیں۔ بعض دوسرے ترقی پسند شعرا کا بھی یہی حال ہے۔ پھر ان میں سے جن شعرا نے آزاد نظم اور غزل دونوں لکھی ہیں ان کی آزاد نظم کے مقابلے میں ان کی غزل زیادہ کامیاب رہی ہے۔

جب ترقی پسند ادب اپنے مقاصد میں ناکام رہا تو دانشوروں کے ایک طبقے نے "ادب برائے ادب" کا نعرہ لگایا۔ جن مقاصد کو ترقی پسند شعرا و ادبا نے سامنے رکھا تھا وہ پورے نہ ہوئے تو مقصد کو ادب کے دائرے ہی سے خارج کر دیا گیا۔ ان دانشوروں کا یہ نعرہ دراصل ترقی پسند ادب کی طرف سے کھلا ہوا اعترافِ شکست اور حقیقت سے فرار تھا۔

پھر ان ترقی پسند شعرا و ادبا میں ایک اور گروپ میراجی کی قیادت میں سامنے آیا۔ اردو ادب پر ایک ایسا وقت بھی آیا جب آزاد نظم پر اِسی گروپ کا تصرف تھا۔ اِس گروپ نے نفسانی جذبات اور سفلی خواہشات کی تصویر کشی کی۔ ایسے مضامین بیان کرنے کے لئے اس نے عجیب و غریب علامتیں، تشبیہات اور استعارے استعمال کئے۔ اس سے شعر و ادب کا ایک حصہ لفظی پیچیدگیوں کا گورکھ دھندا بن گیا جس میں تعمیری اور مقصدیت سرے سے موجود ہی نہ تھی۔ بہر حال اس سے اردو زبان کو چند نئی تراکیب، نئی تشبیہات اور استعارے ہاتھ آگئے۔ دَورِ ادب کے اس حصے میں شعر و فن اور تخلیقی شعبوں میں جمود

کی کیفیت طاری رہی جس کا سلسلہ دراز ہوتا گیا ۔

مختصر یہ کہ زندگی اور ادب کے تعلق کو سامنے رکھ کر ترقی پسند شعرا و ادبا انتہا پسندی کی حدود سے بھی آگے نکل گئے ۔ اس دور میں جہاں نئے نئے اندازِ بیان اختیار کیے گئے وہاں جنسیات کو عریاں فحاشی تک اور نظریات کو شدید اشتراکی پراپیگنڈہ تک پہنچا دیا گیا ۔ ان نگارشات میں جنسیات کے نئے سے نئے گوشوں پر پردا اٹھایا جاتا تھا اس لئے سکولوں اور کالجوں کے نوخیز لڑکے اور لڑکیوں میں یہ بہت مقبول ہوئیں اور ہاتھوں ہاتھ بکیں ۔ لڑکیاں لڑکے اپنے ماں باپ سے چھپا کر اور ماں باپ اپنے لڑکے لڑکیوں سے چھپا کر انہیں پڑھتے رہے ۔

زیرِ نظر ہنگامہ خیز دور ۱۹۳۵ء سے ۱۹۶۵ء تک رہا ۔

اِس دور کے پہلے بارہ سال ملک کی سیاسی کشمکش میں گزرے ۔ پاکستان بنا تو کشت و خون بہت ہوا ۔ لاکھوں گھرانوں کو ہجرت کرنی پڑی ۔ قیامِ پاکستان کے بعد کامل گیارہ سال ملک کو سیاسی استحکام حاصل نہ ہوا ۔ ادب کے دائرے میں ترقی پسند شعرا و ادبا کے غیر متوازن اندازِ فکر نے جو مقاصد ان کے لئے معین کئے تھے انہیں حاصل کرنے میں وہ ناکام رہے ۔ شعرا و ادبا بدستور سابق افلاس کا شکار رہے ۔ اِس ساری صورتِ حال نے اہلِ قلم حضرات کے دل و دماغ پر یاس اور قنوطیت مستولی کر دی ۔ چنانچہ اس دور کا اردو ادب یاس و قنوطیت کا مرقع ہے ۔

سال ۱۹۶۵ء نے اردو ادب کے ایک نئے دور کو جنم دیا ۔

ستمبر ۱۹۶۵ء میں بھارت نے پاکستان پر حملہ کیا تو اس اچانک اور ناگہانی آفت نے پاکستان کے شعرا و ادبا کے دل و دماغ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ۔ پھر قدم قدم پر خدا تعالیٰ نے معجزانہ رنگ میں جس طرح پاکستان کے دفاع میں مدد دی اس نے بھی ان پر بڑا اثر کیا ۔ آخر یہ سوئے ہوئے شیر بیدار ہوئے اور ان کی جنگھاڑ میدانِ جنگ تک پہنچی اور ہمارے سورماؤں کو غیظ و غضب سے بھر کر بےجگری سے نبرد آزمائی کے لئے جوش دلانے لگی ۔ وہی شعرا و ادبا جو ستمبر تک یاس و قنوطیت کا شکار تھے ، چند ہی دنوں میں جنگ کے خاتمہ تک ان کی ذہنی ، قلبی اور نفسیاتی کیفیت یکسر بدل گئی اور ایک نئے عزم ، نئی اُمید اور بے پناہ رجائیت نے انہیں قطعاً نئے انسان بنا دیا ۔ جنگ کے دوران میں جو ترانے ، نغمے ، افسانے ، مضامین لکھے گئے وہ نومبر ۱۹۶۵ء تک کتابی صورت میں سامنے آ گئے ۔

نفسیاتی اعتبار سے یہ اردو ادب اُس ادب کا متضاد تھا جو ۱۹۳۵ء سے ۱۹۶۵ء تک پیدا ہوا ۔

اس طرح میں سمجھتا ہوں کہ نومبر ۱۹۶۵ء سے اردو ادب کا ایک نیا دور شروع ہو گیا ہے جسے ہم

انقلابی دَور کہہ سکتے ہیں۔ اس لئے کہ پوری انسانیت اِس وقت ایک بہت بڑے ذہنی اور قلبی انقلاب کے دروازے پر کھڑی ہے۔

انجمن ترقیٔ ادب ماڈل ٹاؤن لاہور اپنے قیام سے لے کر بالخصوص گزشتہ چھ سال اپنی تعمیری سرگرمیوں میں مسلسل مصروف رہی ہے۔ اس کے ارکان کا فکر و نظر برابر ارتقا کے مراحل طے کرتا رہا ہے۔ دنیائے اردو دان اسی فکر و نظر کی ایک جھلک انجمن کی تصنیف "اذانِ کارراز" کی صورت میں دیکھ چکی ہے۔ اس کی دوسری جھلک "یارانِ نو" ہے۔

اِس انجمن میں ہر مکتبِ فکر کے شعرا و ادبا شریک ہیں۔ ان میں درجن بھر اساتذۂ سخن ہیں جن کے علمی اور غیر علمی فیضان سے بے شمار نوجوان ہنرور ہیں اور ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرتے ہیں۔ یہ اساتذۂ دنیائے ادب میں اپنا اپنا ایک خاص مقام رکھتے ہیں اور اپنی اپنی ذات میں خود ایک ادارہ ہیں۔

اِس انجمن کے جمیع شعرا و ادبا میں سے کوئی شاعر یا ادیب ملک کے کسی ادبی دھڑے یا فکری گروہ کا حصّہ دار یا رکن نہیں۔ اس کا ایک بڑا ثبوت یہی ہے کہ ہمارے زمانے میں شائع ہونے والے کسی اردو تذکرۂ شعرا میں سے کسی کا نام شامل نہیں۔ ان کے اندازِ فکر کی بے لیثی اور ان کے کلام کی نشر و اشاعت سے کسی کو نہ دلچسپی ہے نہ پروا۔ ان میں سے اکثر سے دنیائے ادب روشناس نہیں۔ اس کے لئے یہ نئے ہیں۔ اسی اعتبار سے یہ "یارانِ نو" ٹھہرے۔ اور یہی حقیقت تذکرہ "یارانِ نو" کی وجہ تسمیہ ہے۔

"یارانِ نو" کی کتابت، طباعت، شیرازہ بندی، ہر مرحلہ مہینوں میں طے ہوا ہے۔ اس لئے کہ ہمارے پاس اس کے اخراجات کے لئے سرمایہ بالکل نہیں تھا۔ اس مقصد کے لئے چندہ وصول کیا گیا نہ عطیات۔ انجمن کو حکومت کی طرف سے کوئی مالی مدد میسر تھی نہ کسی دوسرے ادارے یا شخصی سرپرست کی طرف سے۔ اِس کے باوجود یہ کتاب چھپ گئی —— مَیں بحیثیت صدر انجمنِ ترقیٔ ادب ماڈل ٹاؤن یہ کتاب انجمن کی طرف سے خدا تعالیٰ کے نام معنون کرتا ہوں کہ اِس کی طباعت و اشاعت اُسی کا معجزہ ہے۔

عبدالرشید تبسم ایم اے
پریذیڈنٹ۔ انجمن ترقیٔ ادب ماڈل ٹاؤن۔ لاہور

تعارف

لاہور آج کل پاکستان کا ادبی اور ثقافتی مرکز ہے اور اگر غور سے دیکھا جائے تو گزشتہ ایک صدی سے یہ علم و ادب اور فن و ثقافت کا سب سے بڑا سرچشمہ بنا رہا ہے۔ خاص طور پر اردو ادب کی جس قدر خدمت لاہور نے انجام دی ہے شاید ہی کسی دوسرے شہر کو نصیب ہوئی ہو۔ یہاں سے جس قدر ادبی رسالے اور کتابیں شائع ہوئیں اور جس قدر ادبی سرگرمیوں نے یہاں فروغ پایا وہ اس قدیم شہر کی تاریخ کا ایک تابندہ باب ہیں۔ لیکن مرورِ ایام کے ساتھ ساتھ وہ رسالے جنہیں سنگِ میل کی حیثیت حاصل تھی اپنی اشاعت ختم کرنے پر مجبور ہو گئے اور ان کی جگہ نئے رسالے لیتے گئے۔ سینکڑوں ادبی انجمنیں وجود میں آئیں، کارہائے نمایاں انجام دیئے اور کچھ مدت بعد آہستہ آہستہ پس منظر میں جا کر معدوم ہو گئیں اور دوسروں کے لئے جگہ خالی کر دی۔ اس طرح سینہ فگار آتے جاتے رہے لیکن یہ محفل سُونی نہ ہوئی۔

قیامِ پاکستان کے فوراً بعد کے ہنگامی دور میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا اور اسی زمانہ یعنی اوائل ۱۹۴۸ء میں ماڈل ٹاؤن کے چند ادب نواز احباب نے انجمن ترقیٔ ادب کی بنیاد ڈالی۔ ہمیں آج یہ کہتے ہوئے مسرت محسوس ہوتی ہے کہ اس انجمن کا شمار اُن چند انجمنوں میں ہے جو گردشِ ایام کی نذر نہ ہو سکیں اور حوادث کے تند تھپیڑوں کے سامنے بھی اس انجمن کا چراغ، نہایت خاموشی سے مسلسل ضیا باری کرتا رہا۔ یہ نہ کبھی بھڑکا اور نہ گل ہوا۔ اور خدا کا شکر ہے کہ آج اس کی روشنی ماڈل ٹاؤن کی محدود سرحدوں سے نکل کر مغربی پاکستان کے تمام اہم شہروں تک پہنچ چکی ہے۔ اور اس کی رکنیت میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے یہ انجمن تعمیری خدمتِ ادب کا عزم لے کر قائم ہوئی تھی جس پر یہ بڑی پامردی سے قائم رہی اور اس کے عزم کی پختگی میں وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ مزید اضافہ ہوتا رہا ہے۔ اس نے نہ ظاہری شان و شکوہ

اور شہرت و نام و نمود کی ترغیب کے سامنے سر جھکایا، نہ جدت پسندی، روایت پرستی، ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کی بحثوں میں اُلجھی، نہ کسی خاص مکتبِ فکر کے حامیوں کی کنیز رہی۔ اور نہ اِس نے انجمنِ ستائش باہمی کی شکل اختیار کی۔ اِس میں ہر مکتبِ فکر کے احباب نے شرکت کی، کٹر روایت پسندوں سے لے کر ماضی بیزار جدت پسندوں تک ہر ایک کو اپنی صف میں جگہ دی، مستند اساتذہ سے لے کر نو عمر مبتدیوں تک کو ایک ایسا خوش گوار ماحول فراہم کیا جہاں وہ آزادی سے اپنے افکار و خیالات کا اظہار کر سکیں اور اپنی اپنی صلاحیت کے مطابق ارتقا کے مدارج طے کرنے جائیں۔ اور ان سب کے ذہن میں یہی بات بٹھائی گئی کہ وہ چاہے کوئی راہ اختیار کریں لیکن ادب کو انحطاط سے بچائیں اور آج کے مشینی دَور میں جا لیاتی، اخلاقی اور روحانی اقدار کا پرچم بلند رکھیں۔ اس طرح انجمن نے ہر ایک کو خواہ وہ کسی مکتبِ فکر سے تعلق رکھتا ہو یہ موقع فراہم کیا کہ وہ ایک خوش گوار ماحول میں اپنی صلاحیتوں کو جلا دے سکے۔

انجمن کے پہلے صدر رکنوِ مقصود احمد خاں اور سیکرٹری جناب پرواز نے اس انجمن کی بنیادیں استوار کیں۔ ان کے بعد سید ہادی حسن مرحوم، ڈاکٹر سید جعفری، اور سید نوید پرویز نے مختلف حیثیتوں میں اس کی ترقی کے لیے خدمات انجام دیں۔ ۱۹۵۶ء سے انجمن کے سیکرٹری کی حیثیت سے میں مسلسل فرائض انجام دے رہا ہوں۔

۱۹۶۱ء میں انجمن کے انتخابات ہوئے تو جناب عبدالرشید تبسم کو اس کا صدر منتخب کیا گیا اور وہ اب تک اس عہدے پر فائز ہیں۔ ۱۹۶۵ء میں اس عہدے کے لیے ان کا دوبارہ انتخاب اُن کے اس خلوص کا ثبوت ہے جس سے اُنھوں نے انجمن کو ترقی دینے کے لیے مسلسل جدوجہد کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تبسم صاحب کے صدر منتخب ہونے پر انجمن کے ایک نئے تعمیری دور نے جنم لیا اور تاریخ انجمن کا ایک نیا باب معرضِ وجود میں آیا۔ اس شش سالہ دَور میں انجمن نے کئی اہم خدمات سرانجام دی ہیں۔ طرحی مشاعروں کا جو سلسلہ شروع ہوا اس میں ہر بار ردیف حروفِ ابجد کی ترتیب سے متعین کی جاتی رہی اور اس طرح طرحی مشاعروں کے تین دَور مکمل کیے گئے اور ارکان نے شگفتہ زمینوں سے لے کر دقیق ترین زمینوں تک ہر زمین میں طبع آزمائی کی۔ غیر طرحی مشاعرے منعقد کرائے گئے اور ارکان کو اپنی طبعیت کی اُپج ظاہر کرنے کا موقع فراہم کیا گیا۔ تنقیدی مقالے، ادبی مضامین، افسانے اور ڈرامے پڑھے گئے اور ان پر سیر حاصل بحث ہوئی۔ جنگ کے دوران جب تمام ملک ایک برہنہ شمشیر بن گیا تو انجمن کے ارکان نے قلم سے سیف کا کام لیا اور جنگی موضوع پر کئی گرجتی برستی نظمیں کہہ ڈالیں جو انجمن نے دو کتابوں کی صورت میں شائع کرائیں۔ ایک "اذانِ کارزار" جو

انجمن کے ارکان کی رزمیہ نظموں کا مجموعہ ہے اور "معرکہ حق و باطل" جو پاک بھارت جنگ کی مکمل منظوم داستان ہے۔ اس کے علاوہ انجمن نے قومی دفاعی فنڈ میں چندہ دیا۔ بے گھروں کے لئے امدادی سامان جمع کیا مجاہدوں کے لئے کتابیں اور دیگر تحفے اکٹھے کئے اور اس طرح اس عام خیال کو باطل کیا کہ ادیب اور شاعر عملی اقدامات کے اہل نہیں ہوتے۔

"یارانِ نو" انجمن کی تیسری پیش کش ہے۔ انجمن کے سامنے ایک وسیع لائحہ عمل ہے لیکن ہم صرف عزائم کی تشہیر پر ایمان نہیں رکھتے، البتہ اس نے اپنے محدود وسائل کے باوجود جو کچھ خدمات انجام دی ہیں اُن کی ایک جھلک آپ اس کتاب میں دیکھ سکتے ہیں۔

"یارانِ نو" صرف انجمن ترقیٔ ادب ماڈل ٹاؤن کے ممبر شعراء و ادبا کا تذکرہ ہے۔ اس تذکرے میں ۲۸ شاعر اور ۹ ادیب شریک ہیں۔ شعراء میں سے تین شاعر اس دوران میں وفات پا گئے۔ اُن کا کلام "سرو رفتہ" کے عنوان سے ایک علیحدہ باب کی صورت میں شامل کیا گیا ہے۔

اِس تذکرہ میں شامل شعرا و ادبا کے حالاتِ زندگی ترتیب دیتے وقت جہاں تک ممکن ہو سکا اُن عوامل کو زیادہ تفصیل سے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو شاعر یا ادیب کی شعری و ادبی زندگی کے وجہ آغاز اور محرک بنے۔ حالاتِ زندگی کے اِس حصّے کی طوالت یا اختصار کا دار و مدار اُس مواد کی مقدار پر رہا جو ہمیں میسّر آیا۔

"یارانِ نو" کی اشاعت کے بعد انجمن ترقیٔ ادب ماڈل ٹاؤن اپنے ارکان کی نگارشاتِ نثر کا مجموعہ جلد ہی پیش کر سکے گی۔ اِن شاء اللہ

عظیم الرحمان فرقان ایم اے
سیکرٹری انجمن ترقیٔ ادب

اظہار سپاس

یارانِ نو کی ترتیب و تدوین سے لے کر اس کی طباعت کے آخری مرحلے تک ہر عمل میں محترم یزدانی جالندھری نے انجمن کو بڑی مدد دی اور رات دن اس کام میں منہمک رہے۔ اِس باب میں اُن کے بے پایاں خلوص، ایثار، عرق ریزی، دقتِ نظر، فنی مہارتِ تامہ اور بے لوث جذبۂ عمل کا اعتراف نہ کرنا بڑی ناشکری ہوگی۔ انجمن ترقیٔ ادب ماڈل ٹاؤن تہِ دل سے ان کا شکریہ ادا کرتی ہے۔

محترم حامد محمود خوش نویس نے نہ صرف یارانِ نو کی کتابت ہی انتہائی خلوص، محنت اور محبت سے کی بلکہ اس کی طباعت وغیرہ کے اہتمام میں بھی بڑے انہماک سے انجمن کی مدد کی۔ اس کے لئے انجمن اُن کی بھی سپاس گزار ہے۔

اسی طرح انجمن محترم محمد یوسف خان صاحب مینیجر پاکستان پرنٹنگ ورکس لاہور کی ممنون ہے کہ اُنھوں نے گہری ذاتی دلچسپی لے کر یارانِ نو کی طباعت کو حسین ترین بنانے کے لئے بڑی عرق ریزی سے کام لیا۔

عبدالرشید تبسم ایم اے
پریذیڈنٹ
انجمن ترقیِ ادب ماڈل ٹاؤن لاہور

یارانِ نو

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

عبدالرشید تبسم ایم۔ اے

نام عبدالرشید۔ تخلص تبسم۔ ۲۹ جون ۱۹۱۱ء کو صبح ساڑھے تین بجے گورداسپور کے مضافاتی گاؤں اوجلہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کی پیدائش کے وقت بہت بارش ہوئی۔ شدت گرما میں اسے نیک فال سمجھا گیا۔

آپ کے دادا مولوی الہ دین اپنے زمانے کے بہت بڑے عالم تھے۔ وہ مدتوں دلی میں مغل شہزادوں کے اتالیق رہے۔ رخصت پر وطن آئے تو اسی دوران میں غدر ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ ہو گیا۔ اب انہوں نے اوجلہ ہی میں سکول قائم کر لیا جس میں دور دور سے آ کر طلبا داخل ہوتے رہے۔ ان کے شاگردوں میں شیخ امیر علی مرحوم سیشن جج اور دیوان بہادر راجہ نرندرا ناتھ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ شیخ سر عبدالقادر مرحوم نے تبسم صاحب کی کتاب "دوست اور دشمن" پر جو دیباچہ لکھا ہے اس میں انہوں نے ذکر کیا ہے کہ شیخ امیر علی مرحوم مولوی الہ دین کے حالات اکثر سنایا کرتے تھے۔ جب انگریزی حکومت کا قیام ہوا اور گورنمنٹ نے گورداسپور میں ہائی سکول قائم کیا تو مولوی صاحب اس سکول کے پہلے ہیڈ ماسٹر مقرر کئے گئے۔ تبسم صاحب کے والد چودھری عبدالغفور مرحوم صوفی منش آدمی تھے۔ وہ سرکاری ملازمت میں تھے۔

تبسم صاحب نے اوجلہ ہی کے رہنے والے مولوی غلام رسول مرحوم سے پانچ سال کی عمر میں قرآن پڑھا اور آخری پارہ حفظ کیا۔ اس کے بعد آپ کو گورنمنٹ ہائی سکول گورداسپور کی پہلی جماعت میں داخل کیا گیا۔

موزونی کلام کا جوہر خدا نے آپ کو پیدائش ہی سے عطا فرمایا تھا۔ چنانچہ آپ نے گیارہ سال کی عمر میں شعر کہنا شروع کیا۔ آپ نے سب سے پہلے جو نظم لکھی اس کا ایک شعر محفوظ رہ گیا ہے ؎

میں جو گذرا اُن کے کوچے سے وہ فرمانے لگے
آج سے اِک اَور دیوانہ ہمارا ہو گیا

بارہ سال کی عمر میں جبکہ آپ سکول کی ساتویں جماعت کے طالب علم تھے، آپ کی پہلی نظم وطن سے متعلق "ہندوستان" کے عنوان سے لاہور کے رسالہ نونہال میں چھپی۔ اس نظم پر رسالہ کے ایڈیٹر نے ایک حوصلہ افزا نوٹ بھی لکھا جس میں اس ننھے منے شاعر کو بڑی داد دی۔

اسی زمانے میں گورنمنٹ ہائی سکول گورداسپور کے نئے ہیڈ ماسٹر حافظ احمد دین مقرر ہو گئے۔ یہ صاحب کسی زمانہ میں امان اللہ خاں والیٔ افغانستان کے اتالیق رہ چکے تھے اور انگریزی، فارسی، اردو کے بڑے عالم اور صاحبِ ذوق تھے۔ انہوں نے آتے ہی تبسم صاحب کو اپنی علمی سرپرستی میں لے لیا۔

اُن دنوں گورداسپور کی ایلیٹ لائبریری میں باقاعدگی سے ہر ماہ مشاعرہ ہوا کرتا تھا۔ ایک دفعہ منتظمین نے بڑے پیمانے پر ایک طرحی مشاعرے کا اہتمام کیا جس کی صدارت کے لئے بسمل الٰہ آبادی تشریف لائے۔ طرح مصرع کا قافیہ ردیف "تصویر ہے" "تقریر ہے" وغیرہ تھا۔ ہیڈ ماسٹر کے ایما پر تبسم صاحب نے بھی طرحی غزل کہہ ڈالی اور ہیڈ ماسٹر صاحب انہیں اپنے ہمراہ مشاعرہ میں لے گئے۔ مشاعرہ شروع ہوا تو ہیڈ ماسٹر صاحب نے صدر کی اجازت سے ایک مختصر سی تقریر کی جس میں حاضرین سے اپنے اس شاگرد کا تعارف کرایا۔ اس کے بعد تبسم صاحب سے غزل سنی گئی۔ اس غزل کا صرف مطلع محفوظ رہا ہے۔[۵]

پردۂ حسنِ ازل میں خندہ زن تقدیر ہے
خود ادا موسیٰ کی موسیٰ کے لئے زنجیر ہے

غزل بہت پسند کی گئی اور مشاعرہ کے اختتام پر بسمل صاحب دیر تک تبسم صاحب سے باتیں کرتے اور ان کی حوصلہ افزائی فرماتے رہے۔ اس وقت تبسم صاحب کی عمر تیرہ سال تھی اور یہ پہلا مشاعرہ تھا جس میں انہوں نے شرکت کی۔

حافظ احمد دین نے تبسم صاحب سے انٹرنس کے انگریزی نصاب میں شامل ایمرسن اور لونگ فیلو کی نظموں کا اردو نظم میں ترجمہ کرایا اور ایسے چارٹ بنوائے جن میں انگریزی نظم اور اس کا یہ منظوم اردو آمنے سامنے دیا گیا تھا۔ ان نظموں کو طلباء کے ذہن نشین کرانے کے لئے یہ چارٹ سکول کے کمروں میں آویزاں کئے گئے۔

ان ہی دنوں سیاسی اصلاحات کے سلسلے میں سائمن کمشن ہندوستان آیا تو وہ گورداسپور بھی گیا۔ وہاں سے اس کی روانگی کے وقت اسے الوداع کہنے کے لئے سکول کے قریب سے گزرتی ہوئی سڑک کے دونوں طرف سکول کے تمام طلباء کھڑے کئے گئے جن کی تعداد ایک ہزار سے اُوپر تھی۔ انگریز ڈائریکٹر تعلیم بھی ہاں موجود تھا۔ اس نے سائمن کمشن کے ممبروں سے حافظ احمد دین کا تعارف کرایا تو حافظ صاحب کی علمیت اور ذہانت کی بڑی تعریف کی۔ اس پر کمشن کے ایک ممبر نے حافظ صاحب سے مخاطب ہو کر کہا۔

"مسٹر ہیڈ ماسٹر! آپ نے اس سکول میں کونسی خصوصیت پیدا کی ہے جو کسی دوسرے سکول میں پیدا نہیں ہو سکی؟"

ہیڈ ماسٹر صاحب نے فوراً جواب دیا۔

"جناب! مَیں نے درحقیقت یہاں ایک خصوصیت پیدا کر ڈالی ہے۔ وہ خصوصیت ابھی پیش کرتا ہوں۔"

یہ کہہ کر ہیڈ ماسٹر صاحب نے تبسم صاحب کو بلایا اور انہیں آگے کرتے ہوئے کمشن کے اس ممبر سے کہا۔ "یہ ہے میرے سکول کی خصوصیت جو ملک بھر کے کسی دوسرے سکول میں نہیں۔ میرا یہ شاگرد امسال اینٹرنس کا امتحان دے گا۔ یہ اُردو میں ایسی نظمیں لکھتا ہے جو ایمرسن اور لونگ فیلو کی نظموں سے کسی طرح کم نہیں ہوتیں۔ اس نے اِن انگریزی شاعروں کی بعض نظموں کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ اس کے ترجمے میں اصل انگریزی نظموں کا زورِ بیان برقرار رہے۔ کاش اس وقت کوئی مستشرق آپ کے ہمراہ ہوتا۔ جو انگریزی اور اردو نظموں کا تقابل کرکے اپنی رائے دے سکتا۔

کمشن کے ممبر بے حد محظوظ ہوئے۔ انہوں نے انگریز ڈائریکٹر تعلیم سے کہا۔

"یہ آپ کا ذمہ رہا کہ مذکورہ انگریزی نظموں اور اس طالب علم کے منظوم ترجموں کی نقل ہمیں بھجوا دیں۔ ہم بڑی خوشی سے ان کا تقابلی مطالعہ کریں گے۔"

بعد میں وہ نظمیں انہیں ارسال کر دی گئیں۔ تبسم صاحب سکول میں وظیفہ خوار رہے۔

گورنمنٹ ہائی سکول گورداسپور سے میٹرک پاس کرنے کے بعد تبسم صاحب نے لاہور کے اسلامیہ کالج میں داخلہ لیا۔ عمر میں یہ پہلا موقع تھا کہ تبسم صاحب لاہور آئے۔ لاہور آتے ہی خوش قسمتی سے اِن کی ملاقات مولانا عبدالمجید سالک مرحوم سے ہو گئی۔ محمد دین تاثیر اور مولانا علم الدین سالک اس وقت اسلامیہ

کالج میں لیکچرار تھے۔ چند ہی دنوں میں تبسم صاحب ان سے گھل مل گئے۔ تبسم صاحب ڈاکٹر اقبال کے کلام سے بڑے مسحور تھے یہ لاہور آئے تو ڈاکٹر صاحب سے ملنے کے لئے بہت بیتاب تھے۔ تبسم صاحب کا حافظہ بہت اچھا تھا۔ تین چوتھائی بانگِ درا انہیں خود بخود یاد ہو چکی تھی۔ انہوں نے دو ایک مرتبہ تاثیر صاحب سے کہا کہ وہ ڈاکٹر اقبال سے ان کی ملاقات کرا دیں۔ مگر تاثیر صاحب یہ کہہ کر ٹال دیتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب مبتدی شاعروں کی حوصلہ شکنی کرتے ہیں۔ تم ان سے نہ ملو۔ قدرت نے تبسم صاحب کی مدد کی اور ڈاکٹر صاحب سے ان کی ملاقات کا انتظام خود بخود بڑے ڈرامائی انداز سے ہو گیا۔ اُن ہی دنوں تبسم صاحب نے ساٹھ ستر شعر کی ایک قومی نظم لکھی جسے ایک صحبت میں انہوں نے مولانا عبدالمجید سالک کے ایماء پر پڑھ دیا۔ اس صحبت میں مولوی غلام محی الدین قصوری بھی موجود تھے۔ وہ اس وقت انجمنِ حمایتِ اسلام کے اسسٹنٹ سیکرٹری تھے۔ نظم سُننے کے بعد انہوں نے کہا۔

"تبسم صاحب! آپ یہ نظم انجمن حمایت اسلام کے آئندہ اجلاس میں پڑھیں گے جو ایک مہینے تک ہونے والا ہے۔ اسے روک لیجئے۔ اس وقت تک کسی رسالہ میں شائع نہ کرائیے۔"

تبسم صاحب نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہہ دیا میں یہ نظم انجمن کے صرف اُس اجلاس میں پڑھوں گا جو ڈاکٹر اقبال کی صدارت میں ہو۔ ایک اجلاس کی صدارت پہلے ہی ڈاکٹر صاحب کے لئے مخصوص ہو چکی تھی۔ مولوی صاحب تبسم صاحب سے متفق ہو گئے۔ لیکن متعلقہ اجلاس کا وقت آیا تو ڈاکٹر اقبال نے گھر سے پیغام بھیج دیا کہ ان کے دانت میں تکلیف ہے۔ وہ اجلاس کی صدارت کے لئے نہیں آسکتے۔ اس پر مولوی غلام محی الدین قصوری سٹیج سے اُٹھ کر گئے کہ خود جا کر ڈاکٹر صاحب کو لانے کی کوشش کریں اور تبسم صاحب یہ سمجھ کر کہ ڈاکٹر اقبال اب نہیں آئیں گے خاموشی سے کھسک گئے اور ہوسٹل سے اپنی کتابیں لے کر لارنس گارڈن چلے گئے اور وہاں بیٹھ کر شام تک مطالعہ کرتے رہے۔ اُدھر مولوی صاحب ڈاکٹر اقبال کو ان کے گھر سے اپنے ہمراہ لے آنے میں کامیاب ہو گئے۔ اب ڈاکٹر اقبال کی صدارت میں اجلاس شروع ہوا تو تبسم صاحب کو تلاش کیا جانے لگا۔ مگر یہ کہیں نہ ملے۔ مولوی صاحب نے ڈاکٹر صاحب کو بتا دیا کہ تبسم صاحب یہ سمجھ کر بھاگ گئے ہیں کہ آپ صدارت کے لئے نہیں آئیں گے۔ شام کو تبسم صاحب اصل صورتِ حال سے آگاہ ہوئے تو انہیں بہت صدمہ ہوا۔ دوسرے دن بعد دوپہر یہ اپنی نظم لے کر ڈاکٹر اقبال کی کوٹھی پہنچ گئے۔ اس زمانے میں ڈاکٹر صاحب میکلوڈ روڈ پر رہا کرتے تھے۔ تبسم صاحب بالی

پہنچے تو اتفاق سے ڈاکٹر صاحب باہر کھڑے اپنے ملازم علی بخش سے کوئی بات کر رہے تھے۔ بات ختم کر کے انہوں نے تبسم صاحب کی طرف توجہ کی اور انہیں اپنے ساتھ ڈرائنگ روم میں لے گئے اور ان کی آمد کی وجہ پوچھی تبسم صاحب نے کل والا واقعہ بیان کر کے نظم ڈاکٹر صاحب کے ہاتھ میں تھما دی۔ ڈاکٹر صاحب نے عینک لگائی اور نظم پڑھنا شروع کر دی۔ نظم ختم کرنے کے بعد فرمایا۔

نظم بہت اچھی ہے۔ بڑا ہی اچھا ہوتا کہ تم اجلاس میں موجود رہتے اور یہ نظم وہاں پڑھ دی جاتی۔ پھر انہوں نے فرمایا۔

"مولوی صاحب نے مجھے بتایا ہے کہ تمہیں مجھ سے ملنے کا بہت شوق ہے مگر تم مجھ تک آتے ہوئے جھجکتے رہے۔ میں تو درویش آدمی ہوں۔ تمہارا دل جب چاہے آجایا کرو"۔

تبسم صاحب نے جرأت کر کے کہہ دیا "میں ہر روز حاضر ہو جایا کروں گا"۔ اس پر ڈاکٹر صاحب ہنس پڑے اور فرمایا۔

"نہیں۔ ہفتہ میں ایک دن ٹھیک رہے گا۔ کوئی خاص دن مقرر کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہفتہ میں کسی ایک دن آجایا کرو"۔

چنانچہ تبسم صاحب ہر ہفتے ڈاکٹر اقبال کی خدمت میں پہنچ جاتے رہے۔ یہ سلسلہ دو سال تک جاری رہا۔

آپ نے ۱۹۳۴ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے پاس کیا جہاں کئی انعامات حاصل کئے۔ بعد میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے کی ڈگری لی۔ کالج سے فارغ ہو کر اخبار نویسی کا پیشہ اختیار کیا بعض روزنامہ اخبارات اور ماہوار رسائل کے ایڈیٹر رہے۔ کچھ عرصہ میاں سر فضل حسین مرحوم کے ساتھ ان کی سیاسی پارٹی میں پبلسٹی سیکرٹری کے طور پر اور ان کے انتقال کے بعد کچھ مدت اسی حیثیت سے سر سکندر حیات مرحوم کے ساتھ کام کیا۔ جون ۱۹۴۱ء میں تبسم صاحب مرکزی حکومتِ ہند کے ڈیفنس ڈیپارٹمنٹ میں ملازم ہو گئے اور نئی دہلی، احمد آباد، بمبئی، شاہجہانپور، سیالکوٹ، لاہور میں متعین رہے۔ ملک کی تقسیم پر ان کی یہ ملازمت پاکستان میں بھی جاری رہی۔ گیارہ سال یہ ملازمت کرنے کے بعد ۱۹۵۲ء میں اس سے استعفیٰ دے دیا۔ دو سال ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کے پبلسٹی آفیسر رہے۔ یہاں ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی علمی صحبت سے فائدہ اٹھایا۔ اسی دوران میں مولانا جلال الدین رومی کی فارسی تصنیف فیہ مافیہ کا اردو ترجمہ "ملفوظاتِ رومی" کے نام سے کیا۔ اور اس کے متن کے متعلق ایک تحقیقاتی مقالہ لکھ کر پیش لفظ کے طور پر شامل کتاب کیا۔

ملفوظاتِ رومی کے دو ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ تصوف سے دلچسپی رکھنے والے حلقوں میں یہ کتاب بہت مقبول ہے۔ جنوری ۱۹۵۵ء سے آپ رسالہ امدادِ باہمی کے ایڈیٹر ہیں۔ یہی آپ کا ذریعہ معاش ہے۔

تبسم صاحب رفاہِ عامہ کے کئی اداروں کے سرپرست، پریذیڈنٹ، سیکرٹری رہے ہیں اور اب بھی ہیں۔ آپ دو سال (۳۵-۱۹۳۴ء) آل انڈیا کشمیر کمیٹی کے اسسٹنٹ سیکرٹری رہے۔ کئی سال سے سوسائٹی فار پروموٹنگ سائنٹیفک نالج کے ماہوار رسالہ روشنی کے اعزازی چیف ایڈیٹر ہیں۔ ۱۹۶۱ء سے آپ انجمن ترقی ادب ماڈل ٹاؤن لاہور کے پریذیڈنٹ ہیں اور اس وقت تک اس انجمن کے ایک سو مشاعروں کی صدارت کر چکے ہیں۔

آپ انگریزی، فارسی، عربی پر پورا عبور رکھتے ہیں۔ ہندی جانتے ہیں۔ گذشتہ پچیس سال سے فرصت کے اوقات میں علمِ نجوم کا مطالعہ آپ کا محبوب مشغلہ ہے۔ اردو میں بے شمار افسانے، کہانیاں مختلف شعبہ ہائے علوم سے متعلق سینکڑوں مضامین، بیشمار نظمیں اور غزلیں لکھ چکے ہیں۔ آپ کا مجموعۂ کلام اس وقت زیرِ ترتیب ہے۔ ایک ناول "وزیرِ اعظم" اور افسانوں کا ایک مجموعہ "دوست اور دشمن" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ "دوست اور دشمن" کا دیباچہ شیخ سر عبدالقادر مرحوم نے رقم کیا۔ فارسی میں بھی کئی غزلیں کہہ چکے ہیں۔

۱۹۳۸ء میں آپ کی نظم "غلاموں کی بغاوت" پر متحدہ ہندوستان کے بعض رسائل نے تبسم صاحب کو والٹیر آف ایشیا کا خطاب دیا تھا۔ ۱۹۴۳ء میں ماہنامہ نیرنگِ خیال نے آپ کو لسان العصر کا خطاب دیا۔

کالج کی تعلیم سے فارغ ہو کر آپ نے تمام مروجہ مذاہب کا بڑی دقیق نظر سے تقابلی مطالعہ کیا۔ اور بالکل غیر جانبدار ہو کر کیا۔ مختلف مذاہب کی بیسیوں کتابیں پڑھنے اور ان مذاہب کے ممتاز رہنماؤں سے مسلسل اور تفصیلی تبادلہ خیالات کے بعد آپ اس نتیجے پر پہنچے کہ صرف اسلام ہی زندہ اور بہترین مذہب ہے۔ خداوند تعالیٰ کی ہستی کے متعلق آپ کے دل میں کبھی شک پیدا نہیں ہوا۔

آپ کی عمر شدید آزمائشوں اور مصائب و آلام میں گزری ہے۔ اس کے باوجود آپ انتہا درجہ کے رجائی ہیں۔ آپ کے کلام میں اُمید اور یقین کا عنصر بہت غالب ہے۔ تبسم صاحب کو یقین ہے کہ طویل عرصے سے دنیا بھر کے شعراء پوری انسانیت کے لئے جس خوشگوار انقلاب کے خواب دیکھتے

اور عالم خیال میں گیت گاتے رہے احساس کا وقت آگیا ہے اور اس انقلاب کا آغاز ہو چکا ہے ۔
کچھ عرصہ ہوا تبسم صاحب نے کتابی صورت میں اشاعت کے لئے اپنا کلام ترتیب دیا مگر ان کی بعض اپنی مجبوریوں کی وجہ سے اس کی طباعت التوا میں رہی ہے ۔ آپ کے مجموعہ کلام پر پیش لفظ مولانا عبدالمجید خاں سالک مرحوم کا رقم کردہ ہے ۔ اس میں مولانا سالک فرماتے ہیں ۔

"تبسم صاحب کے اشعار ابتذال، پستی فکر اور عامیانہ پن سے بالکل پاک ہیں ۔ جا بجا تصوف و اخلاق کے معارف نظم کئے گئے ہیں ۔ زمانے کی ضروریات اور معاشی و معاشری تقاضوں کا احساس بھی جھلک رہا ہے ۔ سرمایہ و مزدور کے مسئلے پر بھی ان کے خیالات و افکار کسی بڑے سے بڑے اشتراکی کے احساسات سے کم نہیں ۔ ان کا عام زاویۂ نگاہ زندگی کے متعلق حیات افروز اور اُمید افزا ہے ۔ وہ علامہ اقبال کے دبستانِ فکر سے پورا استفادہ کرتے ہیں ۔ وہ غلامی سے متنفر اور آزادی کے داعی ہیں ۔ تفلسف اور تفکر کے بے حد شوقین ہیں ۔ اور حتی الوسع اپنے اشعار میں عمق اور گہرائی کی خوبیاں پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ ان تمام خصوصیات کے اعتبار سے ان کا کلام آج کل کے شعرا میں خاص امتیاز رکھتا ہے ۔"

دعا

الٰہی! ہر طرف جلووں سے اک محشر بپا کر دے
مری آوارہ نظروں کو حقیقت آشنا کر دے

جہاں کو دے وہ ذوقِ خود نمائی جس طرف دیکھوں
ہر اک ذرّہ و فورِ شوق سے آغوش وا کر دے

نہیں خواہش کہ بحرِ بیکراں بن کر اُچھل جاؤں
مَیں دریا ہوں، مجھے تُو شوکتِ دریا عطا کر دے

سکونِ دل پیامِ موت ہے اہلِ محبت کو
مجھے اک اضطرابِ جاوداں یارب عطا کر دے

حقیقت میں مرا دل ایک مشتِ خاک ہے لیکن
جو تُو چاہے تو اِس کو اک نظر میں کیمیا کر دے

بھٹکنے پھر رہے ہیں اہلِ دل کوئے محبت میں
مرے ہر داغِ دل کو مشعلِ راہِ وفا کر دے

ترا بندہ ہوں، مجھ کو غیر کا سائل نہ بننے دے
مجھے اپنے کرم سے بے نیازِ ماسوا کر دے

رہے چارہ گروں کو عمر بھر احساسِ ناکامی
مرے دردِ محبت کو تُو یکسر لا دوا کر دے

گر اس پر نامِ غیر آئے تو جل جائے زباں میری
خیالِ غیر کو دل کے لئے تیرِ قضا کر دے

بنا بیٹھا ہُوں اپنا آشیاں اک شاخِ نازک پر
اسے طوفانِ برق و باد سے ناآشنا کر دے

تری درگاہ میں آیا ہے وہ اک آرزو لے کر
تبسّم کو الٰہی کامیابِ مدّعا کر دے

تیرے جلووں میں کبھی حائل ترا پردہ نہ تھا
کون سے دن تھے کہ تیرے حسن کا چرچا نہ تھا

اک قیامت تھا سدا تیری جوانی کا نکھار
تیری اِس مستی سے پہلے بھی کوئی تجھ سا نہ تھا

شہر میں میرے جنوں سے تیری بدنامی سہی
وادی و صحرا میں تیرا حسن کب رسوا نہ تھا

اجنبی سی بزم، اب اُس پر یہ تیری بے رُخی
یوں تو مَیں پہلے بھی تنہا تھا مگر اتنا نہ تھا

مانگتا ہوں چاند سے شب کو سکونِ دل کی بھیک
عشق اتنا بے نوا ہے، یہ کبھی سوچا نہ تھا

پوچھتا پھرتا ہُوں ہر آہو سے مَیں اپنا پتہ
کھو گیا ہوں مَیں، مجھے اندازۂ صحرا نہ تھا

کچھ تو ہوتا عام دیوانوں سے اس کا امتیاز
تیرے دیوانے کو یوُں پتھر پڑیں زیبا نہ تھا

اک فریبِ نَو سے بہلاتا ہوں دل کو ہر سحر
کب مجھے منظور تیرا وعدۂ فردا نہ تھا

قتل پر پُرسش ہے اب کوئی، نہ کوئی خوُں بہا
عاشقوں کا خون اِس بستی میں یوں سستا نہ تھا

کوچۂ دلدار ٹھہرا زندگی کی رہگذر
اس گلی سے بچ کے چلنے کا کوئی رستہ نہ تھا

یاد آتے ہیں تبسم! آج وہ فرصت کے دن
دل نہ تھا بیتاب جب سر میں کوئی سودا نہ تھا

○

اک گھُٹی سی آہ کو آہِ رسا کس نے کہا — مجھ شکستہ پا کو منزل آشنا کس نے کہا
میں ہوں اور سنسان گلیاں رات کے پچھلے پہر — لیکن اہلِ شہر سے یہ ماجرا کس نے کہا
دو نگاہوں کا تصادم، دو دلوں کی دھڑکنیں — عشق کا عالم ہے کچھ اِس کے سوا، کس نے کہا
آنکھوں آنکھوں میں ہوا کرتا ہے دل کا فیصلہ — یہ فسانہ آج تک کس نے سُنا، کس نے کہا
عشق کا بیمار مر سکتا نہیں جب موت سے — مجھ مریضِ جاں بلب کو لا دوا کس نے کہا
پانی پانی ہے ندامت سے وہ تیرے سامنے — تجھ سے گُل کا راز اے بادِ صبا! کس نے کہا
کاروانِ گُل کے پیچھے ہے خزاں کی گرد بھی — اِس نظارے کو بہارِ جانفزا کس نے کہا

تو نے کی ہو گی ضرور اُس سے تبسّم! التجا
کھُل گئے خود ورنہ وہ بندِ قبا، کس نے کہا

○

قصرِ خسرو کہ تیشۂ فرہاد — دستبردِ زمانہ کی اک یاد
میں ہوں اور سیلِ غم و افکار — ایک شاگرد سینکڑوں استاد
ہیں جُدا عشق و حسُن کے انداز — ایک نخچیر، دوسرا صیّاد
حسُن کی قید حاصلِ تسکیں — کتنا پچھتائے جو ہوئے آزاد
میرا ہر رنج و غم ہے بے معنی — تم ہوئے شاد تو جہاں ہے شاد
برق کی ہو کڑک کہ ہو گلبانگ — ہم سمجھتے ہیں آپ کا ارشاد
حشر کے بعد پھر کہاں موقع — سوچتا ہوں کہ کر ہی لوں فریاد

اس گلی میں کسی کو جب دیکھا
ہم کو آیا وہیں تبسّم یاد

وہ مری آنکھوں سے اوجھل ہے نہ میرے دل سے دور
وائے مجبوری کہ بیٹھا ہوں میں اُس محفل سے دور

لذتِ آوارگی سے ہوں سدا صحرا نورد
آ کے منزل تک نکل جاتا ہوں پھر منزل سے دور

لامکاں کی سمت رہ رہ کر کھنچا جاتا ہے دل
کوئی تسکیں بخش جلوہ ہے مہِ کامل سے دور

میرے دل میں آرزو کوئی نہ ہے لب پر سوال
وہ کھڑے شرما رہے ہیں ہٹ کے مجھ سائل سے دور

ڈھونڈتا ہوں ان میں جھک جھک کر میں اپنے آپ کو
کچھ نئے بسمل تڑپتے ہیں درِ قاتل سے دور

عشق کی آوارگی خود بن گئی زنجیرِ پا
قیس جا سکتا نہیں لیلیٰ! ترے محمل سے دور

دیکھ لیں کس بل ابھی بپھرے ہوئے طوفان کا
ناخدا لے چل سفینے کو ذرا ساحل سے دور

وہ ملاتے ہیں نظر اک ایک سے میرے سوا
بجلیاں گرتی ہیں کشتِ عشق کے حاصل سے دور

اے تبسم! شہر میں تم عشق کر سکتے نہیں
رکھ سکو گے ناصحوں کو تم یہاں مشکل سے دور

دشمنِ جاں ہوا اُس راحتِ جاں کا انداز
گُل میں آیا ہے نظر سنگِ گراں کا انداز

عرضِ مطلب کے لئے بس ہے نگاہِ بیتاب
عشق کو آتا نہیں شرحِ بیاں کا انداز

انقلاب آئے گا دُنیا میں کوئی عالمگیر
آج بدلا سا ہے کچھ پیرِ مغاں کا انداز

دے کے دستک مرے دروازے پہ بولا یہ جنوں
تم کہو گر تو بدل دُوں میں جہاں کا انداز

اِن ستاروں میں ابھی ہوگا بہت ردّ و بدل
یہ بتاتا ہے مجھے کاہکشاں کا انداز

آج کے ذرّوں کی تعظیم کرو کل کے لئے
اِن کے ماتھے میں ہے خورشید جہاں کا انداز

باغ میں پھول کا اندازِ خموشی بدلا
بلبلو! تم بھی ذرا بدلو فغاں کا انداز

حال میں سارے مکینوں کا بتا سکتا ہوں
دُور سے دیکھ کے اک اک کے مکاں کا انداز

اب تبسم! تو بڑے شوق سے رو شام و سحر
بھا گیا اُن کو ترے اشکِ رواں کا انداز

○

نکلے اگر وہ سنگدل اور درد ناشناس
میرا تو کچھ قصور نہیں اے نگاہِ یاس

بجلی کی لہر بن گئی ہر موجِ بوئے گل
گلشن پرست دل کو نہ آئی بہار راس

کل تک تھا اُن کی بزم میں دلگیر ایک میں
لیکن ہے آج یار کی سب انجمن اُداس

سمجھا رہے ہیں آ کے اب اُلٹا مجھے ندیم
کرنے گئے تھے میرے لیے اُن سے التماس

دیکھی ہے اُن کے عشق میں یہ اک عجیب بات
کھا کر نیا فریب اُبھرتی ہے تازہ آس

شاید اسی کا نام ہے تکمیلِ عاشقی
ہر وقت مضطرب ہوں، نہیں دور ہوں کہ پاس

اُن کی برہنگی کے فسانے سوا ہوئے
اہلِ خرد نے جب کبھی بدلا نیا لباس

اُس کی ادائیں تجھ کو تبسم! ہیں کیسے یاد
اُس کے حضور جب ترے قائم نہ تھے حواس

○

آباد ہوئے عشق کی بستی میں مکیں خاص
لائے ہیں وہ ساتھ اپنے زماں خاص زمیں خاص

دہلیز تری سجدہ گہِ عام نہیں ہے
جھکتی ہے جو اس در پہ وہ ہوتی ہے جبیں خاص

جس طرح کوئی چاہے کرے چاک گریباں
دیوانگیٔ عشق کے آداب نہیں خاص

ہر تارِ نقاب اس کا بنا جلوہ گہِ عام
اس پر ہے یہ چرچا کہ ہے وہ پردہ نشیں خاص

اب حشر کہو تم اُسے یا عشق کا آغاز
اک زلزلہ آیا تھا مرے دل کے قریں خاص

کوسو نہ مجھے میں نے اگر کھایا ہے اک تیر
صیاد تھا وہ خاص، کماں خاص، کمیں خاص

گلشن میں ہے کچھ فکرِ خزاں، برق کا کچھ خوف
ہر شاخ کو لرزہ ہے، کہیں عام کہیں خاص

مقبول ہوئی دہر میں یوں سجدے کی یہ رسم
کچھ پایہ کا در خاص تھا، کچھ میری جبیں خاص

سنتے ہیں تبسم کو کسی بت سے ہوا عشق
یہ بات اگر سچ ہے تو ہوگا وہ حسیں خاص

○

کچھ حقیقت ہیں جہاں میں اور کچھ افسانہ ہم
انجمن ہم، شمع ہم، ہنگامہ ہم، پروانہ ہم

دو جہانوں میں ہے جو کچھ آؤ ہم تم بانٹ لیں
تم سنبھالو عرش و کرسی، دہر کا ویرانہ ہم

عشق کی ہر انجمن میں دل بہت غمگیں رہا
بستیوں میں ساتھ لے آئے ہیں اک ویرانہ ہم

حسنِ بے پروا ہو پابندِ وفا، ممکن نہیں
کس طرح سمجھائیں تجھ کو اے دلِ دیوانہ ہم

ہم کو پہچانیں گے وحشی آبلوں کے خون سے
لکھ چلے صحرا میں اپنے پاؤں سے افسانہ ہم

رک نہ سکتا تھا زیادہ دیر تک یہ حادثہ
تم تھے اک بیتابِ تجلی، منتظر کاشانہ ہم

مسکرا کر اُس نے قصہ طور کا دہرا دیا
ہو گئے آخر کو اے دل! ہوش سے بیگانہ ہم

شیخ صاحب آؤ اپنی اپنی جنت کو چلیں
تم وضو کا ظرف اٹھاؤ شیشہ و پیمانہ ہم

آسماں سے کوثر و تسنیم کی بارش ہوئی
چھوڑ کر مسجد چلے جب جانبِ میخانہ ہم

گردشِ افلاک کا سارا اثر مٹ جائے گا
تیز اگر کر دیں تبسم! گردشِ پیمانہ ہم

○

○

کون جانے شبِ ہجراں کی سحر ہو کہ نہ ہو
اک بڑا معرکہ درپیش ہے سر ہو کہ نہ ہو

راہِ الفت میں ہیں زلفوں کے گھنیرے سائے
اِس تپش زار میں چھاؤں ہے شجر ہو کہ نہ ہو

عمر گزری ہے کچھ اِس طرح جبیں سائی میں
جھکتا رہتا ہوں کوئی سامنے دَر ہو کہ نہ ہو

جو ترے وعدۂ فردا پہ نہ رکھتا ہو یقیں
تو ہی کہہ دے کہ اُسے موت کا ڈر ہو کہ نہ ہو

اِس نئے شہر میں آپہنچا ہیں کر دو اعلان
خود بخود سارے حسینوں کو خبر ہو کہ نہ ہو

کششِ ملکِ عدم کھینچے لئے جاتی ہے
ہم ہیں ہر وقت رواں، عزمِ سفر ہو کہ نہ ہو

دوستو! آؤ کہ اک حشر بپا کر ڈالیں
پھر کسی سے یہ زمیں زیر و زبر ہو کہ نہ ہو

آج جی بھر کے میں پی لوں سرِ مینا نہ، ندیم
کل خدا جانے یہ ساقی کی نظر ہو کہ نہ ہو

دیکھ لے جھانک کے اک بار تبسم کو ذرا
کل ترے کوچے میں یہ خاک بسر ہو کہ نہ ہو

○

مری آگہی ہے تری بے حجابی
مرا علم ہے، علمِ رُو سے کتابی

ترا حُسن مستی، مرا عشق مستی
اِدھر تُو شرابی اُدھر مَیں شرابی

کرے کون آباد ہونے کا ساماں
پسند آئے جب تجھ کو خانہ خرابی

اثر سے ہے محروم آہِ سحر گاہ
ہنوز رنگ اشکوں کا جب تک گلابی

خطا میری بے حد عطا اُن کی بیحد
یہاں بے حسابی، وہاں بے حسابی

حقیقت سے نزدیک بھی دُور بھی ہے
یہ دنیا ہے اِک منظرِ نیم خوابی

تبسم! سُنی ہم نے روداد محشر
مزا دے گئی تیری حاضر جوابی

ہمارے عشق کا ہر حوصلہ جواں ہے ابھی
خیالِ سود نہ اندیشۂ زیاں ہے ابھی

قدم قدم پہ ہے اک دارِ صورتِ گیسو
بلاکشانِ محبت کا امتحاں ہے ابھی

دبے دبے سے ہیں شعلے تو سرد سرد شرر
زمیں سے تا بہ فلک ہر طرف دھواں ہے ابھی

سرک رہا ہے رُخِ یار سے نقاب ہنوز
یہ کائنات ادھوری سی داستاں ہے ابھی

ہجومِ یاس نے سب خواہشوں کو گھیر لیا
غبارِ راہ میں گم میرا کارواں ہے ابھی

یہ اور بات ہے ہم اس کو ڈھونڈتے ہیں یہاں
سکوں کی جنس ترے شہر میں کہاں ہے ابھی

چلا ہے دام سے صیاد لے کے سُوئے قفس
ہوں مطمئن کہ مجھے فرصتِ فغاں ہے ابھی

قفس میں وقتِ بیاں پھر یہ ہچکیاں کیسی؟
اسیرِ نو! اگر اُس باغ میں خزاں ہے ابھی

دیا اِک اور فریب اُس نے کل تبسّم کو
یہی سبب ہے وہ دنیا سے سرگراں ہے ابھی

تمہارے جلوے سمٹ کے جب تک بلندیوں پر رہا کریں گے
وہی تقاضا رہے گا تم سے کلیم پیدا ہوا کریں گے

تری پسند اور نا پسند اب اگر ہے معیارِ قدر و قیمت
چنے ہیں تُو نے جو سنگریزے ہم اُن کو گوہر کہا کریں گے

سفینہ تیری رضا سے ڈوبا یہ کہہ سکے کون تیرے منہ پر
ہوئی ہیں بدنام تُند موجیں، بُرا اُنہیں ہم کہا کریں گے

ہمارے زخموں پہ تم ہنسے ہو تو کائنات اِن پہ ہنس رہی ہے
اگر یہی ہیں ہنسی کا ساماں تو ہم بھی اِن پر ہنسا کریں گے

یہی ہے طغیانِ ناز تیرا تو حشر تک ہم حباب آسا
بنا کریں گے، مٹا کریں گے، مٹا کریں گے، بنا کریں گے

نگاہ بس میں نہ دِل پہ قابو فریب ہے سب خودی کا دعوےٰ
ترے سہارے جیئے ہیں اب تک ترے سہارے جیا کریں گے

نہیں یہ ممکن کہ ہم گداؤں سے چھوٹ جائے سوال کی خُو
زباں سے گر کچھ نہ کہہ سکے تو نگاہ سے التجا کریں گے

مگر تھا نااہل مَیں ہی دنیا میں نبھ سکی کب مری کسی سے
یہ آپ کی بندہ پروری ہے کہ آپ مجھ سے وفا کریں گے

فسانے ہیں اہلِ دیر و کعبہ میں تیری ہلکی سی اک جھلک پر
اگر تو رُخ سے نقاب اُلٹ دے خدا ہی جانے یہ کیا کریں گے

ترے تصور میں کٹ رہی ہے۔ گناہ کیسا ثواب کیسا!
خطائیں مجبوریٔ عمل ہیں جو لوگ ڈھونڈتے ہیں خطا کریں گے

نہ وہ یہاں پر اُن کا جلوہ، تو حور کو تو دکھا رہا ہے
یہی ہے تیرا بہشت زاہد! تو ہم اسے لے کے کیا کریں گے

تبسم! اپنے دلِ حزیں کو نہ پھینک ٹوٹا ہوا سمجھ کر
سُنا ہے ساقی شکستہ ساغر کو زینتِ میکدہ کریں گے

زمانے کی زباں پر حشر کا جب نام آتا ہے
تمہاری جنبشِ ابرو پہ اک الزام آتا ہے

مجھے راتوں کے سناٹے مبارک باد دیتے ہیں
ستاروں کی زبانی جب ترا پیغام آتا ہے

گزر جاتی ہے ساری رات ساقی سے تقاضوں میں
کہیں پچھلے پہر جا کر میسر جام آتا ہے

مجھے الفت کی رسوائی نے بخشی ہے سرافرازی
جہاں آئے تمہارا نام، میرا نام آتا ہے

میں ہر افسانۂ محفل سکونِ دل سے سنتا ہوں
تڑپ اٹھتی ہیں سب نبضیں جب اُن کا نام آتا ہے

سکھایا عشق نے مجھ کو طریقِ فاش گفتاری
یہ بزمِ یار سے تا دار ہر جا [illegible] آتا ہے

یہ دستورِ چمن ہے ہر سحر ہو تذکرہ اُس کا
جو طائر عینِ فصلِ گل میں زیرِ دام آتا ہے

کہاں سے آ گیا عرفان اِس کڑوے سے پانی میں
کہ میخانے سے ہر اک صاحبِ الہام آتا ہے

کوئی نازاں ہو جب خوش کامیِ آغازِ اُلفت پر
تبسم! یاد مجھ کو عشق کا انجام آتا ہے

دورِ نو

سیاہ شب کی زمیں سے پھوٹا ہے چشمۂ نورِ خاورانہ — اُفق پہ وہ آفتاب اُبھرا کہ جس کا تھا منتظر زمانہ

نگاہِ ساقی کا ہے کرشمہ کہ رنگِ محفل بدل رہا ہے — بنا ہے اندازِ بادہ خواری نئے ہیں نغماتِ عاشقانہ

تم آج دیکھو کہ اُن کے زانو سے لگ کے بیٹھا ہوں انجمن میں — بجا کبھی تم نے بات کل کی کہیں نہ تھا کل مرا ٹھکانہ

مرے تصور کے آسماں پر ہزاروں سورج چمک رہے ہیں — وہاں ستاروں کی کیا حقیقت جہاں فضائیں ہوں بیکرانہ

میں جا رہا ہوں کہ حالِ لوح و قلم کا آنکھوں سے دیکھ آؤں — سنا ہے میں نے جنوں سے "تقدیر" اہلِ دانش کا ہے بہانہ

جگر مرا خون ہو کے آنکھوں سے قطرہ قطرہ ٹپک رہا ہے — مری یہ عادت ہے میں محبت کی کشت بوتا ہوں دانہ دانہ

پسند ہے تیرے عاشقوں کو رہِ شہادت کہ مختصر ہے — یہ تیری مرضی کہ تو نے چاہا طویل جادۂ غازیانہ

میں جب بھی نکلا ہوں سر کٹانے کو آپ اپنا کفن اٹھائے — لپیٹ کے لے اختیار مجھ سے بہت ہنسی عمرِ جاودانہ

خدا ہے یہ بات قیصر و شاہ مجھ کو اپنا حریف سمجھے — وگرنہ میری متاع کیا ہے سوائے یک نالۂ شبانہ

کچھ ایسے لمحات یاد ہیں مجھ کو میری ناکام زندگی کے — جدھر پھری یہ نگاہ میری پھری اُدھر قسمتِ زمانہ

میں تنگ آیا تھا روز کی آشیانہ سوزی سے باغباں تو — بجائے تنکوں کے بجلیوں سے بنا لیا میں نے آشیانہ

کہیں یہ میری جبیں نہ جھکتی، بڑا ہی مغرور راہ رَو ہوں — بہت غنیمت ہوا کہ رستے میں آ پڑا تیرا آستانہ

مری وفاؤں پہ طنز کر کے مرے خساروں کو گننے والو — وہ مجھ سے بڑھ کر رہے ہیں گھاٹے میں جن کا مشرب تھا تاجرانہ

سروں سے کج تاج کر رہے ہیں اُلٹ رہے ہیں سریرِ شاہی — وہ دیکھ اک زلزلہ سا آیا سنبھل سنبھل قصرِ خسروانہ

مجھے برا کہہ رہے ہیں کچھ لوگ دیکھ کر سامنے قیامت — کھڑا اکڑ آیا ہو جیسے میں نے خدا سے کہہ کچھ گستاخانہ

نباہ مشکل ہے دوستوں سے کہ ظرف سب کا جدا جدا ہے — کسی کو راس آیا حرفِ الفت کسی کو راس آیا تازیانہ

وہ مسکرانے رہے تبسم! مجھے یقیں ہے وہ مطمئن تھے
سنایا جب میں نے انجمن میں اُنہیں ترے عشق کا فسانہ

نہ درمیاں کی نہ تم ابتدا کی بات کرو
یہ وقت وہ ہے کہ اب انتہا کی بات کرو

صلیب و دار کے رستوں سے ہم گزر آئے
وفا کی داد ملے اب جزا کی بات کرو

نہ پوچھو ہم نے سلاسل کو کیسے توڑا ہے
مناسب اب ہے کہ تاج و عصا کی بات کرو

عروسِ دہر کی زلفوں کو ہم سنوار چکے
اب آؤ غازہ و رنگِ حنا کی بات کرو

تمہارے حجلے تک آئے پُلِ صراط سے ہم
طریقِ وصل و کشودِ قبا کی بات کرو

دکھاؤ ہم کو نہ ماضی کا فنِ بخیہ گری
جو اب ہے زیرِ فوائس ردا کی بات کرو

برس سکے جو نہ بادل گلہ ہے اُن کا فضول
اٹھی ہے اب جو گھٹا اُس گھٹا کی بات کرو

روا تھا دورِ خزاں تک بیانِ صرصر کا
یہ بزمِ گُل ہے یہاں تم صبا کی بات کرو

اُمنڈ کے آئے گا اِس بَن میں وحشیوں کا ہجوم
جنوں کا ذکر تو چھیڑو، وفا کی بات کرو

خموش بُت ہیں، ہو تم چُپ صنمکدے والو
گر اور کچھ نہیں آتا خدا کی بات کرو

چھپا رکھا ہے تبسّم نے آستیں میں جام
ذرا سمجھ کے تم اِس "پارسا" کی بات کرو

چمن میں برپا ہوا ہے شاید بہت بڑا انقلاب کوئی
روش روش ہیں چنار پیدا، نہیں ہے سرو و گلاب کوئی

یہ راز کیا ہے کہ رند ساقی سے مانگتے ہیں سنان و خنجر
کسی نے ساغر کو توڑ ڈالا ہے، پھوڑتا ہے رباب کوئی

میں دیکھتا ہوں کہ آسماں پر نئے ستارے ابھر رہے ہیں
کیا ہے اپنی جبیں کی افشاں کا اُس نے پھر انتخاب کوئی

وہ اہلِ عشق آئیں سامنے اب جنہیں ہے زعم اپنے حوصلے کا
اُٹھی ہے آج اُس کے در سے چلمن کھُلا ہے بندِ نقاب کوئی

کل اُس کے پاؤں سے چند ذراتِ خاک آ کر لپٹ گئے تھے
بنے ہیں کچھ اُن سے ماہِ کامل تو بن گیا آفتاب کوئی

کتابِ مہر و وفا کو میں نے دیا ہے ترتیب از سرِ نو
کٹے پھٹے تھے ورق کہیں سے، کہیں سے غائب تھا باب کوئی

لگا کے داؤ پہ جان و دل میں اٹھا ہوں دانستہ ہار کھا کر
بجا ہے مجھ سا نہیں محبت کے کھیل میں کامیاب کوئی

میں تک رہا ہوں ہجومِ محشر کو زخم ہائے جگر سنبھالے
بہت پشیماں ہیں یار، شاید ہوا ہے میرا حساب کوئی

مہیب و سنسان وادیوں میں میں چلتے چلتے ٹھٹک گیا ہوں
ہُوا ہے محسوس مجھ کو اکثر کہ ہے مرا ہم رکاب کوئی

یہ حکم بھیجا ہے بحر نے آج تم کو دریا کی تُند موجو!
نہ نکلے اب کف کسی کے منہ سے نہ ہو ہویدا حباب کوئی

خود اہلِ دانش نے کر لیے ہیں جہاں کی بربادیوں کے ساماں
خدا کو حاجت نہیں کہ بھیجے وہ آسماں سے عذاب کوئی

میں اُن کا بندہ ہوں اے تبسم! جو اُس کے کوچے سے آشنا ہیں
نہیں کسی اور سے تعلق ہو خواہ افراسیاب کوئی

میں دیکھتا ہوں کہ دورِ افق پہ پھر ہوا ہے تازہ غبار پیدا
طویل مدت کے بعد شاید ہوئے ہیں پھر کچھ سوار پیدا

وہ دیکھو آتش فشاں پہاڑوں کے سر پہ لاوا ابل رہا ہے
رہیں گے ہم اس دہکتی آتش سے اک خنک آبشار پیدا

بپا ہے کہرام چار جانب۔ قیامت آئی قیامت آئی
چلو نقابِ صنم الٹ دیں کہ ہو دلوں میں قرار پیدا

یہ کیا ستم ہے خزاں کی یورش سے گلستاں بار بار اجڑے
چمن نشینو! اٹھو کہیں سے کریں دوامی بہار پیدا

ٹھہر ٹھہر کر چھڑک رہا ہوں میں خون اپنا روش روش پر
میں جانتا ہوں گلوں کے رخ پر اسی سے ہوگا نکھار پیدا

وہی تھپیڑے ہیں تند موجوں کے غرق جن سے ہوئے سفینے
انہیں سے آخر ہوئے صدف میں یہ گوہرِ آبدار پیدا

اگر ہوں تلووں میں آبلے کچھ عجب ہے لطفِ برہنہ پائی
کئے ہیں بہرِ نشاط ہم نے سفر میں خود خار زار پیدا

عجیب ہے یہ شہر ہر مکاں سے صدا انا الحق کی آ رہی ہے
گرفت کس کس پہ ہو سکے گی کرے گا کون اتنے دار پیدا؟

یہی سبب ہے سمجھ رہا ہوں میں لوحِ تقدیر کے نوشتے
کہ عرش پر قدسیوں میں میں نے کئے ہیں کچھ رازدار پیدا

بوقتِ رخصت تم اک نظر اس کو دیکھتے جاؤ کج کلاہو!
یہ فقر کا دائرہ ہے ہوں گے جہاں نئے تاجدار پیدا

ہمیں تبسم! زمیں کی گردش کا رخ بدلنا پڑا ہے اکثر
بڑی مشقت سے کی ہے ہم نے یہ حالتِ سازگار پیدا

○

پھر گزارش ہے کہ ترغیبِ شفا مجھ کو نہ دو
میں مریضِ عشق ہوں، کوئی دوا مجھ کو نہ دو

میں نے پھر پایا مسیحاؤ! تمہارے دور میں
عمر ہو جس سے طویل، ایسی دعا مجھ کو نہ دو

کل تک اِس بستی کے رسم و رہ سے میں واقف نہ تھا
دوستو! میری وفاؤں کی سزا مجھ کو نہ دو

جل بجھا زلفوں کے سائے میں دلِ آتش اثر
اب مناسب ہے کہ دامن کی ہوا مجھ کو نہ دو

خارزارِ دشت ہے میرے جنوں کا منتظر
میں رہوں زنداں میں، تم یہ مشورہ مجھ کو نہ دو

جانتا ہوں میں کہ ہوگا پھر وہی انجامِ گل
تازہ پیغامِ بہارِ جانفزا مجھ کو نہ دو

کچھ حسیں کرنے لگے پردہ تمہارے وعظ پر
واعظانِ شہر! دیکھو یہ سزا مجھ کو نہ دو

کر رہے ہیں مجھ سے اہلِ آسماں اک مشورہ
اے زمیں والو! ابھی کوئی صدا مجھ کو نہ دو

یہ کھلونے توڑ دینا کچھ مری عادت سی ہے
زندگی کے کھیل میں تاج و عصا مجھ کو نہ دو

اِس قلمرو میں تبسم! ہیں زلیخائیں بہت
یہ نہ راس آئے گی، یوسف کی قبا مجھ کو نہ دو

○

غلاموں کی بغاوت

(آخری بند)

آنکھ مل کر اس طرح لیتا ہے انگڑائی غلام
ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیتا ہے زنجیرِ نظام

تیغِ ہمت ٹیک کر اٹھتا ہے صدیوں کا اسیر
دیکھتا ہے گھوم کر حیرت سے اس کو چرخِ پیر

اس کی چشمِ خشمگیں میں بجلیوں کا پیچ و تاب
اور نفس میں سینکڑوں شعلوں کا پنہاں التہاب

کوہ کا زہرہ پگھل جاتا ہے مارے خوف کے
بہ نکلتا ہے لہو یہ کھا کے سنگ و خشت سے

اس کی ہیبت سے لرز اٹھتے ہیں دشت و کوہسار
دیوِ استبداد کو چڑھتا ہے لرزے سے بخار

آسماں پر آتشِ دوزخ زمیں پر بجلیاں
عرصۂ ہستی میں ہر سو آگ کا دریا رواں

اس طرح ہوتی ہے اس ردِ عمل کی ابتدا
گوشے گوشے سے ستم کاری کی آتی ہے صدا

متحد ہو کر بہم راندے ہوئے تقدیر کے
دام پھیلاتے ہیں ہر سو مکر اور تزویر کے

سامنے حق کے سیاست بارور ہوتی نہیں
تیرگی کو نور پر حاصل ظفر ہوتی نہیں

غیظ کا اظہار یوں کرتے ہیں تن کر اہلِ شر
جس طرح پھنکارتا ہے سانپ زر پر بیٹھ کر

راہ میں آتے ہیں گو خاشاک کے بندِ گراں
آتشِ سیال کا تھمتا نہیں سیلِ رواں

جھونکتی ہے موت اس میں نیستی کی خاک جب
آنکھ سے چربی کے پردے دور ہو جاتے ہیں سب

بند ہو جاتے ہیں ان قسمت کے ہیٹوں پر مفر
بیڑیاں بن کر جکڑ لیتے ہیں ان کو سیم و زر

گھیر لیتی ہے قضا ہر موذیٔ ناکام کو
چھوڑ دیتی ہیں نجس روحیں خبیث اجسام کو

دہر سے مٹتا ہے اس خبثِ مجسم کا نشاں
سینۂ گیتی سے ٹل جاتا ہے اک بارِ گراں

مردِ حُر کہتی ہے دنیا بندۂ مجبور کو توڑ دیتا ہے وہ جب سر گردنِ مغرور کو

ذہنِ انساں سے نکل جاتے ہیں ژولیدہ خیال ایک ہی جھٹکے میں دیتا ہے وہ سب کس بل نکال

تیغ سے ہوتا ہے قائم آدمیت کا وقار

کر نہیں سکتا کوئی انسان، انساں کو شکار

عظیم الرحمٰن فرقان ایم اے

تاریخ پیدائش ۷ اپریل ۱۹۳۲ء ۔ آبائی وطن پانی پت ۔ تعلیم ایم اے (فارسی) بی ۔ ٹی ۔ ادیب فاضل۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد علامہ فخری سے حاصل کی اور شعر و ادب اور صحافت کا ذوق انہی سے ورثے میں حاصل کیا ۔

شعر گوئی کی مشق بچپن ہی میں شروع کر دی لیکن تعلیمی مصروفیات نے رفتہ رفتہ ذوقِ شعر کو پسِ منظر میں دھکیل دیا ۔

۱۹۵۰ء میں بی اے کیا ۔ ۱۹۵۱ء میں صحافت کی سند حاصل کی اور اخبار نویسی شروع کر دی ۔

۱۹۵۲ء میں ایم اے (فارسی) کرنے کے لئے اورینٹیل کالج لاہور میں داخلہ لیا ۔ کالج کی شاعرانہ فضا نے ذوقِ شعر گوئی کو پھر بیدار کر دیا ۔ اور کالج کے مشاعروں میں شرکت شروع کی ۔ کالج کو تو ۱۹۵۴ء میں خیرباد کہہ دیا لیکن شاعری کا مشغلہ اب تک بدستور جاری ہے ۔

گزشتہ چند برس سے انجمن ترقیٔ ادب ماڈل ٹاؤن کے جنرل سیکرٹری ہیں اور اس کے مشاعروں کی تنظیم اور مسلسل انعقاد میں ان کے انہماک اور لگن کو خصوصی دخل ہے ۔ سیاسیات میں ایک خاص مکتبۂ فکر سے تعلق رکھتے ہیں اور تغزل میں اپنے خیالات کو کمال خوبی سے پابندِ نے کرتے ہیں ۔ نظم ہو یا غزل، قطعہ ہو یا رُباعی ہر صنفِ سخن میں اپنے اس انداز کو برقرار رکھتے ہیں ۔ خیالات میں جدت ہے اور اندازِ بیان میں ندرت ۔

نگاہِ ناز دل پر مہرباں ہو گی تو کیا ہو گا
یہ بجلی آشیاں میں میہماں ہو گی تو کیا ہو گا

دو عالم درمیاں ہوتے پہ وحشت کا یہ عالم ہے
نظر ہی جب حجابِ درمیاں ہو گی تو کیا ہو گا

وہ خوش ہیں اپنی شہرت سے مگر جب اس سے وابستہ
مری دیوانگی کی داستاں ہو گی تو کیا ہو گا

میں کانٹوں پر بھی چل کر کس قدر گستاخ و سرکش ہوں
مرے زیرِ قدم جب کہکشاں ہو گی تو کیا ہو گا

فضا خاموش، گُل پژمردہ، بلبل دامِ گلچیں میں
جب اِس فصلِ بہاراں کی خزاں ہو گی تو کیا ہو گا

مری نظروں کی جراَت پر تو ہیں دونوں جہاں برہم
زباں جب حالِ دل کی ترجماں ہو گی تو کیا ہو گا

ہے آرزو نہ لطف نہ دیدار کی طلب / اب دل ہے اور لذتِ آزار کی طلب

لائیں بجا حضور، تقاضے بہار کے / پوری کریں گے ہم رسن و دار کی طلب

آتا ہے راہِ عشق میں ایسا بھی اک مقام / خود چارہ گر کو ہوتی ہے بیمار کی طلب

اک سعیٔ رائیگاں میں گنوا دی تمام عمر / تھی ہم کو ایک مونسِ غمخوار کی طلب

ہر صبح تیرے عارضِ تاباں کی جستجو / ہر شام تیرے گیسوئے خمدار کی طلب

سرخیٔ لب کی چاہ میں ہر پھول سینہ چاک / ہر نوکِ خار کو مژۂ یار کی طلب

رنگِ بہار، تیری قبا سے ہے شرمسار / رنگِ شفق کو ہے ترے رخسار کی طلب

مخمل کو وجہِ رشک ترے جسم کا گداز / نکہت کو تیرے سانس کی مہکار کی طلب

ہر سنگ کے لبوں پہ ہے تجھ سنگ دل کا ذکر / خنجر کو تیرے ابروئے خمدار کی طلب

گلشن کو تیرے حسنِ خود آرا کی جستجو / صحرا کو تیرے عاشقِ ناچار کی طلب

پست و بلند تیری جوانی کے مدّ و جزر / طوفاں کو تیری تندیٔ رفتار کی طلب

دریوزہ گر ہے برق تری اک نگاہ کی / محشر کو تیرے فتنۂ بیدار کی طلب

فرقانؔ دل سے مٹ گیا ہر نقشِ آرزو
کی جب سے اپنے بے سبب آزار کی طلب

تذکرہ صحنِ گلستاں کا نہ مے خانے کی بات
میرے لب پر ہے فریبِ راہ بر کھانے کی بات

شاخِ گل پر مسکنِ زاغ و زغن کا تذکرہ
بلبلِ شوریدہ سر کے زیرِ دام آنے کی بات

صبحِ فصلِ گل کے کیفِ عارضی کی داستاں
دن چڑھے ہنستے ہوئے پھولوں کے کملانے کی بات

موج کے ساحل سے ٹکرا کر پلٹ آنے کا ذکر
دوستوں کے دو گھڑی مل کر بچھڑ جانے کی بات

یک بیک شہرِ تمنا کے اجڑنے کا بیاں
در بہ درِ اہلِ وفا کے ٹھوکریں کھانے کی بات

اب تو مجھ سے وجہِ وحشت پوچھتے ہیں غیر بھی
کاش تم بھی پوچھ لیتے اپنے دیوانے کی بات

نقدِ جان و دل لٹا کر بھی پشیمانی نہیں
ہے کچھ ایسی ہی فریبِ دوستی کھانے کی بات

رازِ فرزانوں کے کرنے کو نو کر دوں فاش پر
اعتبار آئے گا کس کو سن کے دیوانے کی بات

یاں نہ کر فرقان ذکرِ آشیان و گلستاں
زیب دیتی ہے یہاں زنداں کی ویرانے کی بات

○

کارواں گُل کا بھٹکتا ہی رہا میرے بعد
پوچھا کس سے گلستاں کا پتا میرے بعد

کس کا پہرہ یہ گلستاں پہ لگا میرے بعد
دُور رہنے لگی کلیوں سے صبا میرے بعد

زخم کھلنے لگے، غنچوں کے دہن سِلنے لگے
سیلِ نکہت ہوا زنجیر بہ پا میرے بعد

وہ تو کرتے تھے مرے جوشِ جنوں کی تقلید
نہ ہوئی چاک کسی گُل کی قبا میرے بعد

پھول سیراب ہوں کیا، خار سمائیں تو کہاں
کوئی آیا ہی نہیں آبلہ پا میرے بعد

اُن میں عکسِ قد و گیسو نظر آیا کس کو
طالبِ دار و رسن کون ہوا میرے بعد

اے صبا حسن سے کہیو کوئی ایسا تو بتائے
جو وفا کر کے پشیماں نہ ہوا میرے بعد

خوش ہوں فرقان کہ ہے گردشِ چرخ آوارہ
کوئی اس کے لئے محور نہ رہا میرے بعد

○

تنہا نہیں ہے تُو ہی یہاں سوگوار شمع
ہر دِل ہے آج سینے میں اِک شعلہ بار شمع

یاں جل کے عمر بھر بھی، شکایت نہ کر سکے
تُو ایک شب کے جلنے پہ ہے اشکبار شمع

ہلکا سا تیرے حُسن کا پرتَو لئے ہوئے
نازاں ہیں، مہر، ماہ، گُلِ نو بہار، شمع

ہاں مستعار تابشِ عارض تو مانگ لی
لیکن کہاں سے لائے گی ویسا نکھار شمع

ہم سیلِ تیرگی کے مقابل تمام شب
بیٹھے رہے جلائے سرِ رہگذار شمع

کی روشنی تلاش، مِلی مرگِ بے کسی
ظاہر میں موجِ نور ہے باطن میں نار شمع

کب سوزِ غم پہ ہوتا ہے ماحول کا اثر
جلتی ہے بزم میں ہو کہ کُنجِ مزار شمع

فرقان! خامشی سے ہم اس آگ میں جلے
بہرِ نمود جس میں جلی آشکار شمع

○

رُخِ بہار ہے گو صحنِ گلستاں کی طرف
نگاہِ برق بھی ہے شاخِ آشیاں کی طرف

نوائے شوق پہ بندش ہے، منع خندۂ گل
صبا کو حکم ہے، جائے نہ گلستاں کی طرف

ہر اک روش پہ ہے مقتل، ہر ایک سرو پہ دار
بہار، رشک سے دیکھے نہ کیوں خزاں کی طرف

قفس میں اذنِ فغاں ہے، چمن میں وہ بھی نہیں
نہ دیکھ دیدۂ حسرت سے آشیاں کی طرف

نہ جانے آگ لگی ہے کہ ابر آیا ہے !
دھواں دھواں ہے فضا صحنِ گلستاں کی طرف

لگے نظر کو جو مانوس راہزن کے نقوش
تو ذہن لوٹ گیا میرِ کارواں کی طرف

شگفتہ شعروں کو اشعارِ تر میں ڈھال لیا
ہم اہلِ ضبط جو مائل ہوئے فغاں کی طرف

کسی جبیں پہ نظر آئی گر شکن فرقان
پلٹ کے پھر نہیں دیکھا اُس آستاں کی طرف

○

شمعِ اُمید نہ سوزِ غمِ ہجراں کا چراغ
کوئی باقی نہیں اب دل کے شبستاں کا چراغ

کل صبا باغ میں پیغامِ سحر لائی تھی
آج گُل کر گئی آ کر مرے زنداں کا چراغ

اب نہ خورشیدِ تمنّا ہے نہ مہتابِ جمال
اِک تری یاد ہے اور دیدۂ گریاں کا چراغ

ہو گا اے وعدہ شکن کیا نہ کبھی نور فگن
میرے زنداں میں ترے حسنِ پشیماں کا چراغ

راہِ اخلاص، تکبّر کو دکھانے کے لئے
ہے شبِ تار میں روشن دلِ سوزاں کا چراغ

اے جنوں تُو ہی جلا، دیر و حرم ہار چلے
قلبِ انساں میں ہمدردیٔ انساں کا چراغ

کس سے ہے کس میں چمک، کون ہے سرچشمۂ نور
حسن کی برقِ تپاں ؟ دیدۂ حیراں کا چراغ ؟

نخوتِ حسن یہ مانے کہ نہ مانے فرقان
ضَو فگن واں بھی ہے تیرے غمِ پنہاں کا چراغ

○

تم سے کیا کرتے بیانِ رنج و آلامِ فراق
تم سے مل کر یاد کب رہتے ہیں ایامِ فراق

ہے دھندلکا تو مسلّم، صرف اتنا فرق ہے
تم اسے کہتے ہو صبحِ وصل، مَیں شامِ فراق

ہاں تمہارا حکم سر آنکھوں پہ، لیکن کس طرح
گیت گاؤں وصل کے پیتے ہوئے جامِ فراق

یہ حسین دعوے حقائق کو بدل سکتے نہیں
صبح کے سانچے میں ڈھل سکتی نہیں شامِ فراق

پوچھتی تھی شمع، نورِ صبح سے، بجھتے ہوئے
اختتامِ زندگی ہے یہ کہ انجامِ فراق؟

آج کون آئے گا، کس پر فاش ہوگا رازِ دل
"جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق"

اب بھی تم کیوں سرگراں ہو، اب تو وحشت نے مری
سی لیا چاکِ گریباں، پی لیا جامِ فراق

وہ تمنا، وہ طلب، وہ کشمکش، وہ انتظار
تجھ کو پا کر بھی نہ بھولا کیفِ ایامِ فراق

کیا کریں الفاظ قربِ حُسن کا عالم بیاں
یاد ہے، جس کے رشکِ صبح تھی شامِ فراق

دیر سے ہوں محوِ سرگوشی خیالِ یار سے
درحقیقت شامِ تنہائی نہیں، شامِ فراق

مانعِ جد و جہد ہے احترامِ حکمِ دوست
ورنہ کیا تھا پائے وحشت کے لئے دامِ فراق

لے ذرا اپنی طلب اپنے جنوں کا جائزہ
صرف غیروں پر نہ دھر فرقاں الزامِ فراق

○

○

جفائیں کریں گے ستم گر کہاں تک
خدا کی خدائی نہیں آسماں تک

ہُوا ہے بہ تقریبِ فصلِ بہاراں
چراغاں فلک سے مرے آشیاں تک

بہر کوچہ مقتل بہر گام رہزن
مرے غم کدے سے ترے آستاں تک

بیاں کیسے لفظوں میں ہو شدّتِ غم
ہزاروں مراحل ہیں دل سے زباں تک

یہ ذرّے ستارے نہیں، کیا عجب ہے!
رسائی مگر شرط ہے آسماں تک

رگِ جاں پہ نشتر زنی کر رہا ہے
وہ حرفِ طلب جو نہ آیا زباں تک

اٹھایا وہ بارِ گراں دل نے جس سے
ہراساں تھے سب، دشت سے آسماں تک

ترے حسن پر یہ نکھار آ نہ سکتا
پہنچتا نہ گر میرے حسنِ بیاں تک

جنوں کو بھلا کیا نصیحت کرے گی
خرد جس کی حد فکرِ سود و زیاں تک

ترے شعر فرقاںؔ سُنے سب نے لیکن
نہ پہنچا کوئی تیرے حسنِ بیاں تک

○

کیا کرے آبلہ پا خارِ بیاباں کا خیال
رہبرِ شوق ہے اک راہزنِ جاں کا خیال

ہر خوشی میری تری برقِ تبسم کی ضیاء
میرا ہر اشک تری کاوشِ مژگاں کا خیال

دیکھ کر دار و رسن کو بھی ہمیں آتا ہے
تیری قامت کا، ترے گیسوئے پیچاں کا خیال

چاکِ دل، چاکِ جگر سِل نہیں سکتے نہ سہی
حکمِ حاکم ہے رکھو چاکِ گریباں کا خیال

اب یہ دل مستحقِ دولتِ غم بھی تو نہیں
اِس میں آیا تھا کبھی درد کے درماں کا خیال

دو قدم مرحلۂ شوق سے تھی منزلِ دار
روکتا کیسے ہمیں عافیتِ جاں کا خیال

یہ گماں ہی نہیں ہوتا کہ سحر ہو گی کبھی
"شبِ تاریک ہے اور گیسوئے پیچاں کا خیال"

بے ثباتی کا جہاں کی جو چلا بزم میں ذکر
آ گیا ہم کو ترے وعدہ و پیماں کا خیال

اتنا مشکل تو نہیں تھا غمِ فرقت سہنا
گر ستاتا نہ ترے لطفِ گریزاں کا خیال

جب گرے خاک پہ تپتے ہوئے آنسو فرقان
مجھ کو بے ساختہ آیا ترے داماں کا خیال

○

کیا عہد کر گئی وہ تری ملتفت نظر
دل سے خلش امید کی نکلی نہ عمر بھر

اُس حسنِ لازوال سے وابستہ ہوں نہ گر
نغموں میں آئے کیف نہ آہوں میں ہوں شرر

حیراں ہوں اس سے قبل تھا کیا مقصدِ حیات
یہ خواب تو ہو رہی ہے تری چاہ میں بسر

اللہ رے وہ لمحۂ نظارۂ جمال
کرتی ہے شکوہ تنگیٔ داماں کا جیب نظر

وہ تابشِ جمال سے ہر سمت چاندنی
چھائی وہ گیسوؤں کی گھٹا عقل و ہوش پر

پھولی ہوئی وہ پیرہنِ سیت پہ شفق
محشر لیے جلو میں شبابِ کشیدہ سر

وہ چشمِ نیم باز کی مستی کہ الاماں
شوخی کہ الحفیظ، شرارت کہ الحذر

تم آپ اپنے دل کو بھی سمجھا نہ پاؤ گے
اک بار دیکھ لو جو مرا مرکزِ نظر

سجدوں سے ہے مرے کہ ترے نقشِ پا سے ہے
تابندہ مثلِ کاہکشاں، خاکِ رہگذر

زنداں میں اپنے اس کی نہ پہنچی کوئی کرن
لاکھوں دیئے بجھا کے تو آئی بھی اک سحر

تاروں کے ڈوبنے پہ کہ دل ڈوبنے کے بعد
دیکھیں شبِ فراق کی ہوتی ہے کب سحر

آہیں جو خوفِ دہر سے سینے میں تھیں اسیر
آئی ہیں لب پہ روپ تغزل کا دھار کر

محجوب عارضوں سے وہ زلفوں کی چھیڑ چھاڑ
فرقان اب وہ شام اودھ کھو گئی کدھر

○

○

نہ امید کہ اُجالے ہیں نہ یاس کے دھندلکے
یونہی سو گئے ہیں ارماں ہمہ شب مچل مچل کے

تجھے اہتمام اس کا کہ سبو سے مے نہ چھلکے
مرے شوق کا تقاضا، ترا جامِ حسن چھلکے

شبِ ماہ زیرِ انجم تجھے پا کے ہوش ہوں گم
کبھی تیرا ہاتھ لرزے کبھی میرا جام چھلکے

میں تمام عمر رولوں اگر ایک اشکِ خونیں
ترے پیرہن کو پالے مری آنکھ سے نکل کے

رہِ عاشقی میں ہمدم جو بلا سو اپنی محرم
یہ مصلحت نہیں ہے کہ چلیں سنبھل سنبھل کے

مرے دشتِ زندگانی میں بہار کی نشانی
ترے پائے نرم و نازک کے نقوش ہلکے ہلکے

میری ہر ادا سے فرقانِ غمِ دوست ہے نمایاں
کبھی بن کے اشکِ سوزاں کبھی روپ میں غزل کے

○

پھر اُس نے ہنس کے مری آرزو کو ٹھکرایا
پھر ایک غنچہ کھلا، ایک پھول مرجھایا

ہر ایک گام پہ گو مصلحت نے سمجھایا
ترا فریبِ وفا پھر بھی بارہا کھایا

ہر ایک رات کے ناکام انتظار کے بعد
ہر ایک وعدۂ فردا پہ اعتبار آیا

تُو مجھ کو دُور ہی رکھ یوں نہ ہو کہ پڑ جائے
ترے غرور پہ میرے خلوص کا سایا

اٹھی قریبِ رگِ جاں اک آشنا سی خلش
مجھے حضور نے شاید کہ یاد فرمایا

ترا کرم بھی کچھ ایسا گراں نہ تھا لیکن
ہمارے دل کو ترا غم ہی سازگار آیا

گرے ہیں خاک پہ جب میرے اشکِ مجبوری
نظر کے سامنے آنچل تمہارا لہرایا

کچھ اور تو نہ ہوا یورشِ الم کا اثر
تمہارا نام مگر لب پہ بار بار آیا

سنا تو ہے دن نکل رہا ہے فراق کی رات ڈھل رہی ہے
مگر مری شمعِ غم نہایت خلوص سے اب بھی جل رہی ہے
وہ دل کہ مسکن تھا آرزوؤں کا، اشکِ خوں بن کے بہہ چکا ہے
مگر تمنائے دل کہ پیہم مچل رہی تھی، مچل رہی ہے
اگرچہ سیلِ جہاں تجھے بھی بہا کے لے جا چکا ہے — لیکن
جو شمع تو تُو نے جلائی تھی، اب بھی میرے دامن میں جل رہی ہے
یہ تم نے اچھا کیا کہ آئے رہِ وفا پر نہ ساتھ میرے
کہ زندگی خود بھی میرے ہمراہ اس پہ مشکل سے چل رہی ہے
وہ میری اُلفت کی شمع جس کو، بزعمِ خود تم بجھا چکے ہو!
ملے جو فرصت تو دیکھ لینا، تمہارے دل میں بھی جل رہی ہے
رُکے تو کس سے شبابِ سرکش، چھپے تو کیونکر جمالِ کامل
سبو سے صہبا ابل رہی ہے، نقاب جلوؤں سے جل رہی ہے
اب آ بھی جاؤ کہ دستِ دنیا اسے بھی دل سے نہ محو کر دے
وہ یادِ ماضی جو شامِ غم میں تمہارا نعم البدل رہی ہے

○

ہمیں دشتِ جنوں میں خستہ پائی سازگار آئی — ہمارے خون سے خاکِ بیاباں میں بہار آئی
یہ کیا تقدیس تھی، کیسی کشش تھی چند تنکوں میں — طوافِ آشیاں کو برقِ سوزاں بار بار آئی
نہایت مختصر ہے، قصۂ کوتاہیٔ قسمت — اِدھر ہم زیرِ دام آئے اُدھر فصلِ بہار آئی
غلط تھا میرا عہدِ ترکِ الفت، اب تو آجاؤ — مری ٹوٹی ہوئی توبہ تمہیں در در پکار آئی
عدم میں بھی جنونِ عشق شاید کارفرما ہے — گلِ تر سینہ چاک آیا تو شبنم اشکبار آئی
حریمِ ناز تک وہ آپ لے جائیں سو لے جائیں — جنوں ناکام پلٹا، عقلِ خود بیں شرمسار آئی
نظر آئے جو فرقاں چند گُل دامانِ گلچیں میں
چمن والے سمجھ بیٹھے کہ گلشن میں بہار آئی

○

میں مصلحتاً چاکِ گریباں نہیں رہتا — تم یہ نہ سمجھنا کہ پریشاں نہیں رہتا
اللہ رے وہ مجبوریٔ حالات کا عالم — جب ایک بھی آنسو سرِ مژگاں نہیں رہتا
جب یادِ مسرت بھی چبھوتی نہیں نشتر — جب غم بھی تِرا سلسلہ جنباں نہیں رہتا
وہ ترکِ محبت پہ بھی آجاتے ہیں جب یاد — پھر دل مرے بس میں دلِ ناداں نہیں رہتا
وہ آج بھی پہلو سے گذر جائیں تو ہمدم — کوسوں بھی نشانِ غمِ دوراں نہیں رہتا
انجامِ محبت پہ پریشاں سہی لیکن — میں اپنی وفاؤں پہ پشیماں نہیں رہتا
فرقاں ہے زخموں کا دفینہ مرا سینہ
میں مصلحتاً چاکِ گریباں نہیں رہتا

○

○

حصارِ رنج و الم سے نکل گئے ہوتے
جو ہم بھی وقت کے سانچے میں ڈھل گئے ہوتے

تمہیں ہمارا نشیمن ہی پھونکنا تھا اگر
گرا کے برقِ تبسم نکل گئے ہوتے

وہ اشک جو ہمیں پینے پڑے بہ مجبوری
زمیں پہ گرتے تو پتھر پگھل گئے ہوتے

شکستہ پائی نہیں عذرِ نارسائی کا
دیارِ دوست میں پلکوں کے بل گئے ہوتے

تمہارا جوشِ جنوں خود ہی خام ہے، ورنہ
حریمِ حسن کے آئین بدل گئے ہوتے

ہر ایک گام پہ فرقاںؔ خرد نے کی تنبیہ
کہیں پہنچ کے تو آخر سنبھل گئے ہوتے

○

غمِ الفت بھی عجب سرِّ نہاں ہوتا ہے
ضبط ہوتا ہے یہ ظالم نہ بیاں ہوتا ہے

زندگی نام ہے جس کا وہ یہی ہے شاید
یہ جو اک درد قریبِ رگِ جاں ہوتا ہے

ذکر ہوتا ہے تمہارا مرے ہونٹوں پہ مدام
گو بہ اندازِ حدیثِ دگراں ہوتا ہے

میرے سجدوں کے نشاں ہیں کہ ترے قدموں کے
کہکشاں کا ترے کوچے پہ گماں ہوتا ہے

تو بہت دور سہی پھر بھی دھڑکتے دل پہ
مجھ کو اب تک تری آہٹ کا گماں ہوتا ہے

پوچھئے کس سے مداوائے محبت کہ یہ درد
لا دوا ہو کے تو اپنے پہ عیاں ہوتا ہے

جھوم جھوم اٹھتے ہیں اربابِ طرب بھی فرقاںؔ
کتنا دلکش مرا اندازِ فغاں ہوتا ہے

○

اذنِ فغاں

محبت ترک کر کے، توڑ کر امید کا رشتہ
چلا آیا تھا ہیں، دفن کے ارمانوں کی میت کو
یہ سوچا تھا، یہاں اب لوٹ کر واپس تو کیا آنا
پلٹ کر بھی نہ دیکھوں گا تمناؤں کی تربت کو

یہ سوچا تھا دیارِ دل کو اب ویراں ہی رکھوں گا
نظر کو بے نیازِ جلوۂ جاناں ہی رکھوں گا
چھڑا لایا ہوں جس دل کو تمہارے دامِ گیسو سے
اب اُس دل کو اسیرِ حلقۂ حرماں ہی رکھوں گا

اب اِس مرقد کی جانب نور کا پرتو نہ آئے گا
کوئی اِس طاق پہ آ کر نہ شمعِ دل جلائے گا
گھٹائیں تو کجا اب اِس پہ شبنم بھی نہ برسے گی
قیامت تک یہ تربت میرے اشکوں کو بھی ترسے گی

مگر میں آج پھر بزمِ طرب میں لَوٹ آیا ہوں
سُلگتے خشک ہونٹوں پر نوائے التجا لے کر
جو اک ناکامِ الفت کی متاعِ زندگانی ہے
اُسی ٹوٹے ہوئے عہدِ وفا کا آسرا لے کر

نہ سمجھو میں یہاں آیا ہوں تجدیدِ وفا کرنے
تمہاری مست مست آنکھوں سے دامانِ جنوں بھرنے
نہ سمجھو میں دکھاؤں گا تمہیں داغ اپنے سینے کے
کہ مدت ہو چکی، چاکِ گریباں سی لیا میں نے
مُقفل ہیں تمہارے خوفِ رسوائی سے لب میرے
سلگتا ہے جگر، آنکھوں سے آنسو بہہ نہیں سکتے

یہ عالم ہے کہ اب ضبط و خموشی دیکھ کر میری
زمانہ مجھ سے کہتا ہے طلب صادق نہ تھی تیری
کہیں میری خموشی سے وفاؤں پر نہ حرف آئے
تمہارا حسن ارزاں، میری الفت خام کہلائے
نہیں کہتا "مجھے تم سایۂ گیسو عطا کر دو"
فقط جلتی ہوئی آنکھوں کو دو آنسو عطا کر دو

نواب صمصام الدین فیروز
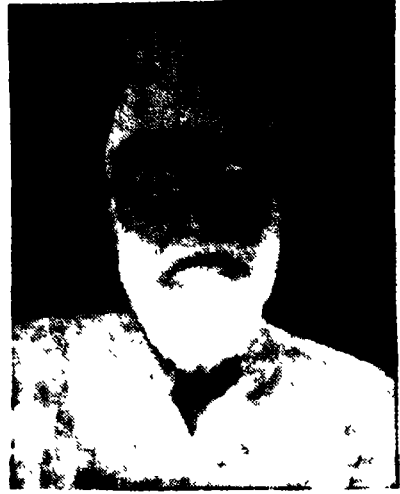
صاحبزادہ مرزا صمصام الدین احمد خاں نام، فیروز تخلص ۱۶ ستمبر ۱۸۸۵ء کو دار الریاست لوہارو میں پیدا ہوئے اور اس حساب سے اِس وقت اسّی سال سے اُوپر کے ہیں۔ اِن کے والد نواب بہادر مرزا عزیز الدین، فخر الدولہ نواب علاء الدین احمد خاں علائی والیٔ لوہارو کے تیسرے فرزند تھے۔

بچپن سے شباب تک کا زمانہ لوہارو ہی میں گزرا۔ وہیں اپنے ماموں مرزا الیق بیگ ازبکی کے زیرِ تربیت اردو فارسی اور مولوی عبد العزیز بی اے گجراتی سے مڈل تک انگریزی تعلیم حاصل کی۔ پھر کچھ عرصہ میرٹھ کالج میں بھی پڑھتے رہے۔ گھریلو تعلیم میں دینیات اور ادبیاتِ فارسی کا خصوصی مطالعہ کیا۔

فنِ سپہ گری سے لگاؤ خاندانی روایات میں شامل تھا۔ چنانچہ ۲۴ سال کی عمر تک سواری، نیزہ بازی، تیر اندازی اور تفنگ بازی کے ساتھ پہلوانی، شناوری میں بھی مہارت حاصل کی اور انعامات لیے۔ عملی زندگی کا آغاز پولیس کی ملازمت سے کیا۔ ۱۹۱۰ء میں سب انسپکٹر بھرتی ہوئے اور تیس سال بعد انسپکٹری کے عہدے سے پنشن لی جو اب تک مل رہی ہے۔

تین شادیاں کیں۔ پہلی دختر نواب اسحاق خاں رئیس جہانگیر آباد ضلع بلند شہر سے، دوسری دخترِ نواب امین الدین والیٔ لوہارو سے اور تیسری دختر نواب کیپٹن مرزا عزّ الدین خان مرحوم والیٔ لوہارو سے۔ پہلی اور تیسری اہلیہ موجود ہیں۔ اولاد میں ۶ بیٹے اور ۷ بیٹیاں ہوئیں جن میں سے اب گیارہ اولادیں ۴ بیٹے اور ۷ بیٹیاں بفضلہٖ بقیدِ حیات ہیں۔

قیامِ پاکستان پر آپ لاہور تشریف لے آئے اور ماڈل ٹاؤن میں قیام پذیر ہیں۔ شعر و سخن کا ذوق

مرزا الٰہی بخش خاں معروف، نواب علاؤالدین خاں علائی، نواب مرزا ضیاء الدین نیر اور مرزا امراؤ جان عالم الدین احمد سائل دہلوی ایسے بزرگوں سے گویا ورثہ میں پایا ہے۔ شاعری کی ابتدا بچپن میں مرزا الیتی بیگ ازکی کی صحبت سے ہوئی لیکن کسی سے تلمذ نہیں کیا۔ اس وقت تقریباً آٹھ ہزار اشعار محفوظ ہیں جن میں ایک کے قریب غزلیں ہیں دوسرے اصنافِ سخن میں نعت، منقبت، قطعات نیز گھریلو اور تقریباتی نظمیں اور منظوم خطوط شامل ہیں۔ مرزا صاحب کو اپنے نعتیہ کلام پر خصوصیت سے ناز ہے اور اسے وسیلۂ نجات سمجھتے ہیں۔

مرزا صاحب آزاد خیال اہلسنت والجماعت، پابندِ صوم و صلوٰۃ، قرآن کے عاشق اور حدیث کے شیدا ہیں۔ حلقۂ مذاکراتِ اسلامیہ کے مستقل رکن ہیں اور اسلامیات پر مقالہ نگاری بھی کرتے رہتے ہیں۔ اس پیرانہ سالی میں بھی ایک ماہ میں قریباً دوبار قرآن کا ورد کر لیتے ہیں۔ روزانہ ۶ گھنٹے مطالعہ اور دو تین میل کی سیر معمول میں داخل ہے۔ لطف یہ کہ ان معمولات کا شعر گوئی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ فکرِ شعر بھی گویا ایک معمول ہے۔ طرحی غزل تقریباً اسی روز موزوں ہو جاتی ہے۔ ایک نعتیہ مجموعۂ کلام "تحفۂ عقیدتِ فیروز" شائع ہو چکا ہے۔ اس میں ان کی منظوم سوانح عمری ایک دلچسپ اور قابلِ مطالعہ نظم ہے۔ غزلیات اور دوسرا کلام مختلف اخبارات و رسائل میں شائع اور ریڈیو پاکستان سے نشر ہوتا رہا ہے۔ دیوان تقریباً مرتب ہو چکا ہے اور اس کی اشاعت کی تیاری ہے۔ کلام اکثر ترنم سے پڑھتے ہیں اور جب موڈ میں ہوں تو سحر انگیز سماں باندھ دیتے ہیں۔ بڑے زندہ دل اور بذلہ سنج ہیں۔ بزمِ شعر و سخن میں ان کے دلچسپ جملے زعفران زار کھلا دیتے ہیں۔ آپ کا مطالعہ نہایت وسیع ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ اپنے وجود میں ایک معاشرہ سمیٹے ہوئے ہیں الغرض مرزا صاحب کا وجود غالب و علائی کی یادگار اور اردو ادب کے لئے مغتنمات میں سے ہے۔

○

جب تمہارا حُسن میرا عشق بے اندازہ تھا
پھر تمہارے آستاں کا بند کیوں دروازہ تھا

اُن کے نازِ حُسن کا شاید یہی خمیازہ تھا
اُن کی شہرت سے مرا ٹکرا گیا آوازہ تھا

تیری فرقت کے جہنم میں ترا کوئی پیام
میرے سوزِ آرزو کو خُلد کا دروازہ تھا

اُن کا ناوک جانتے یا جانے مرا سینہ اسے
روزِ محشر تک بھی میرا زخمِ دل کیوں تازہ تھا

بے نقوشِ رنگ رنگِ عالم عالم کی دمک
اس کی صبحِ حُسن کا ہی پرتوِ خمیازہ تھا

فرش سے تا عرش تھا میداں تری پرواز کا
اے گلِ آدم تجھی کو اپنا کم اندازہ تھا

شب کو اُن کی چہرہ افروزی سے آنکھیں خیرہ تھیں
صبح سوچا۔ تھی حقیقت یا طلسمِ غازہ تھا

ہم نے در در پھر کے سوچا دوست دشمن کے لئے
تھا کھُلا یا رب تو تیرا ہی کھُلا دروازہ تھا

چھانٹ کر لاکھوں میں آخر میرے ہی دل پر ہوا
کیا ترے تیرِ غلط انداز کا اندازہ تھا

جس نے تیری آنکھیں دیکھیں ساقئ کوثر کرم
اس کو جامِ ہفت قلزم مے بھی کم اندازہ تھا

ایک تو فیروزآ اوپر سے تھے غالؔب کے رشید
ہم کبھی آئے بھی جب تیرا کھُلا دروازہ تھا

○

○

ترے لقا کی تمنا ہے زندگی کا سبب
الٰہی تابقیامت رہے قیام طلب

بہے جو آنسو تو دل ہی نہیں ہوا ہلکا
"تمہاری یاد سے جاتی رہی گرانی شب"

نہ پوچھیے مرے ساقی کا رنگِ میخانہ
ہے کوئی قدح بدل اس میں کوئی قدح بلب

تری بدلتی نگاہوں کے ساقیا صدقے
ہے تیرے رندوں کو زقوم میں بھی کیفِ عنب

گھرا ہوا تھا جو ظلمت میں روزِ ہجراں کی
چمک اٹھا ترے قدموں سے وہ ستارۂ شب

دکھا دکھا مجھے رہ اُن کی جن پہ ہے انعام
بچا بچا مجھے اُن سے ہے جن پہ تیرا غضب

وہ ساز دے مجھے یارب جہاں کی محفل میں
کہ ہر طرب میں ہو پنہاں صدائے نوحہ طلب

ترا کلام ہے فیروزؔ اس سخن کا ردیف
بنایا گیا جو اک آواز میں عجم کو عرب

○

سائنس ہو ضروری نہ درکار ہو ادب
کھل جائے خود نظر جو ہو دیدار کی طلب

میں نے کہا حضور! اگر اب نہیں تو کب
فرمایا دیکھو وعدہ میں لکھا ہے اب نہ جب

اے وہ کہ تیرے جام سے جیتے ہیں جاں بلب
ہم سے بھی تیری بزم میں بیٹھے ہیں بے طلب

تیرا ہی حسن ہے جو ہے تیرا ہی رُخ نما
اک ورنہ مشتِ خاک تھا آئینۂ حلب

ناحق نہیں یہ جلوۂ صد رنگ بزمِ دوست
ہر رنگ کی غرض ہے تو ہر رنگ کا سبب

قائم ہوں اس کے وعدہ پہ لیل و نہار میں
دیتا ہے بے طلب وہ مجھے رزق روز و شب

پروانے ہم کو شمع پہ یہ درس دے گئے
مٹ جائے اپنا ایک تو مٹ جائیں سب کے سب

فیروز اُس بغیر مسرت نہیں نصیب
ہر چند لے رہا ہوں بہت عیش بے طرب

میری جو ناامیدیٔ مے سے فغاں ہے چپ — شرمندگی سے رحمتِ پیرِ مغاں ہے چپ
کیا سحر غیر ہے، مری تائیدِ عرض پر — دکھ دے میں ہم قلم ہے مرا ہم زباں ہے چپ
کہہ تو گیا۔ مگر مرے رازوں کی خیر ہو — سن کر مرے بیاں کو مرا راز داں ہے چپ
اِک میں ہی چپ نہیں ترے نغمات کے بغیر — گلگشت چپ ہے سبزۂ آبِ رواں ہے چپ
رکتے نہیں قدم یہ کسی سنگ و خار سے — میری سبک روی ہے تو کوہ گراں ہے چپ
جانیں نہ شیشہ۔ شیشۂ دل کو مرے حریف — شدت سے اس کی آہنِ آہنگراں ہے چپ
دل کھول کر لگایئے پابندیاں مگر — حق گو کی یہ زباں ہے یہ ہوتی کہاں ہے چپ
جس کی زباں کے آگے نہ دہقاں کا ہل چلا — وہ غیر آج اُس کے مرے درمیاں ہے چپ

فیروز مانشاء کا پانا ہے عشق میں
اس جا پہ سو بیانوں سے بہتر بیاں ہے چپ

جس بات کو ہم شام کو سمجھے تھے مناجات — نکلی وہ سحر دل کی کسوٹی پہ خرافات
کیا اس کی شکایت کہ حبیب بدلے ہوئے ہیں — اپنا ہی تغیّر تھا کہ بدلے گئے حالات
ہے بادۂ رنگیں کا اثر جامِ تہی میں — اے دل یہ سمجھ آج کے ساقی کی کرامات
اُس شوخ کی تقریر میں سب کچھ تھا سرِ بزم — لیکن مرے مطلب کی نہیں نکلی کوئی بات

عزّت نہ گنوا اپنی غزل گوئی کی فیروز
جب کام نہیں کچھ تو عبث تیرے خیالات

"نہ وہ دیوار کی صورت، نہ وہ در کی صورت"
تیری صورت نے بدل دی مرے گھر کی صورت

ڈھیر تھا خاکِ سیہ کا ترے جلووں کے بغیر
تیرے جلووں سے بنی شمس و قمر کی صورت

اُس کی رحمت کی اُمیدوں پہ مری آہِ شبی
دِل سے رقصندہ نکلتی ہے اثر کی صورت

دِل میں رکھتا اگر اندیشۂ کامِ دریا
قطرہ پاتا نہ تہِ آب گہر کی صورت

دیکھ ویرانہ کی وحشت کو دعا کرتا ہوں
اب نہ دکھلائیو مولا مجھے گھر کی صورت

سایۂ غیر کا کل اس پہ شبہ سا جو پڑا
در پہ جانا نہ لگا بابِ سقر کی صورت

بختِ بے خواب کو اُس خواب پہ قرباں کر دوں
جس میں آ جائے نظر۔ خیر البشر کی صورت

اُڑ گئی خاک مری اور نہ نکلی ہے ہے
مر کے بھی اس کی گزرگہ میں گزر کی صورت

گر گیا کھوکھلا ہو کر شجرِ عمر مرا!
نخلِ اُمید میں دیکھی نہ ثمر کی صورت

مجھ کو اس شوق پہ نازش ہے کہ فیروز گئی
چشمِ قاتل پہ مرے زخمِ جگر کی صورت

کیا ہے یہ کیا بتائیے اُس کی نظر کی چوٹ
چوٹ اُس نظر کی تیرِ قضا و قدر کی چوٹ

چل چارہ گر نہیں ہے یہ تیغ و تبر کی چوٹ
میرے جگر پہ ہے کسی تیرِ نظر کی چوٹ

کل شب تھی چوٹ دونوں طرف سے چلی ہوئی
اُن کی نظر کی چوٹ مری چشمِ تر کی چوٹ

کس کی نگاہِ تیز تھی یارب کہ آج تک
افلاک پر ہری ہے قمر کے جگر کی چوٹ

کیوں سر کو آستاں سے نہ پھوڑوں کہ حشر میں
سیما سی بن کے نکلے ترے سنگِ در کی چوٹ

چلتی ہے میرے عشق میں اور اُن کے حسن میں
چلتی ہے جیسے چرخ پہ شمس و قمر کی چوٹ

چوٹوں میں بے دلوں کی وہ کیفِ جفا کہاں
یارب پڑے جگر پہ کسی بے جگر کی چوٹ

ظاہر کی چوٹ اور ہے باطن کی چوٹ اور
ناحق کو حق بنا گئی تیغِ خضر کی چوٹ

واعظ بلا رہا ہے جو میخانہ خاک میں
پھیکی نہیں ہے خشتِ خُمِ بادہ گر کی چوٹ

کیوں آپ توپ گولوں سے دہلاتے ہیں اسے
کافی ہے میرے طائرِ دل کو تو پَر کی چوٹ

نکلے تو ہو چمن میں خرامش کو صبحدم
سہہ لو گے کیا خرامِ نسیمِ سحر کی چوٹ

سہلاتا پھر رقیب اِسے حشر تک ذرا
میری ہے یہ نہیں کسی بد ہو نفر کی چوٹ

تالے جو پھر رہا ہے تو سینے کو ڈھال سا
کھائی نہیں ابھی کسی ناوک نظر کی چوٹ

چلنی تھی ۔ دل پہ چل گئی چوٹ ان کی ایک دن
اور چوٹ بھی وہ چوٹ کہ تھی عمر بھر کی چوٹ

فیروز اپنی یہ ہے کہ قسمت جو پھر گئی؟
کھا بیٹھے اپنے سر میں ہم اپنی سپر کی چوٹ

○

حسن بولا مری نگاہ سے بچ　　عشق بولا کہ میری آہ سے بچ

نہیں پستی پہ ہمتِ مرداں　　تو عزمِ عشق لیے پناہ سے بچ

نہیں کوئی مقامِ دل جز غم　　خطراتِ مقام و راہ سے بچ

مجھے اپنی کھکھیڑ کیا کم ہے　　تو مصافِ گدا و شاہ سے بچ

ارے زاہد نہ توڑ شیشۂ مے　　ارے ظالم تو اِس گناہ سے بچ

نہ بچے گر نہ بچ قضا سے مگر　　دلِ ناداں بتوں کی چاہ سے بچ

غمِ دنیا ہی میں ، ہے خیر تری　　سرِ تسخیرِ مہر و ماہ سے بچ

دمِ شب کشتہ ہوں میں اے فیروزؔ
میری آہِ دمِ پگاہ سے بچ

○

زیارت کے واسطے رُخِ مصحف اثر کو ڈھونڈ　　بوسے کے واسطے لبِ شکر شکر کو ڈھونڈ

رکھتا ہے ذوقِ درد تو کر سنگِ دل تلاش　　ہے شوقِ زخم تو کسی ناوک نظر کو ڈھونڈ

سینے میں میرے ناوک و نشتر مذاق ہیں　　خنجر کی نوک سے مرے قلب و جگر کو ڈھونڈ

زلف و عذار و خال و خط و چشم و لب نہ دیکھ　　ان شش جہات رنگ میں حسن ہنر کو ڈھونڈ

جاں مفت دے رہا ہے سر بر و بحر میں　　لینا ہے کچھ تو عالمِ بے بحر و بر کو ڈھونڈ

کب تک یہ آرزوئے مہ و سالِ نو بہ نو　　چھوڑ اب یہ سال و ماہ مہ و سالِ گر کو ڈھونڈ

کر لے دلیلِ نقشِ محمدؐ کو دل نشیں　　قامت کو اس کی دیکھ نہ مہ لے کمر کو ڈھونڈ

فیروزؔ اپنی ناصیہ ریزی کے راستے
چوٹی پہ لامکاں کی نشانِ سفر کو ڈھونڈ

○

بدلا بدلا ہے اگر اہلِ زماں کا انداز
مجھ سے بدلے نہ مرے جانِ جہاں کا انداز

سوزِ بلبل ہے مری آہ و فغاں کا انداز
سازِ طوطی ہے مرے حسنِ بیاں کا انداز

چڑھتے دریا بھی بدل دیتے ہیں چالیں اپنی
ہجر میں دیکھ مرے اشکِ رواں کا انداز

طرزِ گفتار بدلتی رہی ہر چند ان کی
ہم نے بدلا نہ مگر اپنی زباں کا انداز

سروِ پا بستہ ہی رقصاں ہے بہ تشریفِ قدوم
دیکھ کر آج میرے سروِ چماں کا انداز

تیر تو تیر تھا۔ سینے پہ پڑا پار ہوا
جم رہا دل میں مگر تیری کماں کا انداز

گلشن اجڑے چلے جاتے ہیں شب و روز مگر
ہے وہی اپنے جہانِ گزراں کا انداز

ہم تو ہیں اُس ہی ادادار کے قائل اے دل
ہر ادا جس کی بدل دے رگِ جاں کا انداز

خوفِ میدانِ قیامت مرے دل سے نکلا
دیکھا جب زندگیِ کوئے بتاں کا انداز

شمع و پروانہ اڑا لے گئے کل شب فیروز
گریہ کا طرز، مرے ضبطِ فغاں کا انداز

○

چشمِ گریاں نے نہ چھوڑا قطرۂ خوں دل کے پاس
جائیں کیا صیدِ زبوں کی جون میں قاتل کے پاس

معجزہ یہ بھی ہے میرے دلبرِ کامل کے پاس
دور رہتا ہے نگاہوں سے وہ بیٹھا دل کے پاس

ماہتابِ داغ دار اے چشمِ ظاہر اور ہے
جلوۂ ناقص نہیں میرے مہِ کامل کے پاس

یاں پشیمانی کا اُن پر حُسنِ ظن ہے اور وہ
تسمہ باقی دیکھنے کو آئے ہیں بسمل کے پاس

ہے اشارت ابروئے جاناں میں تسلیمات کی
رکھتے ہیں گردن جھکی ہم تیغۂ قاتل کے پاس

دھار پر دریا کی چڑھ کر کھیل موجِ تند سے
کیا دھرا ہے موجِ کاہل کے سوا ساحل کے پاس

ہے بصد کامِ نہنگِ موج مقصودِ حیات
یہ گہر ملتا نہیں ہے دامنِ ساحل کے پاس

کچھ کڑی نظروں سے دیکھا کچھ تبسم کر گئے
رکھ گئے پھایا بھی گویا میرے زخمِ دل کے پاس

ایک دوراں عمر کا اک ہمدمِ ناقص کے ساتھ
ایک لحظہ زندگی اک مرشدِ کامل کے پاس

کھو چکا فیروزؔ سب کچھ راہ میں در تک ترے
کچھ نہیں اب جُز دعائے دل ترے سائل کے پاس

○

پیغامِ محمد کو تھا قرآن میں خاص
جبریل سی ہستی کو کیا اس کا امین خاص

ہے نشانِ شہی کے لئے جیسے کہ نگین خاص
ہے نبرسے درِ خاص پہ میری بھی جبین خاص

میں نے جو کہا چاہتا ہوں آپ کو بے حد
بولے کہ مری چاہ کوئی بات نہیں خاص

لاتے ہیں وہ پیمان شکنی کرنے کو جائز
ہر صبح و مسا غیب سے اک عالمِ دیں خاص

غالب نے کہا سنتے ہیں ہر دانہ پہ ہے مُہر
دیکھوں ہے مرے نام کا بھی آم کہیں خاص

دیکھو اگر اس کو تو چُھری ہاتھ میں لے کر
نکلے گا حسینوں میں مرا ماہ جبیں خاص

اِس دَورِ مساوات میں کیا فرقِ مراتب
اُس بزم میں بیٹھے ہیں جہاں عام ہوئیں خاص

کیا لعل ہیں فیروز نرستہ تمہ دل میں
پڑتی ہے نظر ان کی تو پڑتی ہے یہیں خاص

○

اس کی جفا ہی کیا کہ کروں میں جفا معاف
کردوں میں اک نگاہ پہ بسد خونِ بہا معاف

میں اس پہ ناز کرکے نہ کیا کیا کیا معاف
بخشش نے اس کی مجھ کو نہ کیا کیا کیا معاف

آنی عبس پہ عشق میں ہے آیتِ صحیح
ہوتے یہاں ہیں معنی لفظِ خطا۔ معاف

اُس آستاں پہ جس نے نہ باقی رکھی جبیں
اُس کو ہوئی نماز و نیاز و دعا معاف

غیروں کے پہلو۔ ہم سے کنارے یہ کیا حضور
کہنا پڑا ہے صاف۔ ہماری خطا معاف

تھا کشتنی مگر اسی رشتے سے اے رقیب
کیا تو بھی یاد رکھے گا۔ جاکر دیا معاف

وہ دن بھی تھے کہ ہم کبھی اک موئے زلف پر
کر دیتے تھے محاصلِ ملکِ ختا معاف

رہنے دیا نہ حشر کا قصّہ بھی درمیاں
ظالم کہا سُنا بھی تو کروا گیا معاف

فیروز فردِ جرم سے کیا کیا تھے دغدغے
دیکھا تو اُس کے در پہ تھا لکھا ہوا 'معاف'

○

یہ جمعِ نقش اور شمائل الگ الگ — یہ امتزاجِ طبع، خصائل الگ الگ
یہ حسنِ آشکار تو صنعت کا دیکھئے — لیلائے جاں ہے ایک محامل الگ الگ
ظالم سے جب کہا حق و باطل تو مت ملا — بولا یہاں نہیں حق و باطل الگ الگ
شائع بُرا نہ کہہ جو تِرا مقتدی نہ ہو — ہیں سب کی زندگی کے مسائل الگ الگ
جس رہ کے سنگِ میل پہ وحدت کا ہے نشاں — راہی جدا جدا ہیں نہ منزل الگ الگ
دنیائے کیف و کم میں وہ کانٹے کی تول ہیں — حق جیسے جنت جنت ہے باطل الگ الگ
ہے ان سے جو چکیدہ مرا خون مت سمجھ — رکھتے ہیں تیغ و خنجرِ قاتل الگ الگ

فیروز کس کی برقِ نگاہی کی ہے کشش
رہنے لگا ہے پہلو سے کچھ دل الگ الگ

○

دہر میں کیا کیا کرشمے کر کے دکھلاتا ہے دل — ہم کو مرواتا ہے دل اور ہم کو جلواتا ہے دل
نظر میں جو پہنچتا ہوں اِس صورت کدہ میں کیا کہوں — کس پہ آتا ہے مرا کس پہ نہیں آتا ہے دل
اُٹھ رہا ہے طرفِ بالیں سے وہ شمعِ زندگی — چھوٹی جاتی نبضیں ہیں بیٹھا چلا جاتا ہے دل
کچھ نہیں پروا مجھے غمازیِ اغیار کی — چھٹ نہیں سکتے وہ جن کا دل سے مل جاتا ہے دل
آنکھ دل کی ترجماں ہے کس طرح باور نہ ہو — آنکھ شرماتی ہے اُن کی میرا شرماتا ہے دل
میرے اُن کے عہد و پیماں میں یہی تو فرق ہے — واں قسم کھاتی زباں ہے یاں قسم کھاتا ہے دل
دل کی دھڑکن مت سمجھئے دل کی باتیں جانئے — دم نکل جاتا ہے جس دم چپ لگا جاتا ہے دل

شوخیِ فیروز پر یارِ ہمیں کہنے لگا
آپ کے پہلو سے اب تو اپنا گھبراتا ہے دل

○

دیکھ پائے ساقیا جب سے ترا میخانہ ہم
انجمن ہم، شمع ہم، پیمانہ ہم، پروانہ ہم

آہ وہ جامِ قریب انجام جس کے دور سے
گم کئے بیٹھے ہیں اپنا جادۂ میخانہ ہم

کیسے شناہیں چشم تھے ہم، کیسے اندھے ہو گئے
پا سکے آخر نہ دامِ زیرِ آب و دانہ ہم

سربلندی تھی جہاں میں جب جنونِ عشق تھا
منہ کے بل آئے ہوئے جب عشق سے بیگانہ ہم

آج صحراؤں میں اٹھتی جا رہی ہیں منزلیں
بیٹھے ہیں شہرِ صنم میں لے کے در و بے خانہ ہم

ظرف کی قسمت تو دیکھو اُن کو خُم بھی قطرہ ہے
ہم کو قطرہ مل گئی تو پھرتے ہیں مستانہ ہم

ہیں حدیثِ دوست سے غافل کہ یاد آتا نہیں
رہ گئے ہیں بن کے کیوں بھولا ہوا افسانہ ہم

ہم سے رندوں سے اگر برقی بخیلی ساقیا
خشتِ خُم سے توڑ پھینکیں گے ترا پیمانہ ہم

کر گیا ساقی بخل ایسا بے پروائے غیر
خود بنے بیٹھے ہیں اپنا بادہ و پیمانہ ہم

بھولے بیٹھے امروز و دی کو بھول جانے کچھ نہ تھا
بھولتے اے کاش۔ لیکن وعدۂ فردا نہ ہم

جانے وہ کیسی ادا تھی جس سے باصد پاس و بیم
رکھتے ہیں پھر بھی اُمیدِ جلوۂ جانانہ ہم

عاشقی کی زندگی میں اپنا اُن کا میل کیا
وہ دلِ فرزانہ رکھتے ہیں، دلِ دیوانہ ہم

حادثاتِ دہر میں فیضؔ و نیّرؔ غالبؔ کی طرح
"برق سے کرتے ہیں روشن بزمِ ماتم خانہ ہم"

○

○

قصور یہ ہے کہ جلووں کا کچھ حساب نہیں
نہیں کہ مجھ کو ملی چشمِ انتخاب نہیں

کہاں نقاب نہیں ہے کہاں حجاب نہیں
چھپا کہیں مرا مہتاب، آفتاب نہیں

نہ پیشِ آئینہ پوچھو کہ کون ہنر ہے
"یہ وہ سوال ہے جس کا کوئی جواب نہیں"

کہا جو اُن سے کہ خط کا جواب تو دیتے
کہا جواب نہ دینا ہی کیا جواب نہیں

وہ دانہ دُرِ صدفِ چشم نے مجھے بخشا
کہ لا سکا یمِ رحمت بھی جس کی تاب نہیں

پھرا ہوا ہوں میں پیرِ مغاں کی بیعت سے
کہ میکدہ میں رہی اب کوئی شراب نہیں

پڑا ہی رہنے دے آخور میں اسے فیروز
کہ دل خراب ہے درخورِ انتخاب نہیں

○

میکدے میں تو دخیلِ قسمتِ صہبا نہ ہو
توڑ دے جام و سبو ساقی کہیں ایسا نہ ہو

ہم تو بے سُدھ ہی پڑے ہیں ہم سے کچھ شکوہ نہ ہو
تم ہی جب پردے لگا لو راز کیوں افشا نہ ہو

یہ بھی جلوہ ہے کہ خود جلووں میں تم غائب ہو
یہ بھی پردہ ہے کہ پردہ ہو کے بھی پردہ نہ ہو

وہ اشاراتِ خفی پر اُس سراپا شرم کا
آنکھیں نیچی کر کے کہنا دیکھنا چرچا نہ ہو

تیری بے تابی بجا اے دیدۂ حیراں مگر
وہ جگہ مجھ کو دکھا دے جس جگہ پردہ نہ ہو

کب کہا ہم نے کہ دنیا کچھ نہیں لیکن کہا
ہیچ ہے دنیا جو عقبیٰ حاصلِ دنیا نہ ہو

مل نہیں سکتی تمناؤں سے معراجِ بقا
ہر قدم جب تک کہ تیرا آسماں پیما نہ ہو

ہے جہاں پیشِ نظر فیروز کیا دیکھوں اِسے
دیکھنا ہے اب تو وہ کچھ جو کبھی دیکھا نہ ہو

نہیں ختم کر سکے گی کوئی گردشِ زمانہ — ترے حسن کی حکایت مرے عشق کا فسانہ

مری زندگی کا مقصد میری عمر کا نشانہ — کہ بنے تو تیر تیرا مری موت کا بہانہ

یہ سہی کہ اس نظر پر ہے چڑھا ہوا زمانہ — مرا دل ہی بن سکے گا ترے تیر کا نشانہ

انہیں دردِ دل سنایا تو کہا متمسخرانہ — نئی بات کوئی کہیے - یہ پرانا ہے فسانہ

ترے حسن کی امانت مرے دل نے ہی تو جھیلی — ترا حسن اگر ہے یکتا مرا عشق بھی یگانہ

نہ رہی تری حکایت نہ رہی مری روایت — نہ رہا ترا زمانہ، نہ رہا مرا زمانہ

جو نہ ہوتا آشیانہ تو نہ گرتی کوئی بجلی — بیں فراغتِ چمن سے ہوں رہینِ آشیانہ

مجھے اس کی بندشوں نے ہے کچھ ایسا تنگ پکڑا — کہ زمانہ مجھ کو چھوڑے تو میں چھوڑ دوں زمانہ

نہ میں خار کی طرف ہوں نہ میں گل کی ہی طرف ہوں — ہے نسیم کی طرح سے مری چال درمیانہ

یہ ہیں آب و تاب رخ پر ترے خال و زلف ظالم — کہ ہے میرے مرغِ دل کو تہِ دام آب و دانہ

ارے توبہ اس چمن میں مری فرصتِ نظارہ — نہ ابھی پلک تھی جھپکی کہ گزر گیا زمانہ

نہ ملے کہیں کسی کو خس و خارِ نامرادی

ترے غم کے ہفت قلزم ہیں کرانہ تا کرانہ

لن ترانی بھی، اُدھر جلوۂ سینائی بھی
حق ترا دل شکنی بھی ہے دل آرائی بھی

اے کہ زیبا تجھے محفل بھی ہے تنہائی بھی
مجھ کو دی جان تو دے دولتِ یکجائی بھی

خواہشِ نفس کا دشمن بھی ہوں شیدائی بھی
یوسفی بھی مری فطرت ہے زلیخائی بھی

عاشقوں کو ترے کیا لومتہ لائم سے حذر
سرخروئی ہے ترے کوچے میں رسوائی بھی

اصبرو، رابطو آیا ہے پیامِ جاناں
بے قراری بھی ہے مطلوب شکیبائی بھی

شکوۂ ظلمِ صنم خود پہ تظلم ہے کہ وہ
قتل کرتا ہے تو کرتا ہے مسیحائی بھی

کیا عجب ہے مری فریاد سے روزِ محشر
پہ چُپ لگا جائے سرافیل کی کرنائی بھی

جو کبھی جا کے نہ آئے جو کبھی آ کے نہ جائے
تم نے الٹا دی وہ پیری بھی وہ برنائی بھی

بند کا بند پھرا نامہ بدستِ قاصد
رنج پر رنج ہوا رنجِ قلم سائی بھی

کیا خسارہ ہے کہ ہم سر بھی لئے، جی بھی لئے
جان کھوئی بھی غمِ دوست میں اور پائی بھی

عرصۂ عشق میں کیا کہیے کہ ایسا ہے حریف
پیش قدمی بھی جہاں فخر ہے پسپائی بھی

غرّہ سجدوں پہ نہ کر اے دلِ نامحرمِ عشق
صاحبِ در کی ہی بخشش ہے جبیں سائی بھی

میرا افسانۂ دل سُن کے وہ یوں کہنے لگے
ایسا لگتا ہے کہ فیروزؔ ہیں سودائی بھی

یزدانی جالندھری

دُبلا پتلا جسم، متوسط قامت، کشادہ پیشانی، یاس آشنا آنکھیں جیسے زمانے کی ناقدر شناسی کی شکوہ گزار ہوں۔ شمس العلماء علامہ تاجور نجیب آبادی نے اب سے تقریباً چوتھائی صدی پہلے ان کا تعارف کراتے ہوئے لکھا تھا۔

"جالندھر کی شاعر خیز سرزمین ان کا وطنِ مالوف ہے اور لاہور کی حیات فشار فضا میں نفس شماری کر رہے ہیں۔ صوبے کے مشہور ادیب ہیں۔ تنقید نگاری، مقالہ نگاری، شاعری ساحری غرض ہر میدان کے شہسوار ہیں۔ بظاہر خاموش مگر بباطن فریاد کار۔ چہرہ معصومیت کا جلوہ زار ہے۔ دل کا حال خدا جانے یا صاحبِ دل۔ بڑے شریف مگر کسی کے حریف نہیں۔ اپنے ماحول سے بیزار اور ماحول نژادوں کی بے کرداری پر ماتم گسار رہتے ہیں۔"

پورا پیدائشی نام (تاریخی نہیں) ابوالبشیر سید عبدالرشید یزدانی شاہ لیکن ادبی حلقوں میں صرف یزدانی جالندھری کے نام سے معروف ہیں۔ والد کا اسم گرامی سید بہاول شاہ مرحوم آبائی گاؤں میر پور سیداں، تحصیل نکودر ضلع جالندھر۔ ۱۷ جولائی ۱۹۱۵ء کو جالندھر کی ایک نواحی بستی میں پیدا ہوئے۔ بچپن جالندھر میں گزرا۔ تعلیم منٹگمری میں حاصل کی۔ جہاں ان کے والدین ۱۹۲۲ء میں بسلسلہ تدریس نقلِ مکان کر گئے تھے۔

۱۹۳۱ء میں گورنمنٹ ہائی سکول منٹگمری سے میٹرک کرنے کے بعد دو سال تک اسلامیہ کالج لاہور میں گزارے لیکن گھر کے حالات اعلیٰ تعلیم کے راستے میں حائل ہو گئے۔ چنانچہ سلسلۂ تعلیم منقطع کر کے کشمکشِ روزگار میں اُلجھنا پڑا۔ بعد میں پرائیویٹ طور پر منشی فاضل کی تیاری کی اور پنجاب یونیورسٹی سے ادیب فاضل پاس کیا۔

صحافتی زندگی کا آغاز ۱۹۳۳ء میں ہفت روزہ "ہمدرد" کی ادارت سے ہوا۔ پھر اسی سال کے اواخر میں اپنا ذاتی ادبی مجلہ "غالب" جاری کیا اور منٹگمری ایسے پسماندہ علاقے کی ادبی آبیاری کی۔ لیکن یہ جریدہ

ملک بھر کے ادبی حلقوں اور ممتاز اہلِ قلم سے خراجِ تحسین وصول کرنے کے باوجود کاروباری ناتجربہ کاری کا شکار ہو گیا اور کافی مالی زیرباری کے بعد اسے بند کر دینا پڑا۔ جب سے اب تک قلم کی مشقت ان کی زندگی اور ذریعۂ معاش ہے۔ اپنی چھتیس سال کی اس ادبی زندگی میں بیسیوں اخبارات و رسائل کے عملۂ ادارت سے منسلک رہے، جن میں سے ہفت روزہ "ادا کار" لاہور، ماہنامہ "بیسویں صدی" لاہور و دہلی، ہفت روزہ "پارس" لاہور، ماہنامہ "شاہکار" لاہور۔ ماہنامہ "افکار" کراچی۔ ماہنامہ "محفل" لاہور۔ اور ہفت روزہ "چٹان" لاہور خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ ان دنوں پندرہ روزہ "امدادِ باہمی" (سابق "نیا راستہ") سے بطور مدیرِ معاون منسلک ہیں۔

شعر و سخن سے لگاؤ عطیۂ فطرت سمجھئے۔ بچپن ہی میں اشعار موزوں کرنے لگے تھے۔ چنانچہ مڈل پاس کرنے کرتے اچھے شعر کہنے لگے۔ اور اسکول میں "گلشنِ ادب" کے نام سے ایک ادبی جماعت قائم کر کے اپنے اس ذوق کی تسکین کا سامان کیا۔ البتہ کلام کی اشاعت کا سلسلہ ۱۹۳۳ء میں شروع ہوا اور پہلی غزل علامہ سیماب اکبرآبادی کے مجلہ "شاعر" آگرہ میں اور پہلی نظم "افسانۂ دوراں" ۱۹۳۶ء میں ماہنامہ "ادبِ لطیف" لاہور میں شائع ہوئی جس کے ایڈیٹر اُن دنوں ان کے کالج کے کلاس فیلو میرزا ادیب بی اے تھے۔ پہلا افسانہ ماہنامہ "بیسویں صدی" لاہور میں شائع ہوا جس میں غالباً ان کے سب سے زیادہ افسانے شائع ہوئے۔

۱۹۳۴ء میں مولانا افسر صدیقی امروہی کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہوئے۔ فطری مناسبت اور پختہ گوئی کی بدولت دو سال بعد ہی استاد نے انھیں "اصلاح سے بے نیاز" اور "بجائے خود استاد" کی سندِ عطا کر کے ان کے کمالِ فن کا اعتراف کیا۔ اس کے باوجود جب بھی انھیں کہیں شک گزرتا تو استاد کی طرف رجوع کرتے۔ اس کے ساتھ ہی ۱۹۳۶ء میں ماہنامہ "شاہکار" سے منسلک ہونے کے باعث شمس العلما علامہ تاجور (مرحوم) سے مشورۂ سخن کرنے لگے اور یہ سلسلہ علامہ تاجور کے انتقال تک جاری رہا۔

اب تک ان کی بے شمار طبع زاد اور مترجم کتابیں شائع ہو کر ملک بھر سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہیں اور بعض کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ افسانوی مجموعوں میں حسن پرست اور دوسرے افسانے، اپنا پیارا اور دوسرے افسانے، ٹیگور کے افسانے، ٹالسٹائی کی کہانیاں اور قیدی کے خطوط اور مترجم ناولوں میں الجھن، آوارہ، دیوداس، وادیٔ پرخار، پتو کھیر بالی، منزل اور دیہاتی سماج بالخصوص بہت مقبول ہوئے۔

ایک مدت تک بمبئی، کراچی اور لاہور کی فلمی دنیا سے بھی افسانہ نگار، منظرنامہ نگار، مکالمہ نویس، نغمہ نگار اور معاون ہدایت کار کی حیثیت سے وابستہ رہے۔ لیکن یہ لائن انھیں راس نہیں آئی۔

اصنافِ سخن میں سے نظم، غزل، رباعی، قطعہ ہر ایک پر استادانہ دسترس رکھتے ہیں۔ ایک

دور میں صرف رباعی کی طرف متوجہ ہوئے اور چند ماہ میں دو سو سے زائد رباعیوں کا مجموعہ مرتب ہو گیا۔ اس میں طبع زاد رباعیوں کے علاوہ خیام اور غالب کی رباعیوں کے تراجم بھی شامل ہیں۔ لیکن اس مجموعہ کی اشاعت کی نوبت اب تک نہیں آئی۔

یزدانی جالندھری کی شاعری کو تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ابتدائی دور ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۸ء تک۔ اس دور کا بیشتر کلام ضائع ہو چکا ہے یا مختلف اخبارات و رسائل کے اوراق میں منتشر ہے۔ دوسرا دور ۱۹۳۹ء سے ۱۹۵۰ء تک۔ اس میں سے بیشتر نظمیں ۱۹۵۰ء میں بمبئی میں چوری کی نذر ہو گئیں۔ تیسرا دور ۱۹۵۰ء سے بعد کا جو زیادہ تر غزلیات پر مشتمل اور "سیم یاسمن" کے نام سے زیر ترتیب ہے۔

یزدانی جالندھری واردات و احساسات کے شاعر ہیں۔ ان کے کلام میں گہرائی بھی ہے اور گیرائی بھی۔ خیالات میں جدت ہے اور انداز بیان میں ندرت۔ وہ فنی اقدار اور روایت کا دامن کبھی نہیں چھوڑتے۔

کون پہچانے گا اُجڑے ہوئے گھر کی صورت
اب وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت

گم کہاں ہے مرے خورشیدِ نظر کی صورت
ہوں جگر چاک، گریبانِ سحر کی صورت

یہ خرابے، یہ دھندلکے، یہ نشیب اور یہ فراز
ہوگئی ہائے یہ کیا راہ گزر کی صورت

چاند سجدے میں جھکا ہے ترے در کی جانب
چاندنی دیکھ رہی ہے مرے گھر کی صورت

آج یہ رنگِ گلستاں ہے کہ ہر ساغرِ گل
اشکِ شبنم سے ہے پُر، دیدۂ تر کی صورت

رہنما یاد رہے، تلخیٔ مسافت کے طفیل
ہم مگر بھول گئے راہگزر کی صورت

تیری صورت، تری سیرت کے اُجالوں کی قسم
ہم نے دیکھی ہے شبِ غم میں سحر کی صورت

اجنبیت سی ہے یہ دیدہ و دل میں کیسی
اہلِ دل دیکھتے ہیں اہلِ نظر کی صورت

کس توقع پہ مرے ہاتھ اُٹھیں بہرِ دعا
جب نہ آتی ہو نظر کوئی اثر کی صورت

کام اب ابرِ بہاراں کا نہیں یزدانی
سوئے گلزار چلو برق و شرر کی صورت

○

صحنِ چمن سے جلوۂ رقصاں گیا پلٹ
تم کیا گئے کہ عہدِ بہاراں گیا پلٹ

کیوں جانے جاتے لوٹ کے پھر آ گئی بہار
کیوں آتے آتے دورِ گُل افشاں گیا پلٹ

شاید کچھ اور سہنے ہیں ملاح کے ستم
کشتی ہماری دیکھ کے طوفاں گیا پلٹ

در پردہ دشمنی ہے اب آئینِ دوستی
افسانۂ خلوص کا عنواں گیا پلٹ

اک جنبشِ نگاہ سے وہ شوخ خود پسند
بے ساختہ بساطِ دل و جاں گیا پلٹ

اُس تیر کی خلش ہے رگِ جاں بنی ہوئی
کل آ کے جو قریبِ رگِ جاں گیا پلٹ

دیکھا ہمیں جو پیرِ خرابات کے حضور
خود کاروانِ گردشِ دوراں گیا پلٹ

یزدانی! اُن کا غم بھی نہیں اب شریکِ حال
ویران گھر کو دیکھ کے مہماں گیا پلٹ

○

کہیں غرور، کہیں عجز و انکسار کی بحث
یہ زندگی ہے کہ ہے جبر و اختیار کی بحث

فسانۂ لب و رخسار ہے کہ صبح کی بات
حدیثِ شب ہے کہ اُس زلفِ مشکبار کی بحث

دل و نظر سے کہو کتنے مرحلے ہیں ابھی
ابھی سے بیٹھ گئے لے کے انتظار کی بحث

کسی کو قیمتِ دل کی ابھی خبر ہی نہیں
ابھی نہ چھیڑ محبت کے کاروبار کی بحث

طلوعِ حشر کا ہنگام آ گیا آخر
کہاں پہ ختم ہوئی وعدۂ نگار کی بحث

نہ جانے راہنماؤں کا فیصلہ کیا ہو
ابھی تو راہرووں تک ہے رہگزار کی بحث

ہمارا نام نہ آئے تو نامکمل ہے
حدیثِ طوق و سلاسل ہو یا ہو دار کی بحث

ہے کون رونقِ بزمِ بہار یزدانی
چمن چمن ہے گُل و یاسمن سے خار کی بحث

○

کیا کریں پوچھ کے ہم صبحِ بہاراں کا مزاج
سخت برہم ہے ابھی اہلِ گلستاں کا مزاج

منتِ شانہ کریں ہم کہ صبا سے پوچھیں
کون ہموار کرے زلفِ پریشاں کا مزاج

تم کو معلوم نہیں فتنۂ محشر کیا ہے
تم نے دیکھا ہی نہیں گردشِ دوراں کا مزاج

کل بہانا تھا لہو، آج لہو پیتا ہے
کتنا بے رحم ہے سفاک ہے انساں کا مزاج

ڈھل گئی رات پتنگے بھی ہوئے راکھ کا ڈھیر
کس سے معلوم کریں شمعِ شبستاں کا مزاج

کیا جنوں ہے کہ گلستاں میں بہار آئی ہے
اور ہم پوچھنے نکلے ہیں بیاباں کا مزاج

اس کے اندازِ کرم میں بھی ستم ہے پنہاں
اللہ اللہ کسی زود پشیماں کا مزاج

گردشِ جام کی مہلت تو ملے یزدانی
"ہم بھی پوچھیں گے کبھی گردشِ دوراں کا مزاج"

ہم سے کرتا ہے کیوں گلا کچھ سوچ
تیرا طرزِ عمل ہے کیا کچھ سوچ

گتھیاں عشق کی جنوں سے کھول
کام کیا اس میں عقل کا کچھ سوچ

عقل ہر چند اک بصیرت ہے
عقل سے ہٹ کے بھی ذرا کچھ سوچ

کیوں خوشی لمحہ بھر کی ساتھی ہے
غم ہے کیوں اتنا دیرپا کچھ سوچ

کیوں پریشاں ہوئے ہیں سنبل و گل
کیوں صبا ہے گریز پا کچھ سوچ

دشمنوں کی جفا پہ غور نہ کر
دوست کیوں ہو گئے خفا کچھ سوچ

زندگی جس پہ مر مٹے تھے ہم
کچھ تمنا تھی، کچھ گلا، کچھ سوچ

دل میں اب ظلمتیں ہیں یزدانی
بجھ گیا کون سا دیا، کچھ سوچ

○

روز ہوتا ہے شکوۂ بیداد　　روز بڑھتی ہے قید کی میعاد

زندگی کوہِ بے ستوں گویا　　ہر نفس ایک تیشۂ فرہاد

سخت مشکل تھا ترکِ عشق مگر　　آپ کا حکم ، آپ کا ارشاد

پھر کوئی وعدہ ، کوئی تازہ فریب　　منتظر ہم ہیں اے ستم ایجاد

میری آنکھوں نے کب کیا شکوہ　　میرے ہونٹوں پر آئی کب فریاد

حوصلہ میرے عشق کی تخلیق　　بے رُخی تیرے حُسن کی ایجاد

جل اُٹھی دل میں شمعِ نومیدی　　ہو گیا شہرِ آرزو آباد

اے زمانے ! ترا جواب نہیں　　تجھ سے بڑھ کر نہیں کوئی اُستاد

کوئی نغمہ اُچھال یزدانی

کون سُنتا ہے رُوح کی فریاد

○

کانٹوں کا برگِ گل پہ ہے بارِ گراں ہنوز　　ٹوٹا نہیں طلسمِ بہار و خزاں ہنوز

اُٹھتے نہیں ہیں جانبِ کعبہ میرے قدم　　طاری ہے دل پہ عظمتِ کوئے بُتاں ہنوز

رہنا ہے حادثات کی زد پر ابھی مجھے　　ترتیب پا رہی ہے مری داستاں ہنوز

پیراہنِ وفا کو جلے عمر ہو گئی　　سینے سے اُٹھ رہا ہے وفا کا دھواں ہنوز

جو گردِ رہگزار سے لے درسِ رہبری　　گزرا نہیں نظر سے کوئی کارواں ہنوز

کیا جانیں کب ملے گی ہمیں منزلِ وفا　　حائل قدم قدم پہ ہیں سنگِ گراں ہنوز

آوارہ پھر رہا ہوں میں یزدانیٔ حزیں

آیا نہیں ہے راس کوئی آشیاں ہنوز

○

تیرے بغیر یوں ہے دلِ مضمحل اُداس / جس طرح میکدے میں پڑا ہو تہی گلاس

پھولوں کی وادیوں کی تمنّا تو ہے مگر / کانٹوں کی بستیاں بھی رہیں دل کے آس پاس

شکوہ ہے باغباں سے نہ صیّاد سے گلہ / ہم کو ہوائے صحنِ چمن ہی نہ آئی راس

اُس چشمِ سحر کار کا افسوں نہ پوچھیے / ٹوٹی ہزار بار بندھی لاکھ بار آس

بزمِ نیاز و ناز کے دستور ہیں وہی / اُن کو جفا عزیز تو ہم کو وفا کا پاس

ڈرتا ہوں زندگی سے میں اے مرگِ ناگہاں / تجھ سے ہے کوئی خوف نہ مجھ کو کوئی ہراس

ہم کو سکوتِ اہلِ سخن سے گلہ ہو کیا / ہم لوگ ٹھہرے کشتۂ تحسینِ ناشناس

محشر کی فکر کیا ہمیں یزدانیِ حزیں
یزداں کی رحمتوں پہ گناہوں کی ہے اساس

ابھی سعیِ پرواز ہے آسماں تک / یہ انساں خدا جانے پہنچے کہاں تک

زمانے میں دیر و حرم کے علاوہ / کئی لوگ پہنچے ترے آستاں تک

وہ دل اب ہے اپنے ہی غم سے گریزاں / سمایا تھا جس میں غمِ دو جہاں تک

کہا کیا اسیروں سے موجِ صبا نے / کئی بار نظریں گئیں آشیاں تک

کسی ہم سفر کا نشاں کیا ملے گا / کہ گم ہے غبارِ رہِ کارواں تک

جہاں گردشِ جام کا ذکر آیا / وہیں رک گئی گردشِ آسماں تک

کہاں کوئی خانہ برانداز ہم سا / کہ پھونکا ہے ہم نے غمِ آشیاں تک

روایاتِ اسلاف زندہ ہیں جس سے
وہ محفل ہے یزدانیِ خوش بیاں تک

کر نالۂ تسکیرِ طلب، آہ رسا مانگ / یہ دولتِ بیدار بہ اندازِ دعا مانگ

اپنوں کا گلہ کر نہ تو غیروں کا بُرا مانگ / ہے اِس میں بھلائی کہ زمانے کا بھلا مانگ

اشکوں کی جھڑی مانگ نہ آہوں کی گھٹا مانگ / تو شہرِ محبت میں نئی آب و ہوا مانگ

خود دردِ محبت ہی بنے گا ترا درماں / تو دردِ محبت کی کسی سے نہ دوا مانگ

اِس دور میں ہر سانس جہنم کا ہے شعلہ / اِس دور کے ہر ایک مسیحا سے قضا مانگ

حرف آئے نہ زنہار ترے ظرفِ طلب پر / قسمت میں گدائی ہے تو ہمت سے سوا مانگ

شرمندۂ الفاظ ہو آئینِ وفا کیوں / ممکن ہو تو خاموش نگاہوں سے دعا مانگ

اُفتادِ رہِ شوق میں منزل کا نشاں ہے / چلنا ہے تو ہر گام پہ اک لغزشِ پا مانگ

کر اپنے ہی جلوؤں سے جہاں اپنا منور / مانندِ قمر غیر سے ہرگز نہ ضیا مانگ

ہر وار پہ دے خنجرِ قاتل کو دعائیں / ہر زخم پہ آسودگیِ اہلِ جفا مانگ

اس زُہد سے تیری کبھی تکمیل نہ ہو گی / یزداں سے ذرا حوصلۂ جرم و خطا مانگ

برسوں سے تجھے دیتے ہیں یہ لوگ دعائیں / تو بھی کبھی عافیتِ اربابِ وفا مانگ

اِک دولتِ کونین ہے خاکِ رہِ یثرب
کچھ اور نہ یزدانیِ بے برگ و نوا مانگ

○

شامِ غم ذہن میں ہے یوں رُخِ جاناں کا خیال
جیسے تاریک فضا میں مہِ تاباں کا خیال

شعلۂ حسن کو جاں دے کے ضیا بخش گیا
کتنا پروانے کو تھا شمعِ شبستاں کا خیال

جاگزیں دل میں ہے اب تک جو رگِ جاں بن کر
ایک نشتر تھا ترے خندۂ پنہاں کا خیال

شکوۂ غم پہ ہوئی کتنی ندامت محسوس
آگیا جب بھی تری چشمِ پشیماں کا خیال

ہم نے سینے سے لگایا ہے دل و جاں کی طرح
تیری قسموں، ترے وعدوں، ترے پیماں کا خیال

چشمِ پُرنم نے سجائے سرِ مژگاں تارے
مجھ کو آیا تھا ابھی جشنِ چراغاں کا خیال

میری نظروں کو ترے حسنِ کرم کا احساس
تیری نظروں کو مری تنگیِ داماں کا خیال

زندگی بھر نہ ہوئے دل سے جدا یزدانی
غمِ دنیا کی خلش اور غمِ جاناں کا خیال

○

دامن بچا کے کشمکشِ دو جہاں سے ہم
وابستہ ہو گئے ہیں ترے آستاں سے ہم

اُلجھی ہے مہر و مہ سے ابھی عقلِ نا تمام
آگے نکل گئے ہیں حدِ آسماں سے ہم

اس میں بھی راہبر نہ ہو کوئی چھپا ہوا
چلتے ہیں ہٹ کے گردِ رہِ کارواں سے ہم

اندوہِ قفس کا غم بھی گرانبارِ جاں نہیں
بہلا رہے ہیں دل کو غمِ آشیاں سے ہم

تعمیرِ آشیاں کی بھی حسرت نہیں رہی
جب سے ملے ہیں شعلۂ برقِ تپاں سے ہم

اب دشمنوں کا لطف و کرم ہے مدارِ زیست
مایوس ہیں خلوصِ دلِ دوستاں سے ہم

کتنی شکن جبیں پہ ہے سجدوں کے بوجھ سے
مایوس ہو کے آئے ہیں ہر آستاں سے ہم

یزدانی جب سے دولتِ غم ہے ہمیں نصیب
ہیں بے نیازِ کاوشِ سود و زیاں سے ہم

○

ہم غم کے سلگتے شام و سحر اِس طرح گزارا کرتے ہیں
دل اُن کو پکارا کرتا ہے، ہم دل کو پکارا کرتے ہیں

رودادِ شکستِ دل اپنے ہونٹوں پہ بھی آ ہی جاتی ہے
کچھ دل کا تقاضا ہوتا ہے، کچھ آپ اشارا کرتے ہیں

دنیائے تصور میں ہمدم تخییل کے دلکش رنگوں سے
آئینۂ دل میں ہم اُن کی تصویر اُتارا کرتے ہیں

اِس ڈر سے کہ وہ بدنام نہ ہوں حرف آئے نہ اُن کے جلووں پر
ہم اپنی نظر سے چھپ چھپ کر تکمیلِ نظارا کرتے ہیں

اب ظرفِ محبت کہئے اِسے یا پاسِ وفا کی مجبوری
ہر زخم پہ ہم ہنس دیتے ہیں، ہر زہر گوارا کرتے ہیں

آغازِ بہاراں میں جن کی انجامِ بہاراں پر ہو نظر
کانٹوں کی محبت میں اکثر پھولوں سے کنارا کرتے ہیں

کچھ لوگ اُلجھ کر موجوں سے دستورِ حیات اپنا بھی گئے
"کچھ لوگ ابھی تک ساحل سے طوفاں کا نظارا کرتے ہیں"

اے جلوۂ جاناں جس دن سے تمیزِ من و تو ختم ہوئی
ہم تیرے نظارے میں اکثر اپنا ہی نظارا کرتے ہیں

کیا جانئے کب وہ یزدانی! آ جائیں یہاں مہماں بن کر
اِس آس میں ہم کاشانۂ دل ہر روز سنوارا کرتے ہیں

○

شامِ وعدہ کے مقدر میں سحر ہو کہ نہ ہو
مبتدا ہے تو سہی اس کی خبر ہو کہ نہ ہو

اُن کو حالِ دلِ مضطر کی خبر ہو کہ نہ ہو
ہم کو فریاد سے مطلب ہے اثر ہو کہ نہ ہو

زخم کو پھول سمجھ کر ہی گزارا کر لیں
دل کے صحرا میں بہاروں کا گزر ہو کہ نہ ہو

عشق بدنام ہو کیوں حرفِ تمنّا کہہ کر
اُن کو معلوم ہے، دنیا کو خبر ہو کہ نہ ہو

شرطِ منزل ہے غبارِ رہِ منزل ہونا
راہبر ہو کہ نہ ہو، رختِ سفر ہو کہ نہ ہو

نہ دھواں ہے، نہ شرارہ ہے، نہ شعلہ کوئی
دل کے جل بجھنے کی اُن کو بھی خبر ہو کہ نہ ہو

ترک ہو سکتا ہے کب کوئے نگاراں کا طواف
دیر و کعبہ کی طرف اپنا گزر ہو کہ نہ ہو

منظرِ قتل گہہ اہلِ وفا دیکھ تو لو
جانے یہ حشر بپا بارِ دگر ہو کہ نہ ہو

اِک ذرا جھانک تو لیں چاند ستاروں سے پرے
جلوہ فرما وہ پسِ پردۂ در ہو کہ نہ ہو

اُن کی نظروں سے ہے کیا بات نہاں یزدانی
ترجمانِ غمِ دل دیدۂ تر ہو کہ نہ ہو

○

مجھ سے تُو نظر ملا میری طرف کبھی نہ دیکھ
صورتِ اجنبی ہوں میں، صورتِ اجنبی نہ دیکھ

غیرتِ عشق پر ہے بار، شرکتِ یک نگاہ بھی
غیر کی سمت دیکھ کر تُو مری سمت ہی نہ دیکھ

دیکھ رُخِ جمیل پر گردِ ملال چھا نہ جائے
تُو مرے غم کو بھول جا، تُو مری بے کلی نہ دیکھ

ساقیٔ میکدہ نظر! شانِ کرم تو ہے یہی
ظرفِ طلب پہ کر نگاہ اور مری تشنگی نہ دیکھ

جور و ستم کی بجلیاں مجھ پہ برس تو لیں ذرا
اے مرے غمگسار دوست! حالتِ دل ابھی نہ دیکھ

مانے جو میرا مشورہ ظلمتِ دل میں ڈوب جا
یاد نہ کوئی جاگ اٹھے، تاروں کی روشنی نہ دیکھ

نقش و نگار پر نہ جا، ان کے فریب میں نہ آ
سیرتِ آدمی کو ڈھونڈ، صورتِ آدمی نہ دیکھ

کھو کے رہِ حیات میں ملتا ہے حاصلِ سفر
عظمتِ گمرہی سمجھ، شوکتِ رہبری نہ دیکھ

بزمِ وفا میں ناروا، دشمن و دوست کی تمیز
غیر کی دشمنی نہ دیکھ، دوست کی دوستی نہ دیکھ

دیر و حرم کا ذکر چھوڑ، اُس کی گلی کا کر طواف
مشربِ عشق ہے یہی سجدہ و بندگی نہ دیکھ

آئینہ گر کا حُسن ہے صورتِ آئینہ عیاں
اپنے ہی دل پہ غور کر اور کہیں کبھی نہ دیکھ

آنکھ اگر ہے بُت پرست، دل ہے اگر صنم کدہ
ترک نہ کر خیالِ دیر، سوئے حرم ابھی نہ دیکھ

تیری نگاہ اک حجاب، تیرا وجود اک نقاب
یہ نہ اُٹھا سکے اگر، اُن کی طرف کبھی نہ دیکھ

○

○

کیوں ہے گھٹی گھٹی سی فضا، سوچنا پڑا
کیا ہے خیالِ موجِ ہوا، سوچنا پڑا

ہم کر چکے تھے ترکِ تعلق کا فیصلہ
جب دل نے مشورہ نہ دیا، سوچنا پڑا

ہم خاک بھی ہوئے ہیں تو وہ مطمئن نہیں
کیا اور دیں ثبوتِ وفا، سوچنا پڑا

یہ سوزِ قلب و روح، یہ طوفانِ اضطراب
کس جرم کی ملی ہے سزا، سوچنا پڑا

غنچے خموش، پھول پریشاں، چمن اُداس
کیا کہہ گئی ہے موجِ صبا، سوچنا پڑا

کیا اِتنے بدنصیب تھے زخمِ دل و جگر
کیوں ہو گیا ہے تیر خطا، سوچنا پڑا

روشن کیے چراغِ تمنا چلے جو ہم
تھی تیز راستے کی ہوا، سوچنا پڑا

اُس کی نظر میں ہم نہیں یزدانی حزیں
کس کس پہ مہرباں ہے خدا، سوچنا پڑا

○

اُنھیں آئینے سے دست و گریباں کون دیکھے گا
غرورِ حُسن کو حیرت بداماں کون دیکھے گا

محبت عشق کے دل پر جلا دیتی رہے لیکن
اِس آئینے میں اپنا عکس حیراں کون دیکھے گا

یہ پردہ اک تکلف ہے تکلف درمیاں کیسا
کسے ہے تابِ جلوہ، روئے تاباں کون دیکھے گا

خیالِ جیب و داماں ہے جنوں کی خام کرداری
جنوں پختہ ہوا تو جیب و داماں کون دیکھے گا

شبِ غم چشمِ تر ا روشن نہ کر شمعیں محبت کی
سوائے مرگ یہ جشنِ چراغاں کون دیکھے گا

ہمیں اے ناخدا گرداب میں جینے کی عادت ہے
کنارے سے بھلا انجامِ طوفاں کون دیکھے گا

بہاروں میں تو بلبل نغمہ خواں ہیں شاخساروں پر
خزاں آئی تو اندازِ گلستاں کون دیکھے گا

کسی کے ظلم کا شکوہ، اُسی سے، بھرے محفل
حسیں آنکھوں کو یزدانی پشیماں کون دیکھے گا

○

سلسلہ دل کا عجیب ہے یارو
ہر خوشی غم کا سبب ہے یارو

عرضِ مطلب سے گریزاں رہنا
یہ بھی اک حسنِ طلب ہے یارو

بات اظہار کی محتاج نہیں
بات کرنے کا بھی ڈھب ہے یارو

آنسوؤں سے ہے چراغاں ہر آنکھ
خوب یہ جشنِ طرب ہے یارو

دل کے عالم پہ پڑی ہے ندت سے
زندگی نوحہ بہ لب ہے یارو

دیکھ لیں بھول کے ہم اپنی طرف
اتنی فرصت ہمیں کب ہے یارو

وہ پلائیں ہمیں بے جام و سبو
لطف پینے کا تو جب ہے یارو

عشق میں کس لیے یزدانی پر
تہمتِ نام و نسب ہے یارو

○

لالہ و گل ہی نہیں چاک قبا، اور بھی ہے
اس گلستاں میں کوئی تلخ نوا اور بھی ہے

رسن و دار کے اعزاز پہ موقوف نہیں
امتحانِ غمِ دل اس کے سوا اور بھی ہے

غرق ساحل پہ ہوئی اتنی خطا پر کشتی
ناخدا سے یہ کہا تھا کہ خدا اور بھی ہے

ہم سفر بھول گئے ہیں سرِ منزل آ کر
دشتِ غربت میں کوئی آبلہ پا اور بھی ہے

دامنِ شوق میں کانٹوں کے سوا کچھ بھی نہیں
کیا کوئی جرمِ محبت کی سزا اور بھی ہے

بے نیازی سے تری پوچھتے ہیں ہم بے نیاز
ہم سا اک پیکرِ تسلیم و رضا اور بھی ہے

توڑ کر دیکھ ذرا نغمہ و نکہت کا طلسم
لالہ و گل میں کوئی جلوہ نما اور بھی ہے

دل کی دھڑکن میں یہ محسوس ہوا یزدانی
سازِ ہستی پہ کوئی نغمہ سرا اور بھی ہے

○

حدِ یقیں میں نہیں ہے حدِ گماں میں نہیں
بہار آئے گی لیکن مرے جہاں میں نہیں

ہمیں سے رنگِ گلستاں ہمیں سے رنگِ بہار
ہمیں کو اذنِ نوا صحنِ گلستاں میں نہیں

مرے ہی ذکر سے ہے جن کی داستاں دلکش
مرا ہی ذکر کہیں اُن کی داستاں میں نہیں

میں اُس پہ اپنا نشیمن بنا نہیں سکتا
جو شاخِ گل نگہِ برقِ بے اماں میں نہیں

یہ ضبطِ غم کی ہے اللہ! کون سی منزل
کہ ایک اشک بھی اب چشمِ خونفشاں میں نہیں

شرارِ عشق سے ہے ربطِ جسم و جاں قائم
بجھی یہ آگ تو پھر ربطِ جسم و جاں میں نہیں

فسانۂ لب و رخسار کوئی کیا چھیڑے
کوئی بھی اہلِ نظر شہرِ مہ رخاں میں نہیں

جو اُن کی چشمِ سیہ مست میں ہے یزدانی
سرور و کیف وہ صہبائے ارغواں میں نہیں

○

اُس زلف سے گھٹا بھی ضیا مانگتی پھرے
خوشبو کی بھیک موجِ صبا مانگتی پھرے

برپا صنم کدوں میں ہو اک ایسا انقلاب
پتھر کی مورتی بھی خدا مانگتی پھرے

اے طرفگیِ عشق دکھا ایسا رنگ بھی
اُس کی نگاہ مجھ سے جفا مانگتی پھرے

اتنا تو پُرکشش ہو یہ زندانِ کائنات
بے جرم زندگی بھی سزا مانگتی پھرے

تم ہی کہو کہ اُڑتی ہوئی آرزو کی دھول
کس سے سراغِ اہلِ وفا مانگتی پھرے

نیرنگیِ فلک ہے کہ بیمارِ زندگی
زہرابِ غم سے آبِ بقا مانگتی پھرے

ناکام اُن کے در سے پلٹ کر مری نگاہ
کس سے قبولیت کی دعا مانگتی پھرے

یزدانیِ حزیں یہ مقدر کی بات ہے
جینے کی آرزو بھی قضا مانگتی پھرے

○
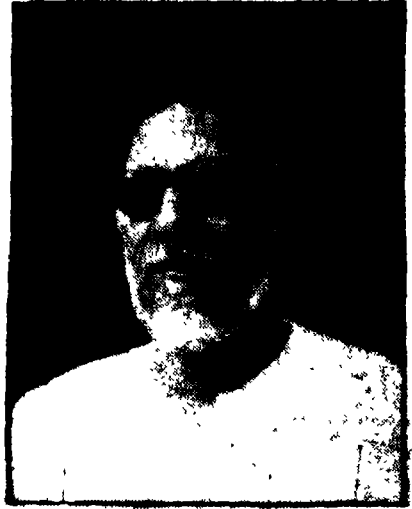
پروفیسر منظور احسن عباسی

منظور احسن تاریخی نام ہے جس سے سنہ ولادت ۱۳۱۵ھ برآمد ہوتا ہے۔ تاریخ ولادت ۴ فروری ۱۸۹۸ء ہے اور عباسی لقب ہے۔ ولادت مضافاتِ الٰہ آباد (ہند) کے ایک قصبہ "کرالی" میں ہوئی جہاں ان کی والدہ مرحومہ کا ایک باغ تھا اور جس میں اب تک مرحومہ کی قبر موجود ہے۔

ابتدائی تعلیم اپنے والد مولوی محمد بخش مرحوم و مغفور سے پائی جو ابتداً گورنمنٹ ہائی سکول مرزا پور (یو۔ پی) میں السنۂ شرقیہ کے مدرس تھے اور بعد میں پروفیسر ہو گئے۔ اس کے علاوہ دینی مدارس۔ مدرسہ حسین بخش و مدرسہ امینیہ دہلی میں تعلیم حاصل کی۔ اردو، فارسی، عربی اور انگریزی کی تعلیم بطور خود حاصل کر کے پنجاب یونیورسٹی کے امتحانات پاس کئے۔ یہ تمام مدت تقریباً دہلی میں بسر ہوئی اس لئے دہلوی کہلانے اور اپنے اہلِ زبان ہونے پر بجا طور پر فخر کرتے ہیں۔

اعلیٰ تعلیمی مدارج طے کرنے کے بعد سابقہ پنجاب کی ریاست جیند کے صدر مقام سنگرور میں سرکاری ہائی سکول میں السنۂ شرقیہ کے صدر مدرس مامور ہوئے اور جب وہ ہائی سکول سے کالج بن گیا تو اُس میں لیکچرار مقرر ہوئے۔ یہ سلسلہ ۱۹۴۷ء تک تیس برس کے قریب جاری رہا۔

قیامِ پاکستان پر ۱۹۴۷ء میں لاہور آنا پڑا اور اُس وقت سے اب تک یہیں مقیم ہیں۔ لاہور آ کر یکے بعد دیگرے کئی ملازمتیں کیں۔ پبلسٹی آفیسر، ریفیوجی سنس آفیسر، اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ ویمن ہوم (جہلم) اور آزاد کشمیر کے محکمہ سول سپلائی میں بطور سول سپلائی آفیسر مامور رہے۔ محکمہ آبادکاری میں بھی اسسٹنٹ کے طور پر کام کیا۔ پھر کچھ عرصہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں ترجمہ و ترمیم کی خدمات انجام دیں اور

آج کل پنجاب پبلک لائبریری میں عربی و فارسی مخطوطات کی تفتیشی و تفصیلی فہرستوں کی تیاری و ترتیب پر بطور جز وقتی کارکن متعین ہیں ۔

شعر و سخن سے لگاؤ عطیۂ فطرت ہے ۔ اردو میں سب سے پہلے چند اشعار کی غزل ۹ سال کی عمر میں ایک مشاعرہ میں پڑھی ۔ فارسی زبان میں سب سے پہلی نظم صنعتِ توشیح میں گیارہ برس کی عمر میں کہی اور عمر کے چودھویں سال میں فارسی کے چند قطعات کہے جو اُس وقت کے شائع ہونے والے ایک رسالہ افتتاح الحق (تالیف: لالا فتح اللہ عباسی) میں شائع ہوئے ۔ اُن ہی دنوں حفظِ قرآن کی طرف بھی راغب ہوئے لیکن اس کی تکمیل نہ کر سکے ۔

۱۶ سال کی عمر میں رسالہ "مشغلہ" دہلی کے مدیر مقرر ہوئے اور ۱۸ سال کی عمر میں خان صاحب مولوی سید احمد دہلوی مرحوم کے ساتھ اردو کی مشہور لغات "فرہنگِ آصفیہ" کی ترمیم کا کام انجام دیا ۔ مولوی صاحب مرحوم کو اپنے دارالتصنیف میں سب سے زیادہ اعتماد آپ ہی کی ذات پر تھا ۔

آپ کی تالیفات کی فہرست کافی طویل ہے ۔ علوم قرآنی پر ایک کتاب جو کم و بیش ایک ہزار صفحات پر مشتمل کئی جلدوں میں شائع ہوئی ، تالیف کی تھی ۔ افسوس کہ اس کا مسودہ نذرِ فسادات ہو گیا ۔ اس کے علاوہ چند رسالے سکاؤٹنگ پر اور صراطِ مستقیم ، حق سترہ ، شرح معارج اور معارج الاوراد چار رسالے سکھوں کی مذہبی کتب کے تراجم و تشریح پر تالیف کئے جو بہت مقبول ہوئے ۔ لیکن اِن دنوں تقریباً ناپید ہیں ۔

پنجاب پبلک لائبریری نے اِن کی مندرجہ ذیل تالیفات شائع کی ہیں ۔

۱ ۔ تفصیل فہرستِ مخطوطات عربیہ مع ضمیمہ ۔	(۶۴۳ صفحات)
۲ ۔ تفصیل فہرست مخطوطات فارسیہ ۔	(۵۶۰ صفحات)
۳ ۔ تفصیل فہرست مخطوطات متفرقہ اردو ، ہندی ، پنجابی وغیرہ ۔	(۱۰۶ صفحات)

اِن کے علاوہ ضمیمہ فہرست مخطوطات فارسیہ جو قریب قریب اڑھائی صد صفحات پر مشتمل ہوگا زیر طبع ہے ۔ دیوانِ غالب اُردو کی ایک شرح بھی مکمل کر چکے ہیں جس کی اشاعت کا اہتمام کیا جا رہا ہے اِن کے کلام کا ایک مجموعہ ان کی بڑی صاحبزادی نے اپنی ایک بیاض میں جمع کیا تھا لیکن وہ بھی ۱۹۴۷ء کے فسادات کی نذر ہو گیا ۔ اُس میں بیشتر منظومات ، اردو غزلیات اور متعدد مدحیہ قصائد اور تقریبی نظمیں تھیں ۔ اگرچہ انہیں اس اتلاف کا قطعی افسوس نہیں لیکن فی الحقیقت اسے ادب کا ایک ناقابلِ تلافی نقصان کہا جا سکتا ہے ۔ شعر و ادب سے فطری لگاؤ اور روانیٔ طبع کے باعث ۱۹۴۷ء کے بعد کا کلام بھی اتنا ہے کہ جمع کیا

جلئے تو اردو اور فارسی کے دو الگ الگ دیوان مرتب ہو سکتے ہیں۔ لیکن کسرِ نفسی کا یہ عالم ہے کہ اکثر فرمایا کرتے ہیں" شعری اصطلاحات میں "آمد" جیسی کوئی چیز اگر ہے تو اُس کو میرے ذہن سے کوئی نسبت نہیں۔ فارسی سے میری طبیعت کو ایک گونہ لگاؤ ضرور ہے۔ لیکن شعر اردو کا ہو یا فارسی کا، میں جو کچھ کہتا ہوں وہ تمام کا تمام محض "آورد" ہوتا ہے "۔

دراصل جسے وہ "آورد" قرار دیتے ہیں، وہ اُن کا صحتِ زبان کا احساس ہے۔ جو کچھ کہتے ہیں خوب سوچ سمجھ کر کہتے ہیں اور زبان کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ بچپن سے عنفوانِ شباب تک دہلی میں رہے ہیں اور اس نسبت سے دہلوی کہلاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ―

"فنی غلطیوں کے بھوت سے میرا ذہن کچھ اس قدر خائف ہے کہ بے تکلف بات نہیں کرنے دیتا"۔

اور اس احساس ہی کی بدولت اُن کا کلام فنی عیوب سے پاک اور بلند و پاکیزہ احساسات و جذبات کا ترجمان ہوتا ہے۔

○

○

وہ عہدِ وفا جو باندھا تھا اُس عہد کو پورا کر نہ سکا
میں یاد میں تیری جی نہ سکا میں راہ میں تیری مر نہ سکا

تم مالکِ جانؔ و دل ٹھہرے سب کرتا دھرتا آپ ہوئے
اب مجھ سے شکایت کیا کرنی "کچھ کر نہ سکا کچھ دھر نہ سکا"

سب صبر و سکوں کی تدبیریں بیکار ہوئیں ناکام رہیں
کم دردِ دلِ محزوں نہ ہوا، نمِ قطرۂ چشم تر نہ سکا

انجامِ محبت ظاہر تھا، دیوانگیٔ دل کیا کہیے؟
ہر چند بچایا بچ نہ سکا ہر چند ڈرایا ڈر نہ سکا

بادل بھی اُٹھے بارش بھی ہوئی نالے بھی بہے دریا بھی چڑھا
میں خود جو تہی اندیشہ رہا شبنم سے پیالہ بھر نہ سکا

بے خود تو سبھی ہیں جلووں سے یہ ہوش میں آ ہی جائیں گے
لو احسنِ شوریدہ کی خبر سجدے سے اٹھا جو سر نہ سکا

○

تمنّا پل رہی ہے جب جواں ہو گی تو کیا ہو گا
یہ اتنی سی حقیقت داستاں ہو گی تو کیا ہو گا

نہیں معلوم کتنے چھانتے پھرتے ہیں خاک اُس کی
زمینِ کوئے جاناں آسماں ہو گی تو کیا ہو گا

پڑی ہیں سر بزانوئے تفکر سوچ میں کلیاں
کہ پہلے کی طرح پھر بھی خزاں ہو گی تو کیا ہو گا

خطا کرتی نہیں اب بھی نگاہِ شرمگیں اس کی
الٰہی وہ نظر برقِ تپاں ہو گی تو کیا ہو گا

مِرے دل کی لگی یارب کہیں اُس کو نہ لگ جائے
یہی حالت نصیبِ دشمناں ہو گی تو کیا ہو گا

یہ مانا ضبطِ گریہ تم نے سیکھا ہے مگر احسن
اگر وہ مسکراہٹ امتحاں ہو گی تو کیا ہو گا

○

○

جس نے دیکھی نہیں اُس تیرِ نظر کی صورت
اُس کو معلوم ہو کیا زخمِ جگر کی صورت

شب کو یاد آئے گر اُس رشکِ قمر کی صورت
پھر نہ آئے گی نظر نورِ سحر کی صورت

تم اسے ترکِ مناجات کہو یا رہِ عشق
ہے یہی اک غمِ دنیا سے مفر کی صورت

جس کو سینے سے لگایا تھا تمنا کی طرح
وہی پہلو سے اٹھا دردِ جگر کی صورت

خانہ ویرانیٔ دل ہو کششِ طوفانِ سرشک
"اب وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت"

گُل کھلائیں گے ترے جور و جفا کے انداز
رنگ لائے گی مرے دیدۂ تر کی صورت

دیکھ کر جورِ بتاں کہتا ہوں اللہ اللہ
کس نے پتھر سے بنائی ہے بشر کی صورت

ہائے وہ حال کہ جب درد ہی درماں ہو جائے
نہ کوئی شکل دعا کی نہ اثر کی صورت

○

تم کیا گئے کہ رنگِ بہاراں گیا پلٹ
یہ کیا ہُوا نظامِ گلستاں گیا پلٹ

دُہرا رہا ہوں وادیٔ سینا کی داستاں
یعنی نقابِ چہرۂ جاناں گیا پلٹ

برباد ہو نہ جائے کہیں آبروئے دل
آنکھوں تک آ کے اشکِ گریزاں گیا پلٹ

دل کا یہ تذکرہ ہے تمہارا گلہ نہیں
مجھ سے جو کر کے وعدہ و پیماں گیا پلٹ

بڑھ کر نہ جب وہ دامنِ لیلیٰ پکڑ سکا
مجنوں کا ہاتھ سوئے گریباں گیا پلٹ

رُخ اس کے موڑتے ہی اندھیرا سا چھا گیا
گویا افق سے مہرِ درخشاں گیا پلٹ

جب دیکھا اُس کو شانِ خدا آ گئی نظر
ہر بار ایک صفحۂ قرآں گیا پلٹ

اب احسنؔ اُس کے سامنے سر پھوڑیں کیا کریں
جب اپنے وعدے سے کوئی انساں گیا پلٹ

○

○

دل پر چکا ہے فیصلہ اک مہرباں سے آج
حاصل ہوئی نجات غمِ دو جہاں سے آج

سر پھوڑنا ہے مجھ کو ترے آستاں سے آج
یعنی کہ ٹھن گئی ہے مری آسماں سے آج

یارب تو خیر رکھیو مرے آشیانے کی
صیاد مل رہا تھا گلے، باغباں سے آج

ہم بھی سُنیں گے واعظِ شیریں بیاں کی بات
فرصت ملی جو خدمتِ پیرِ مغاں سے آج

انجامِ یاس، مہلتِ دو روزہ عیشِ زیست
وہ مجھ پر آ رہے ہیں نظر مہرباں سے آج

رحمت نے چن لیے ہیں مرے قطرہ ہائے اشک
ہوں بہرہ مند اپنی متاعِ زیاں سے آج

لغزش بپا و لرزہ براندام و بے خبر
آپ آ رہے ہیں حضرتِ احسن کہاں سے آج

○

تم نے پوچھا جو مریضِ غمِ ہجراں کا مزاج
ہو گیا عرش پہ ہر طالبِ درماں کا مزاج

جھک کے ملتے ہیں نسیمِ سحری ہو کہ سموم
ہے ملنسار جوانانِ گلستاں کا مزاج

توڑ دیتی ہے اسے جنبشِ چشمِ ساقی
اُس کے پیمانے سے نازک مرے پیماں کا مزاج

حسنِ بت میں نظر آتی نہیں گر شانِ خدا
کافرانہ ہے ابھی صاحبِ ایماں کا مزاج

آشیانے کی خبر لے کے نہ آتی نہ سہی
خوش تو ہے بادِ بہاری! چمنستاں کا مزاج

تھا جہاں وعظ میں کل تذکرۂ حور و قصور
پا گئے ہم بھی وہیں صاحبِ عرفاں کا مزاج

بجھ گئی شمعِ شبستانِ زلیخا، شاید
ہوا زنداں میں برہم مہِ کنعاں کا مزاج

احسن ایسے بتِ کافر سے وفا کی اُمید
جس نے جانا ہی نہیں تجھ سے مسلماں کا مزاج

○

○

اے مری جانِ مدعا ! کچھ سوچ — کون میرا ترے سوا ! کچھ سوچ

دیکھ ! کیا ہو گیا مجھے کچھ دیکھ ! — سوچ ! اِس درد کی دوا کچھ سوچ

ہو گئی کیوں بلائے جاں اُلفت ! — راحتِ جانِ مبتلا ! کچھ سوچ

جس کو اپنی خبر نہیں اے دوست — وہ کرے غیر کا گِلا ! کچھ سوچ

محوِ آرائشِ خمِ گیسو ! — کب تک آخر یہ سلسلہ ! کچھ سوچ

راحتِ زندگی کے متوالے ! — "مقصدِ زندگی ہے کیا ! کچھ سوچ"

جان تو یوں بھی جائے گی ناداں ! — جان دینے کا مدعا کچھ سوچ

تو اور اِک سنگدل بتِ کافر

احسنؔ اے بندۂ خدا ! کچھ سوچ

○

سیدھا نہ تھا جو یار کے تیرِ نظر کا رُخ — کوئی نہ پا سکا مرے زخمِ جگر کا رُخ

واحسرتا ہُوا ہے جدھر وا درِ قفس — ہے آشیانِ طائرِ بے بال و پر کا رُخ

نازاں ہیں تم پر ایسے تمہارے نیازمند — جیسے بدل ہی دو گے قضا و قدر کا رُخ

ہو کاروانِ ملّتِ بیضا کی خیریت — منزل جدھر نہیں ہے اُدھر راہبر کا رُخ

ملنے دیا نہ غیرتِ اغیار نے مجھے — تھا اس کی رہگزر میں رقیبوں کے گھر کا رُخ

اہلِ کرم کو خوئے تواضع پسند ہے — سوئے زمیں ہے شاخچۂ بارور کا رُخ

شیخِ حرم ہیں محوِ خیالِ قصور و حور — کرتے نہیں ہیں قبلہ و کعبہ جو گھر کا رُخ

احسنؔ ہے تیرا دردِ علاجِ قصورِ فہم

ہے چارہ گر کی سمت دوا کے اثر کا رُخ

○

یاد آئی ہے انہیں کوئی جفا میرے بعد ۔۔۔ پوچھتے پھرتے ہیں وہ میرا پتا میرے بعد

اُن کو اب ہونے لگی قدرِ وفا میرے بعد ۔۔۔ یہ ستم جو نہ ہوا تھا وہ ہوا میرے بعد

خوئے غم، رسمِ وفا، شیوۂ تسلیم و رضا ۔۔۔ روئیں کس کس کے لئے اہلِ عزا میرے بعد

سخت جانی سے مری کھایا ہے کس کس نے فریب ۔۔۔ مجھ کو لینے کے لئے آئی قضا میرے بعد

دیکھئے کس کو ہو یارائے ستم کوشئ ناز ۔۔۔ کون کرتا ہے تقاضائے جفا میرے بعد

رشک حسرت پہ ہے اپنی کہ نہ نکلی دمِ مرگ ۔۔۔ رہ گئی در پہ ترے ناصیہ سا میرے بعد

غمزہ و شوخی و انداز و خود آرائی و ناز ۔۔۔ کیا رہا حسنِ مجرّد کے سوا میرے بعد

میں نے کیوں پوچھا کہ ہو گی کبھی اس غم سے نجات ۔۔۔ ہائے اُس شوخ نے کس طرح کہا "میرے بعد"

کوئی لیتا نہیں اب نامِ وفا بھی احسن

کیا ہی بدلی ہے زمانہ کی فضا میرے بعد

اے وادیِ طور ارنی تابِ نظر ڈھونڈ
بے تابِ تجلّی ہے تو پتھر کا جگر ڈھونڈ

سب ڈھل گئے آنسو مرے آنے سے کسی کے
ڈوبے ہوئے تاروں کو نہ ہنگامِ سحر ڈھونڈ

لے پارۂ دل، خونِ جگر، سینۂ بریاں
اے قافلۂ اشکِ الم زادِ سفر ڈھونڈ

اے جانِ جہاں اے فلکِ حسن کے سیّار
ہو جلوہ نما رہگذرِ شمس و قمر ڈھونڈ

ہر چند وسیلۂ بختیٔ تدبیر ہے لیکن
بے تخمِ شجر مانگ نہ بے شاخ ثمر ڈھونڈ

دنیا کا ہر اِک عیش غم آلود ہے احسن
بے زخمہ نہ آہنگ نہ بے آہ اثر ڈھونڈ

شربِ مدام چاہیے، مشربِ عام سے گزر
آنکھوں سے پی مئے جمال بادہ و جام سے گزر

ساقی سبو بدوش ہے اوک سے تو بھی کام لے
پینے کا شوق ہے اگر شیشہ و جام سے گزر

مسلمِ نوجواں ترا غازۂ رُخ ہے خاک و خوں
تیغِ برہنہ بن کے چل عیشِ نیام سے گزر

تیری غذا ہے اضطراب سعیٔ عمل حیات ہے
لائے جو عیشِ خواب و خور ایسے مقام سے گزر

شیخِ حرم کی بات سن ترکِ بیانِ دیر کر
قاصد و نامہ و پیام بلکہ سلام سے گزر

چشم براہ جلوہ ہر ذرّہ ہے تیری راہ کا
صورتِ مہر کر طلوع منظرِ عام سے گزر

فکرِ مآلِ کار کر عیشِ جہاں کا غم نہ کھا
مالِ حلال کر طلب رزقِ حرام سے گزر

اہلِ سخن کی بزم میں احسنِ بے ہنر کی بات
جرأتِ گفتگو تو دیکھ حسنِ کلام سے گزر

عشق نے جان لیا سوزِ نہاں کا انداز
درد نے سیکھ لیا ضبطِ فغاں کا انداز

درخورِ لطف عدو، دوست سزاوارِ عتاب
ہم نے دیکھا یہی اُس جانِ جہاں کا انداز

ہوتے ہیں زخم ہرے آہِ شرربار کے ساتھ
ہے مری فصلِ بہاراں میں خزاں کا انداز

ہر خذف ریزۂ میخانہ ہے جامِ جمشید
ذرۂ خاک سے پیدا ہے جہاں کا انداز

ہے گوارا ہمیں سب دردِ محبت کی قسم
نخوتِ شیخِ حرم، پیرِ مغاں کا انداز

لطفِ ساقیِ خرابات بھی ہے وقت کی بات
دورِ پیمانہ سا ہے دورِ زماں کا انداز

مجھ کو ڈر ہے کہ نہ ہو باعثِ رسوائیِ دوست
پرسشِ عاشقِ بے نام و نشاں کا انداز

کون کافر کرے تحسینِ کلامِ احسن
اُس کے اشعار میں ہے حُسنِ بتاں کا انداز

ل کے سودے میں کہاں سود و زیاں کا احساس
اس میں کیا سود و زیاں اس میں کہاں کا احساس

مدگی ہونے لگی کثرتِ آمال سے تنگ
عمر کے ساتھ بڑھا بارِ گراں کا احساس

ل میں رہتے تو ہو لیکن مجھے ڈر ہے کہ کہیں
دشمنوں کو ہو مرے دردِ نہاں کا احساس

ی باتیں ہیں جو کرنے نہیں دیتیں توبہ
حرمتِ جام و سبو - پیرِ مغاں کا احساس

ر ڈالے نہ کہیں قتل سے پہلے مجھ کو
آپ کی زحمتِ شمشیر و سناں کا احساس

عدوں پر جس کے ہُوا قصرِ تمنا تعمیر
ہے اسے پاس زباں کا نہ زیاں کا احساس

تی جاتی ہے متاعِ غمِ الفت برباد
آپ کو ہو کہ نہ ہو آہ و فغاں کا احساس

تم جو کرنے لگے تحسینِ کلامِ احسن
اُس کو بھی ہونے لگا حسنِ بیاں کا احساس

○

جان دے دی آستانِ یارِ رنگیں دل کے پاس — کوئی کشتی ڈوب جائے جس طرح ساحل کے پاس

اے جنوں آوارۂ صحرا ذرا آنکھیں تو کھول — تیری لیلیٰ منتظر ہے پردۂ محمل کے پاس

ہر قدم پر ہو رہا ہوں میں غمِ دنیا سے دور — شاید آتا جا رہا ہوں اب تمہارے دل کے پاس

خیرگیٔ چشم لایا تیرے جلوؤں کا ہجوم — وائے ناکامی کہ ہوں گم کردہ رہ منزل کے پاس

آنکھ کی پتلی ہے سرِّ نظارۂ حسنِ ازل — قوتِ تسخیرِ کہساراں اگر ہو تل کے پاس

زندگی ہے اُس کے ہاتھوں میں بگاڑے یا بنائے
دُور ہے احسن مگر تقدیر ہے قاتل کے پاس

○

طوفانِ یاس میں غمِ جاناں کی احتیاط — آندھی میں جیسے شمعِ فروزاں کی احتیاط

ہو زخمِ نازِ دوست نہ کیوں جان سے عزیز — پیشِ نظر ہے دولتِ ایماں کی احتیاط

وارفتگیٔ شوق میں پاسِ حیا و ننگ — جوشِ جنوں میں چاکِ گریباں کی احتیاط

بے سوزِ عشق کم نہ ہوئی تیرگیٔ زیست — لازم ہے اس چراغِ فروزاں کی احتیاط

عیار کس قدر ہیں وہ نظریں کہ الاماں — لو ہم تو کر چکے دلِ ناداں کی احتیاط

بادِ ہوس نے چاک کیا پردۂ حیا — جامہ نہ کر سکا تنِ عریاں کی احتیاط

احسن مزاجِ غنچہ و زخمِ جگر ہے ایک
رکھنا ہوا سے فصلِ بہاراں کی احتیاط

○

○

الفت میں کیا کرے کوئی انجام کا لحاظ　　انجامِ ناگزیر میں کس کام کا لحاظ
آجائے جس کے ہاتھ میں قسمت سے دورِ جام　　کرتا ہے کب وہ گردشِ ایام کا لحاظ
دل میں بتوں کی یاد ہے لب پر خدا کا نام　　کرنا پڑا ہے کفر میں اسلام کا لحاظ
پھرتا ہے جلوۂ رخ و گیسو نگاہ میں　　کچھ صبح کا خیال نہ ہے شام کا لحاظ
اب کیسے میری تشنگیِ بیکراں ہو دور　　ساقی نے بھی کیا نہ میرے جام کا لحاظ
طوفانِ گریہ تھم کہ ہے دل پائیگاہِ دوست　　لازم ہے اس مکاں کے در و بام کا لحاظ
توہینِ جذبہ و اثرِ عشق تا کجا　　کب تک رسومِ نامہ و پیغام کا لحاظ
احسن کو خود بھی تلخیِ مے کا ہے اعتراف
لے ڈوبا اُس کو ساقیِ گلفام کا لحاظ

○

کس کا جلا جلا کے دل کس نے کیا ہے داغ داغ　　کس کے لہو سے جا بجا کس کی قبا ہے داغ داغ
طعنۂ دوستاں سے گر قلب و جگر ہے پاش پاش　　سوزِ غمِ فراق سے سینہ ہوا ہے داغ داغ
سوختہ جانِ آرزو، وادیِ شوق خار خار　　منزلِ عشق خاک و خون راہِ وفا ہے داغ داغ
اہلِ نظر ہیں فیض یاب عشق کی بارگاہ سے　　قلب ملا جلا بجھا سینہ ملا ہے داغ داغ
میں نے کہا کہ آپ تو چودھویں رات کے ہیں چاند　　بولے مگر یہ چاند کے چہرے پہ کیا ہے داغ داغ
سوزشِ درد کے بغیر دل نہیں سنگ و خشت ہے　　دل کی اگر تلاش ہے دل کا پتا ہے داغ داغ
خاطرِ احسنِ حزیں حسرتوں کا مزار ہے
حسرتوں کے مزار کا جلتا دیا ہے داغ داغ

○

میرا ہی سب قصور اگر ہے خطا معاف | کیوں کیجئے قصور کسی اور کا معاف

ہیں بھی گنہگار عدو بھی گناہ گار | میرے کئے کی پوچھ گچھ اُس کا کیا معاف

کیا کیا نہیں ہے ناز مجھے اُس گناہ پر | جس کو کیا ہے آپ نے بے التجا معاف

یارب مجھے وہ ذوقِ جنوں دے کہ بار بار | میں برملا خطا کروں وہ برملا معاف

دھوکے میں جانے کس کے مجھے قتل کر دیا | کہنا کسی کا ناز سے "تیری سزا معاف"

میں کیا کہوں گا پھر کہ ہوں کس کا قصوروار | تم نے قصور میرا اگر کر دیا معاف

اس کے سوا کہ عقل کی سرزد ہو کوئی بات | دیوانگانِ عشق کی ہے ہر خطا معاف

در پہ کھڑا ہے احسنِ شوریدہ سر پھر آج
کرتے رہے ہیں آپ جسے بار ہا معاف

تک رہے ہیں پھر نگاہِ ساقیِ میخانہ ہم | کر رہے ہیں انتظارِ گردشِ پیمانہ ہم

اعتبارِ جذبۂ دل احترامِ شانِ دوست | ورنہ کر لیتے کسی دن جرأتِ رندانہ ہم

ساز و برگِ عاشقی بردوش اک ننھی سی جان | کیوں نہ ہوں سودائیِ سوزِ پرِ پروانہ ہم

گرمِ جولانِ تصور تا سجدۂ انتظار | ہیں جنوں آوارۂ صحرائے خلوت خانہ ہم

آہ و نالہ سے ہے پیدا باد و باراں کی فضا | برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم

کیا ملا دیر و حرم سے اے جنوں جز سنگ و خشت | ٹھوکریں کھایا کئے ہیں در بدر کیا کیا نہ ہم

نقشِ عنوانِ خاکِ پائے کاروانِ دوستی | ہیں چراغِ رہگذارِ منزلِ جانانہ ہم

ہم سے احسن پوچھتے ہیں لوگ کیا نام و نشاں
ہو کر اُس کے آشنا اپنے سے ہیں بیگانہ ہم

بیزار عاشق ہو مگر دنیا سے بے پروا نہ ہو
ایسی باتیں کہتے ہیں جیسے کوئی دیوانہ ہو

میکدہ میں آئے کیوں پینا جسے آتا نہ ہو
توڑ دے جام و سبو ساقی کہیں ایسا نہ ہو

شمع تو آمادۂ دلداریِ پروانہ ہے
صبح تک لیکن نہیں معلوم کیا ہو کیا نہ ہو

شاہدِ رنگیں ادا کی دستگیری اور میں
یہ بھی کوئی شاید اُس کی لغزشِ مستانہ ہو

دل کی دولت رائیگاں ہے آنکھ اگر اندھی نہیں
اُف متاعِ خانہ ہے گر بند دروازہ نہ ہو

ہے یہی آئین و رسمِ دلبری و عاشقی
خون کے دریا رواں ہوں قتل کا دعویٰ نہ ہو

غم یہ ہے اُس کی مسیحائی پہ آ جائے نہ حرف
ورنہ دردِ جاں گسل اچھا نہیں ہوتا نہ ہو

احسنؔ اُس کی ہر ادا پر یاد آ جاتے ہیں آپ
اُس کی بزمِ ناز میں ذکر آپ کا ہو یا نہ ہو

نہ مذاقِ بال و پر ہے نہ تلاشِ آب و دانہ
مرے درد کا مداوا نہ قفس نہ آشیانہ

مری عمر بھر کی دولت مرا عیشِ جاودانہ
مجھے ہاتھ آ گیا ہے غمِ دوست کا خزانہ

مری عاشقی کا دعوےٰ ترے حسن کا سراپا
تری داستاں حقیقت مرا واقعہ فسانہ

وہ چلا قدم اٹھا کر تو بپا ہوئی قیامت
جو پلٹ کر اُس نے دیکھا تو بدل گیا زمانہ

ہے قفس نصیبِ طائر جو شکاریوں سے پوچھے
کہ اُسے کوئی بتا دے رہِ شاخِ آشیانہ

نہ مجالِ پائے ماندن نہ سبیلِ راہِ رفتن
کہ مقامِ دیدۂ دل ہے دو تیر یک نشانہ

کوئی پُرکشش ہے منزل کہ ہے شوق کاروانی
کہ لُٹی متاعِ خانہ ہوئے قافلے روانہ

ہے کچھ اور بات احسنؔ کوئی دل لگی نہیں ہے
یہ دعائے صبحگاہی، یہ نمازِ پنجگانہ

سرِ نیاز بہت دور آستاں سے ابھی
کہ ننگِ رہ گزرِ شوق آسماں ہے ابھی

خیالِ خوِ جمالِ رُخِ بتاں ہے ابھی
خدا کی یاد کی فرصت ہمیں کہاں ہے ابھی

قفس میں لائی ہے بادِ سموم یادِ وطن
فضا میں بکھری ہوئی خاکِ آشیاں ہے ابھی

نیازِ عشق سے بیگانہ حُسن بے پروا
بہار منتظرِ لطفِ باغباں ہے ابھی

کروں میں کس طرح اظہارِ دوستی تم سے
زمانہ درپئے آزارِ دوستاں ہے ابھی

مجھے تو اپنے مسیحا سے ہے بڑی اُمید
کہ حالِ دردِ نہاں قابلِ بیاں ہے ابھی

میں کیوں کر آنکھ پر اے شیخ باندھ لوں پٹی
مجھے مذاقِ مہ و مہر و کہکشاں ہے ابھی

بتوں کے شبہ میں لایا خدا پہ ہوں ایماں
مرا یقین بھی شرمندۂ گماں ہے ابھی

سبک خرام ہے پیرانہ سالیِ احسن
کہ دوستو! غمِ درماندگی جواں ہے ابھی

پائے مالی بھی گوارا ہے مجھے رسوائی بھی
یہ ترے در کی جو ملے ناصیہ فرسائی بھی

اُس کی آواز سے معمور ہے تنہائی بھی
بج رہی ہے مرے ویرانے میں شہنائی بھی

خود نما، خود نگر و عشوہ طراز و عشوہ فروش
یعنی وہ شوخ تماشا بھی تماشائی بھی

بن گئی وہ بھی ترے جلوۂ پنہاں کی رقیب
کوئی صورت اگر آنکھوں کو پسند آئی بھی

مومنِ شانِ خودی کا فرِ طاغوت بھی ہوں
مجھ کو خود رائی بھی زیبا ہے خود آرائی بھی

جلوۂ یار حقیقت بھی ہے افسانہ بھی
بزم میں اہلِ نظر بھی ہیں تماشائی بھی

سوچتے ہی رہے وہ چارۂ دردِ ہجراں
کر گئی مرگِ مفاجات مسیحائی بھی

دیجیے مجھ کو بتا ترکِ محبت کی سبیل
شیخ صاحب! کوئی شکل ایسی نظر آئی بھی

کیا بتاؤں گا اُسے نام و نشاں اے احسن
مجھ سے ملنے کی اگر اُس نے قسم کھائی بھی

ابوظفر نازش رضوی

نام امام علی، تخلص نازش، معروف بہ سیّد ابوظفر نازش رضوی۔ آپ نسب کے لحاظ سے رضوی سیّد ہیں۔ آپ کا آبائی وطن مشہد ہے۔ نازش کے جدِ امجد سیر و سیاحت کی غرض سے واردِ پنجاب ہوئے۔ اور اسی سفر کے دوران بمقام سیالکوٹ وفات پاکر پیوندِ زمین ہوگئے۔ نازش کے دادا سیّد حسن علیؒ والد کی رحلت کے بعد واپس مشہد لوٹ گئے۔ کچھ عرصہ بعد شاہِ افغانستان محمد یعقوب خاں اور اُن کے برادرِ اصغر غازی محمد ایوب خاں جو جنگِ ہرات میں دادِ شجاعت دینے اور افغانستان میں شدید انقلاب پیدا ہو جانے سے نقلِ وطن کر کے ایران میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ دولتِ ایران اور حکومت برطانیہ میں دوستانہ معاہدہ ہونے کے نتیجے میں جب ایران سے برطانوی ہند راولپنڈی اور بعد میں لاہور منتقل ہوئے۔ تو جو چند ممتاز افراد تہران و مشہدِ مقدس سے اُن کے ہمراہ واردِ ہند ہوئے اُن میں نازش رضوی کے دادا سیّد حسن علیؒ اور اِن کے والد سیّد امجد علیؒ مع افرادِ خاندان موجود تھے جو سردار محمد ایوب خاں کے ایمائے خاص سے مشہد واپس جانے کا ارادہ ترک کر کے ابتدا میں راولپنڈی اور اس کے بعد لاہور میں اقامت پذیر ہو گئے۔ آخر کار نازش کے والد سیّد امجد علی رضوی، لاہور میں دہلی کے ایک معزز سادات گھرانہ میں شادی کر کے ہمیشہ کے لئے یہیں کے ہو رہے۔

نازش یکم جنوری ۱۹۰۰ء کو بمقام لاہور پیدا ہوئے۔ اور یہیں پرورش پائی۔ آپ کی تعلیم کسی مکتب کی رہینِ منت نہیں۔ اُس زمانے کے مروّجہ دستور کے مطابق موصوف نے ابتدائی تعلیم اپنے ننہال کے زیرِ اثر گھر کی چار دیواری ہی میں حاصل کی۔ بعدہٗ اپنی خداداد ذہانت اور غیر معمولی فراست کی بدولت سترہ

سال کے سن میں فارسی، اُردو، انگریزی اور بقدرِ ضرورت عربی پر حاوی ہو گئے۔ اسی دوران آپ نے چند علم دوست احباب کے اصرار پر اُردو، فارسی، پنجابی اور پشتو کے امتحانات بھی پاس کئے۔ ۱۹۲۱ء میں حکومتِ برطانیہ نے اپنے مصارف پر نازش کو عراق عرب بھیجا۔ جہاں کامل تین سال تک ترجمان کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ عراق عرب سے واپسی پر اپنے رجحانِ طبع کے مطابق آپ نے صحافت کو ذریعہ معاش بنایا۔ اور روزنامہ زمیندار، سیاست، تازیانہ، نیرنگِ خیال، دلکش، بہارستان، ادبی دنیا اور ریاست دہلی جیسے مقتدر و ممتاز جرائد و رسائل میں مدیر اور مدیر اعلیٰ کی حیثیت سے کام کیا۔

۱۹۲۴ء کے اواخر میں مشہور عالم ادارہ گراموفون کمپنی لمیٹیڈ کے دہلی دفتر نے آپ کی خدمات حاصل کرلیں۔ جہاں صحافتی خدمت کے ساتھ ہی ساتھ کامل ۱۶ برس آپ متذکرہ کمپنی کے ریکارڈنگ ڈیپارٹمنٹ میں ایڈیٹر اور ادبی مشیر کے فرائض انجام دیتے رہے۔ آخر ۱۹۴۷ء میں تقسیم ملک کے ناگہانی انقلاب کے دوران مُدتِ مدید کے بعد اپنے ننہالی شہر دہلی کو خیر باد کہہ کر لاہور واپس آنے پر مجبور ہوئے۔

شعر گوئی کا آغاز دس گیارہ برس کی عمر سے ہوا اور سنِ شعور کے ساتھ ساتھ شاعری بھی ارتقائی مراحل طے کرتی گئی۔ مبدائے فیض نے انہیں موزونی طبع کے ساتھ جادو اثر موسیقی اور اس کی تکنیک سے بھی حصہ وافر عطا فرمایا ہے اور آپ اپنے اس جوہر سے ہر محفل میں ایک سماں باندھ دیتے ہیں۔

نازش پُرگو اور قادرالکلام شاعر ہیں۔ اردو، فارسی، ہندی اور پنجابی چاروں زبانوں میں روانی سے شعر کہتے ہیں۔ اب تک لاتعداد غزلیں، قومی و ملی نظمیں، ترانے، نعتیں، آئمہ کرام کی شان میں منقبتیں اور قصائد و سلام لکھ کر قبولِ عام کی سند حاصل کر چکے ہیں۔ قومی و ملی نظموں کے دو مجموعے "حرف ناسزا" اور "نوائے امروز" اور فارسی منظومات و غزلیات کا مجموعہ "گلِ نخستیں" شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔ گلِ نخستیں کو ایران میں ایسی مقبولیت حاصل ہوئی ہے کہ وہاں نازش کو ممتاز ایرانی شعراء میں شمار کیا جاتا ہے۔

○

وہ پیکرِ شباب مرا میہماں ہے اب
بختِ نکو جواں ہی نہیں نوجواں ہے اب

اِک بار جھک کے اُٹھنے کی ہرگز نہ تاب حشر
میری جبیں ہے اور ترا آستاں ہے اب

ہوتی ہیں برق و باد سے دن رات چشمکیں
دونوں کی عین زد پہ مرا آشیاں ہے اب

جس کے غبارِ راہ میں پنہاں تھی کائنات
وہ کارواں نگاہِ جہاں سے نہاں ہے اب

اب ان سے پوچھنے کی ضرورت نہیں رہی
خود میرا حالِ زار مرا ترجماں ہے اب

اے دل ترا تڑپنا انہیں ناگوار ہے
اے خستہ جان دیکھ ترا امتحاں ہے اب

وہ دردِ دل میں رکھا چھپے راز کی طرح
وہ درد میری زردیٔ رخ سے عیاں ہے اب

کہلا رہا تھا جس کی بدولت وہ آدمی
وہ بات آدمی میں مری جاں کہاں ہے اب

اُس پیکرِ شباب کی اُلفت کے فیض سے
پیری میں ایک ایک تمنا جواں ہے اب

داد و سند کا غُل ہو بپا بزمِ شعر میں
نغمہ طراز نازشِ رنگیں بیاں ہے اب

○

بے سود اُن کے حق میں ہے لعل و گہر کی چوٹ
تیرے فقیر کھاتے نہیں سیم و زر کی چوٹ

گریاں مجھے جو نزع میں دیکھا تو رو دیا
وہ سنگ دل بھی سہہ نہ سکا چشمِ تر کی چوٹ

اِس کا نہیں علاج وہ ہے قابلِ علاج
کم ہے زباں کے گھاؤ سے تیغ و تبر کی چوٹ

دنیائے دل بھی زیر و زبر درد و کرب سے
ناقابلِ بیان ہے نیچی نظر کی چوٹ

زُلفوں کے سائے میں بھی درخشاں ہے رُوئے دوست
ظلمت نہ سہہ سکی کبھی نورِ سحر کی چوٹ

کُنجِ مزار میں بھی نہ آیا ہمیں قرار
اے چارہ گر نہ پوچھ ہمارے جگر کی چوٹ

نازش کی گرد کو بھی نہ پہنچا کبھی رقیب
سہتا ہے بے ہنر کہیں اہلِ ہنر کی چوٹ

○

جب کر سکی نہ ملتفت اُن کو زبانِ شوق
پھر اشکہائے سُرخ بنے ترجمانِ شوق

خلوت میں دیدنی تھا نظارہ شبِ وصال
وہ اُن کا انہماک وہ میرا بیانِ شوق

کون و مکاں کی وسعتیں اس میں سمائی ہیں
کہتے ہیں جس کو دل وہ ہے میرا جہانِ شوق

دُنیا کی راحتیں ہیں مرے بخت پر نثار
آغوش میں ہے جب سے وہ رُوحِ روانِ شوق

آنکھوں میں اشک دل میں کسک نام کو نہیں
تسکینِ رُوح جب سے بنا ہے وہ جانِ شوق

اب خواب میں بھی دیکھتا ہوں جلوہ ہائے وصل
اُن کا خیال جب سے بنا میہمانِ شوق

عالم میں وجہِ گرمیِ بازار ہو گئی
کچھ اس طرح سے ہم نے سجائی دکانِ شوق

قسمت سے ہو گئے جو تری رہگذر کی خاک
چمکے وہ مہر بن کے سرِ آسمانِ شوق

میں کہتے کہتے خواب کی حد سے گزر گیا
وہ سُنتے سُنتے سو گئے جب داستانِ شوق

داغوں سے اِن دنوں مرا سینہ ہے لالہ زار
گویا بہار پر ہے مرا گلستانِ شوق

وہ بھی اُنہیں کا ہو گیا اللہ رے نصیب
وہ دل کہ جس کو سمجھے تھے ہم رازدانِ شوق

نازش نے رکھ دیا تہِ خنجر سرِ نیاز
مقتل میں جا کے اُس نے دیا امتحانِ شوق

پہنچ جاؤں گا سر کے بل تمہارے آستانے تک
دیا قسمت نے میرا ساتھ گر بخت آزمانے تک

تسلط عارضی ہے اس کا، وہ بھی اک زمانے تک
گلستاں میں خزاں رہتی ہے فصلِ گل کے آنے تک

ہنسی پھولوں کی ہے سب بلبلوں کے چہچہانے تک
بہارِ باغ قائم ہے گلوں کے مسکرانے تک

فقط یہ کہہ کے "آئندہ ملیں گے" ہو گئے رخصت
یہاں زندہ رہے گا کون آئندہ زمانے تک

بہا لے وہ جہاں سے قیمتی تھا بس وہ اک لمحہ
ہوا جو صرف اُن کے آستاں پر سر جھکانے تک

مبارک ہوں تجھے اے شیخ! عقل و ہوش کی باتیں
سُنی جاتی ہیں یہ اکثر کسی پر دل کے آنے تک

عبارت ہے مری روداد سے فرہاد کا قصہ
حدیں اس کی پہنچتی ہیں مرے رنگیں فسانے تک

پہنچ جاتا سرِ عرشِ بریں بختِ رسا میرا
اگر ہوتی رسائی میرے سر کی تیرے شانے تک

وہ ہو جائے گا خود ہی احتسابِ نفس پہ مائل
دیا گر محتسب نے ساتھ میرا بادہ خانے تک

ہوس کاروں کی بن آتی جہاں میں ہر طرف نازش
اگر اُلفت کہیں محدود ہوتی دل لگانے تک

ہے مہر و ماہ کو بھی تری جستجو الگ
بلبل و بہار پھرتے ہیں وہ سُو بسُو الگ

برگشتہ ہے اُدھر فلکِ کینہ جُو الگ
ناراض ہے اِدھر وہ بُتِ تُند خُو الگ

اے شیخ راہِ جہد میں ہے مجھ سے تُو الگ
ہے تیری جستجو سے مری جستجو الگ

ساقی یہ میکدے میں ہے کیا تفرقہ بپا
شیشہ جُدا ہے جام سے خُم سے سبُو الگ

اِک میری جانِ زار، مخالف ہیں لاتعد
دشمن زمانہ، برسرِ پرخاش تُو الگ

ہر ایک سے ہے صورت و سیرت میں وہ جُدا
اُس گُل کا باغِ دہر میں ہے رنگ و بُو الگ

تارِ سرِ تنک و سوزنِ مژگاں سے دل کے ساتھ
کرنا پڑے گا چاکِ جگر کو رفو الگ

خوں میں نہا کے سر کو جھکاتے ہیں زیرِ تیغ
عشاق کی نماز جُدا ہے وضو الگ

شکل اپنی آئینے میں جو دیکھی تو بول اُٹھے
یارب نہ مجھ سے ہو یہ کبھی خوبرو الگ

سینے کے زخم ہو کے ہرے رنگ لائیں گے
پائیں گے خونِ دل سے یہ نشو و نما الگ

تاروں میں جیسے چاند نمایاں ہے چرخ پر
زہرہ وشوں سے یوں ہے مرا ماہ رُو الگ

خوفِ جزا سے روزِ جزا منکرینِ حق
بیٹھے ہیں سر جھکائے ہوئے ایک سُو الگ

نازشؔ پرو کے لایا ہے جو بزمِ شعر میں
ہے اُن گلوں کا رنگ جُداگانہ بُو الگ

مہرباں مستوں پہ ہے وہ جانِ مستاں آج کل
دیکھئے پھر اوج پر ہے بختِ رنداں آج کل

جس کا دامن تھام لینا مغفرت کی ہے سبیل
نازش اپنے ہاتھ میں ہے اس کا دامن آج کل

قابلِ تجدید ہے پھر قصۂ طور و کلیم
تاک میں ہے پھر نگاہِ نازِ جاناں آج کل

پھر کنوئیں جھنکوائے گی قسمت یہ آتا ہے نظر
جوش پر ہے اُلفتِ چاہِ زنخداں آج کل

فیضِ ساقی سے نظر آتے ہیں سرشارِ نشاط
دیدنی ہے میکدے میں شانِ رنداں آج کل

جیب و داماں تک ہی وحشت کی نہیں ہے دسترس
اس کے ہاتھوں چاک ہیں لاکھوں گریباں آج کل

حشر برپا ہے ترے کوچے میں اے جاں آج کل
ہر طرف ہیں کشتگانِ عشق رقصاں آج کل

اوّل و آخر ہیں زیب و زینتِ میخانہ ہم
بادہ ہم، خُم ہم، سبو ہم، شیشہ و پیمانہ ہم

تیرے کہنے پر چلے جب اے دلِ دیوانہ ہم
ہو گئے مشہورِ دوراں فاتحِ ویرانہ ہم

پائے ساقی پر گرا کر سر بلندی کی عطا
دل سے ہیں ممنون تیرے لغزشِ مستانہ ہم

لے گئی قسمت اچانک گھیر کر سوئے حرم
جا رہے تھے ورنہ گھر سے جانبِ بتخانہ ہم

اپنی پامردی کا شہرہ ہے جہانِ عشق میں
جب سے ہیں خوگر ترے اے ہمتِ مردانہ ہم

آرزو یہ تھی کہ جب ہوتا تو محوِ خوابِ ناز
اپنی مژگاں سے تری زلفوں میں کرتے شانہ ہم

ہیں عبارت شامِ غم ہم سے یہ دونوں صورتیں
شمع سوزاں ہیں، کبھی خاکسترِ پروانہ ہم

پرتوِ روئے صنم سے ہے فروزاں داغِ دل
برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم

غیر کو اپنا وہ کہتا ہے تو اس کا غم نہیں
ہم سے بیگانہ ہے وہ اُس سے نہیں بیگانہ ہم

محفلِ اہلِ سخن میں پائے یہ رنگِ قبول
لائے ہیں نازش بصد اخلاص یہ نذرانہ ہم

دلِ ناداں کا اعتبار نہیں   بخدا یہ کسی کا یار نہیں

جو تری راہ کا غبار نہیں   باعثِ عزّ و افتخار نہیں

جسے ہمدرد و عمل سے پیار نہیں   زندگی اُس کی باوقار نہیں

تر و تازہ ہے زخمِ دل ہر دم   گُل یہ شرمندۂ بہار نہیں

تیری بخشش کی حد نہیں یارب   میرے عصیاں کا گو شمار نہیں

آج تنہا ہے بزم میں وہ صنم   گُل کے پہلو میں کوئی خار نہیں

دلِ حسرت زدہ کی حالت پر   کون ہے وہ جو اشکبار نہیں

ناوکِ ناز کے ہیں سب زخمی   ایک میرا ہی دل فگار نہیں

دلِ شہادت پہ جن کا ہے مائل   جان دینے سے اُن کو عار نہیں

زالِ دنیا سے دیکھ دل نہ لگا   دوستی اِس کی پائیدار نہیں

دل کو سمجھاؤں کس طرح ناصح   مجھے اِس دل پہ اختیار نہیں

میگساروں میں تیرے اے ساقی   ایک بھی مردِ ہوشیار نہیں

جا رہا ہے بہار کا موسم   اور وہ گُل گلے کا ہار نہیں

خُلد کا تذکرہ نہ کر واعظ   خُلد ہم شانِ کوئے یار نہیں

جا رہا ہوں بسانِ نکہتِ گُل   میری میت کسی پہ بار نہیں

وہ انا الحق کہے گا کیا نازش

یاد جس کو حدیثِ دار نہیں

جو راہِ عشق میں سود و ضرر سے گزرے گا
وہی تو مرحلۂ خیر و شر سے گذرے گا

یہ ماجرا کوئی دم میں نظر سے گذرے گا
کہ آدمی حدِ شمس و قمر سے گذرے گا

صبا اڑا کے مری خاک اِس طرف لے آ
وہ شہسوار سُنا ہے اِدھر سے گذرے گا

کبھی تو ہوگی مری کشتِ آرزو سرسبز
کبھی تو ابرِ بہاراں اِدھر سے گذرے گا

اُسی کی خاک کے ذرّے بنیں گے شمس و قمر
جو خاک ہو کے تری رہ گذر سے گذرے گا

جو رُونما ہوا صبحِ وصال وقتِ وداع
وہ سانحہ نہ کبھی پھر نظر سے گذرے گا

بلند ہوگا سر اِس وقت آدمیت کا
جب آدمی ہوسِ سیم و زر سے گذرے گا

بنیں گے عیب بھی اُس شخص کے ہنر نازش
جو دہر میں مرے عیب و ہنر سے گذرے گا

اِک وہ سجدہ جو ترے در پہ گذار آئے ہیں
اُس سے بگڑی ہوئی تقدیر سنوار آئے ہیں

ہم ترے کوچے میں بےتابیٔ دل کے ہاتھوں
سینکڑوں بار گئے سینکڑوں بار آئے ہیں

قبر تک موت نے پیدل ہمیں چلنے نہ دیا
مر کے احباب کے کاندھوں پہ سوار آئے ہیں

جب کبھی نکلا ہوں میں دشت نوردی کے لئے
ہر قدم پر مری پابوسی کو خار آئے ہیں

اُنہیں جنّت کی طلب ہے نہ تمنائے اِرم
تیری محفل میں جو کچھ لمحے گذار آئے ہیں

از ثریٰ تا بہ ثریا رہِ اُلفت میں ندیم
چاند تاروں کے کئی شہر و دیار آئے ہیں

اے رگِ جاں سے قریں رہ کے نہ ملنے والے
ہم تجھے دیر و حرم میں بھی پکار آئے ہیں

کربلا عشق کی ہے آخری منزل نازش
طُور سے سخت مقام اِس میں ہزار آئے ہیں

دیکھو اسے پابندِ وحشت بادیہ پیمانہ نہ ہو
تشنگی دل میں تڑپ منت کشِ صحرا نہ ہو

بیقراری سے تری دنیا تہ و بالا نہ ہو
ضبط قلبِ مضطرب! محشر کہیں برپا نہ ہو

تا قیامت تیرِ الفت کی خلش باقی رہے
یا الٰہی حشر تک زخمِ جگر اچھا نہ ہو

ہے وہ محتاجِ ترحم او بتِ ناآشنا
جس کا دنیا میں کوئی تیرے سوا اپنا نہ ہو

ایک عالم عیسیٰ دوراں کہے تجھ کو مگر
اس پہ اک بیمارِ غم تجھ سے کبھی اچھا نہ ہو

دشمنوں سے دوستی، اپنوں سے یہ بیگانگی
غیر کا چاہا تو ہو جائے مرا چاہا نہ ہو

زندگانی خضر کی صدقے ہے اس کی مرگ پر
جو دمِ آخر بھی محتاجِ دمِ عیسیٰ نہ ہو

ناخدا اس کا سفینہ اس کا موجیں اس کی ہیں
قلزمِ حرص و ہوا میں جو کبھی ڈوبا نہ ہو

آج کیوں وقتِ سحر خورشید کا ہے رنگ زرد
دیکھنا وہ مہرِ تاباں بام پر آیا نہ ہو

آؤ نازش سیر کرنے کے لیے ہم بھی چلیں
حشر کہتے ہیں جسے عشاق کا میلا نہ ہو

برائے تدفینِ بعدِ مُردن جسے تمہاری گلی ملے گی
تمہاری تُربت کے غم سے تا حشر اُس کو آسودگی ملے گی

نہ ہوگا تا زیست زیرِ گردوں کبھی سکون و قرار حاصل
تمہاری اُلفت میں کل کے بدلے ہمیں فقط بےکلی ملے گی

یہی اندھیرے جو بزمِ گیتی پہ ایک مدت سے ہیں مُسلّط
انہی اندھیروں سے بزمِ گیتی کو ایک دن روشنی ملے گی

عدو یہ کہتے ہیں دوستو میرے قتل سے کی ہے اس نے توبہ
سُنا ہے جب سے شہیدِ اُلفت کو پھر نئی زندگی ملے گی

دلِ حقیقت شناس کو حُسنِ ذات کے عشق کی بدولت
خزانہ عرفاں کا ہاتھ آئے گا دولتِ آگہی ملے گی

نیاز و عجز و رضا و تسلیم کے جو ہیں ابتدا سے خوگر
غرور و کبر و ریا و عصیاں سے طینت اُن کی تہی ملے گی

جم و سکندر کی عظمتوں کے فسانے اب ہیچ ہیں نظر میں
سُنا ہے جب سے ترے غلاموں کو حشر میں خواجگی ملے گی

فرشتے سجدہ کریں گے شیطان ہوگا مردود کفر کر کے
کسے خبر تھی کہ ایک خاکی کو اِس طرح برتری ملے گی

کہا یہ قسّام نے بروزِ ازل باندازِ مشفقانہ
نیاز تقدیرِ عشق ٹھہرے گا حُسن کو دلبری ملے گی

ہوئے منور نہ جن کے دل داغہائے الفت کی روشنی سے
قسم خدا کی پسِ فنا قبر میں اُنہیں تیرگی ملے گی

غمِ زمانہ سے پائیں گے ہم نجات تیرے ہی زیرِ سایہ
ملی تو اک روز تیرے قدموں میں ہم کو آسودگی ملے گی

وہ داغِ سجدہ جو مجھ سیہ کار کی جبیں پر چمک رہا ہے
اسی سے نازش پسِ فنا قبر میں مجھے روشنی ملے گی

پھر بہار آئی ہے پھر عیش کے ساماں ہوں گے
تازہ ساقی سے پھر اس عہد میں پیماں ہوں گے

تیرے ممنون وہ اے گردشِ دوراں ہوں گے
مٹ گئے اک روز جو خاکِ رہِ جاناں ہوں گے

نوحہ گر، مرثیہ خواں گبر و مسلماں ہوں گے
اپنے بیگانے مری مرگ پہ گریاں ہوں گے

جو خزاں میں خس و خاشاکِ گلستاں ہوں گے
وقت پہ زینتِ آغوشِ بہاراں ہوں گے

اے صنم آج ترے در پہ جو درباں ہوں گے
کل وہی خلد میں ہم رتبۂ رضواں ہوں گے

ضوفشاں نیزوں پہ سورج کئی آئیں گے نظر
اشک جس وقت ہمارے سرِ مژگاں ہوں گے

کنجِ تنہائی میں غم اس لئے ظلمت کا نہیں
داغ سینے کے تہِ قبر درخشاں ہوں گے

اے فلک تربتیں عشاق کی پامال نہ کر
لا نعد گھر تری یلغار سے ویراں ہوں گے

موتیوں سے مری قسمت سجدا کھیلے گی
جب تصور میں کسی کے دُرِ دنداں ہوں گے

بوئے گل کی طرح پہنچیں گے تری محفل میں
تا دمِ زیست نہ منت کشِ درباں ہوں گے

پھر بہار آئی ہوئے شاد ترے سودائی
مثلِ گل چاک ہزاروں کے گریباں ہوں گے

حق یہ ہے اُس گھڑی بر آئیں گے ارماں سارے
جب ترازو مرے دل میں ترے پیکاں ہوں گے

آئیں گے خاک اڑانے کے لئے دیوانے
فصلِ گل آئی پھر آباد بیاباں ہوں گے

نظر آئیں گے بہم ملتے ہوئے دونوں وقت
رُخ پہ گیسو ترے جس وقت پریشاں ہوں گے

آج جو پاس سے کترا کے گزر جاتے ہیں
کل برے وقت میں وہ کیا مرے پرساں ہوں گے

ہوگا اک روز یہی دشت نوردی کا مآل
پائے پُر آبلہ میں خارِ مغیلاں ہوں گے

خوفِ عصیاں سے پریشان نہ ہو اے نازش
حشر کے دن ترے حامی شہِ مرداں ہوں گے

صلاح الدین گوہر حزیں ایم ۔ اے

نام صلاح الدین گوہر، تخلص حزیںؔ۔ تعلیم ایم اے فارسی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔

تلمیذ۔ پروفیسر ضیاء احمد صاحب ضیاء، ایم اے (مرحوم) پروفیسر فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ ان کی وفات کے بعد حضرت جگر مرادآبادی۔

۱۸۱۰ء میں کابل کی بادشاہ گردشی کے بعد دُرِ دراں احمد شاہ دُرانی کا خاندان کابل سے فرار پر مجبور ہوا۔ شاہ شجاع آلِ دراں کے آخری تاجدار دوست محمد خاں سے شکست کھا کر ہندوستان آئے تو انگریزوں نے اِس مہاجر خاندان کو لدھیانہ میں آباد کیا۔

شہزادہ صلاح الدین گوہر حزیںؔ شاہ شجاع کے بھائی شہزادہ محمد حسین مرحوم و مغفور کی اولاد ہیں۔ آپ کا سلسلۂ نسب چوتھی پشت میں شہزادہ محمد حسین اور چھٹی پشت میں احمد شاہ درانی دُرِ دراں سے جا ملتا ہے۔

حزیںؔ ۱۶ راگست ۱۹۱۱ء کو پیدا ہوئے۔ آپ کے والد محترم شہزادہ عالی گوہر مرحوم سپرنٹنڈنٹ پولیس تھے۔ آٹھ برس کی عمر تھی جب آپ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی تیسری جماعت میں داخل ہوئے اور باقاعدگی سے امتحانات پاس کرتے رہے۔ ۱۹۳۴ء میں علی گڑھ سے فارسی میں ایم اے پاس کیا ملک میں یہ انتہائی کساد بازاری کا زمانہ تھا۔ آپ ۱۹۳۸ء میں گورنمنٹ کالج لدھیانہ میں فارسی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔

۱۹۴۱ء میں فوجی ملازمت اختیار کی اور چھ مہینے کی ٹریننگ کے بعد ۱۹۴۲ء میں کمیشن مل گیا۔ ۱۲ برس فوجی ملازمت کرنے کے بعد ۱۹۵۳ء میں فوجی ملازمت سے سبکدوش ہوئے اور پی آئی ڈی سی میں ملازم ہو گئے ۱۹۵۹ء میں پی آئی ڈی سی سے ریجنل ڈائریکٹر کے عہدے سے سبکدوش ہوئے اور ایک برس بعد حکومت پاکستان کے ہفت روزہ اخبار پاک جمہوریت میں منیجر مقرر ہوئے۔ پاکستان اور بھارت کی گذشتہ جنگ میں

حکومتِ پاکستان نے فوجی خدمت کے لئے آپ کو طلب کر لیا۔ چنانچہ اب فوجی وردی میں ملبوس پائینیر فورس کی ایک بٹالین کی کمانڈ کر رہے ہیں۔

شعر کی صلاحیت کچھ تو خاندانی ورثے میں ملی اور کچھ علی گڑھ کی فضا نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ آپ کے والد محترم شہزادہ عالی گوہر فارسی کے بلند مرتبہ شاعر تھے اور گوہر تخلص کرتے تھے۔ انہیں نام و نمود سے گریز تھا اس لئے جو کہا وہ بیاض تک محفوظ رہا۔ پولیس کی ملازمت بھی کلام کے شائع کرانے میں حائل رہی۔

شہزادہ صلاح الدین گوہر حزیں کے دادا شہزادہ والا گوہر مرحوم بھی فارسی کے مستند شاعر تھے۔ اُنہوں نے فارسی کا ایک ضخیم دیوان اپنے پیچھے چھوڑا جو ۱۹۴۷ء کی غارت گری میں ضائع ہو گیا۔ دیوان کا کچھ حصہ حزیں صاحب کے ذہن میں ہے۔ آپ کا ارادہ ہے کہ اپنے والد مرحوم اور دادا مرحوم کا کلام یکجا شائع کر دیں۔ آپ اپنا کلام بھی اسی مجموعے میں شامل کر دیں گے۔

صلاح الدین گوہر حزیں نے اپنا پہلا شعر پندرہ برس کی عمر میں کہا اُس وقت آپ نویں درجے میں تعلیم پاتے تھے۔ فانی مرحوم کا زمانہ تھا۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے سالانہ مشاعرہ میں فانی مرحوم کا زبان زدِ عام مصرعہ "کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ" مصرعِ طرح دیا گیا۔ آپ فانی کا یہ مصرع گنگنا رہے تھے کہ مندرجہ ذیل شعر ہو گیا۔

خوشی سے منظرِ چاکِ سحر کے دیکھنے والو
اِدھر آؤ مرا چاکِ گریباں دیکھتے جاؤ

اور پھر مشاعرہ سے پہلے پوری غزل ہو گئی۔ پروفیسر ضیا احمد صاحب کو یہ غزل دکھائی تو اُنہوں نے بہت پسند کی اور ساتھ ہی آپ کے لئے حزیں تخلص تجویز فرمایا۔ آپ کا خیال ہے کہ آپ کی زندگی پر آپ کے تخلص کا بہت اثر پڑا ہے اور ساری زندگی حزن و ملال میں ہی گزری ہے۔

آپ نے اپنے بچوں کو وصیت کی ہے کہ آپ کی قبر پر آپ کا یہ شعر کندہ کیا جائے۔

تاریکیٔ عصیاں بھی حزیں راہ بھی تاریک
کیا گزرے خدا جانے مسافر پہ سفر میں

یہ گیت ہے بہار کا یا گلستاں کا رقص
افسوں ہے سحر ہے ترے سروِ رواں کا رقص

ساز و سرود و رقص ہم آہنگ کیوں نہ ہوں
ہوتا ہے تارِ جاں پہ دلِ ناتواں کا رقص

یوں کھیلتا ہے درد دلِ لخت لخت سے
جیسے ہو لالہ زار میں برقِ تپاں کا رقص

آتی ہے جب بہار تو ہوتا ہے دیدنی
کنجِ قفس میں طائرِ آزردہ جاں کا رقص

طوفانِ تند و تیز میں موجوں کے دوش پر
دیکھا ہے ہم نے کشتیِ بے بادباں کا رقص

تنکا سی کے ڈھونڈ رہا ہوں کل آپ نے
دیکھا تھا دوشِ باد پہ جس آشیاں کا رقص

ہے میکدے میں جشنِ بہاراں کا اہتمام
ساغر میں ہو رہا ہے مئے ارغواں کا رقص

اب مجھ کو اندمال کی حسرت نہیں رہی
ہے میرے زخم زخم میں نوکِ سناں کا رقص

ساغر میں عکسِ سبحہ و دستار دیکھیے
پھر اس کے بعد دیکھیے پیرِ مغاں کا رقص

رہتی ہے وہ قریبِ نشیمن جہاں بھی ہو
ہے دیدنی بہار میں برقِ تپاں کا رقص

زاہد بھی جائے کیوں نہ وہاں سر کے بل حزیںؔ
ہے میکدے میں حورِ باغِ جناں کا رقص

روداد غم کسی کو سنانے سے کیا غرض　　اپنی متاعِ درد لٹانے سے کیا غرض

زخمِ جگر کسی کو دکھانے سے کیا غرض　　خودداریوں کو ٹھیس لگانے سے کیا غرض

شبنم سے کاش وقتِ سحر پوچھ لے کوئی　　پھولوں کی انجمن کو رلانے سے کیا غرض

صیاد و برق جس کا چمن میں کریں طواف　　اُس آشیاں کو آگ لگانے سے کیا غرض

جب وہ ہی زندگی میں شریکِ سفر نہ ہوں　　الزام زندگی کا اُٹھانے سے کیا غرض

آنکھیں نہ کہہ سکیں جسے اور دل نہ سن سکیں　　اے ہوشمند ایسے فسانے سے کیا غرض

تم جانِ آرزو ہو متاعِ حیات ہو　　سب کچھ تمہیں ہو مجھ کو زمانے سے کیا غرض

دیتی ہوں منزلوں کا پتہ ٹھوکریں جسے　　ہو اُس کو سنگِ راہ ہٹانے سے کیا غرض

رکھا ہے سوچ کر ترے در پر سرِ نیاز　　ہر آستاں پہ سر کو جھکانے سے کیا غرض

صیاد ہم تو خود ہیں قفس کی تلاش میں　　ہم رنگِ دانہ دام بچھانے سے کیا غرض

اُن کو غرورِ حسن مجھے عاجزی پسند　　فرقِ نیاز و ناز مٹانے سے کیا غرض

لکھی ہے تیرگی مرے دل کے نصیب میں　　بجھتے ہوئے چراغ جلانے سے کیا غرض

پیتا ہوں صبح و شام کسی کی نگاہ سے　　ساقی سے رسم و راہ بڑھانے سے کیا غرض

اتنا بہت ہے آپ مرے ہمقدم تو ہیں　　ہر گام پر نگاہ ملانے سے کیا غرض

دنیائے رنگ و بو سے تعلق ہی جب نہیں　　ہنسنے ہنسانے پینے پلانے سے کیا غرض

معلوم ہے مآلِ دعا جب حزیں مجھے
پھر ہو دعا کو ہاتھ اُٹھانے سے کیا غرض

○

کٹ جائے برگِ گل سے نہ تلوار سے کٹے
کیا کر سکو گے اپنی رگِ جاں کی احتیاط

دل کی تپش سے طوق و سلاسل پگھل گئے
کام آ سکی نہ صاحبِ زنداں کی احتیاط

کوشش تو ہے یہی کہ رہیں تازہ داغِ دل
ہے فرض مجھ پہ میرے گلستاں کی احتیاط

آئیں یہاں جنہیں ہو صداقت کی جستجو
ہوتی ہے مئکدوں ہی میں ایماں کی احتیاط

دامن کے چاک سینے سے پہلے یہ سوچ لو
کر بھی سکو گے اپنے گریباں کی احتیاط

سینے میں رکھ لیا اُسے دل میں بٹھا لیا
اب اور کیا کروں غمِ جاناں کی احتیاط

یہ ناخدا بھی بندۂ تقدیر ہی تو ہیں
اِن کی بھی احتیاط ہے انساں کی احتیاط

بس ایک ہی نظر میں ہم اپنا گئے اُنہیں
منہ تک رہی ہے جلوۂ جاناں کی احتیاط

پلکوں سے گر نہ جائے کہیں اشک اے حزیں
"لازم ہے اِس چراغِ فروزاں کی احتیاط"

○

ہر سمت چھا گیا ہے اندھیرا ترے بغیر — ہو زندگی میں کیسے اُجالا ترے بغیر
جینا ترے بغیر ہے اک شغلِ رائیگاں — پھر زندگی ہو کیسے گوارا ترے بغیر
اے جانے والے لوٹ کے آ تا تو دیکھ لے — ویراں ہے کس قدر مری دنیا ترے بغیر
آنکھوں میں اشک، دل میں جلن، روح میں خلش — اُف کس قدر عذاب ہے جینا ترے بغیر
ہر آرزو تجھی سے تھی اے جانِ آرزو — کیسے ہو دل میں کوئی تمنّا ترے بغیر
کیا بھر سکیں گے زخم دلِ داغ داغ کے — کیا ہو سکے گا غم کا مداوا ترے بغیر
ہمدرد بھی ہیں، دوست بھی ہیں، غمگسار بھی — مَیں غم نصیب پھر بھی ہوں تنہا ترے بغیر

بہلا رہا ہے دل کو حزؔیں تیرے ذکر سے
ہے اُس کے دل کا کون سہارا ترے بغیر

مزرعۂ غم کی تازگی ہے مرے اختیار میں — خونِ رگِ بہار ہے دیدۂ اشکبار میں
رشکِ بہار کیوں نہ ہو دامنِ خونچکاں مرا — حُسنِ بہارِ خلد ہے دامنِ لالہ زار میں
ہے دلِ لخت لخت میں لالہ و گُل کی تازگی — عکسِ بہار ہی تو ہے سینۂ داغدار میں
دامنِ دل ہے گلفشاں عکسِ رُخِ حبیب سے — ہے وہ بہارِ زندگی ساتھ مرے بہار میں
دولتِ دو جہاں ملی مل گیا جس کو غم ترا — لطفِ سرورِ سرمدی ہے غمِ کیف بار میں
بادۂ غم فراق ہے، وصل شرابِ ناب ہے — وصل میں اک نشاط ہے کیف ہے انتظار میں
شکوۂ ہجر وہ کرے پاسِ وفا نہ ہو جسے — وہ شبِ ہجر ہی نہیں گزرے جو یادِ یار میں

بخیہ گری نثار کی بے خبری پہ اے حزؔیں
دولتِ صبر مل گئی دامنِ تار تار میں

۱۸۹۶ء میں موضع کوہا در ضلع جالندھر کے ایک زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ گورنمنٹ ہائی سکول جالندھر سے میٹرک، اسلامیہ کالج لاہور سے ایف اے اور گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے کا امتحان پاس کیا اور دو سال بعد سنٹرل ٹریننگ کالج میں داخل ہو کر بی۔ ٹی کی ڈگری حاصل کی۔ اِن کا زمانہ طالب علمی اس لحاظ سے ممتاز ہے کہ وہ پانچویں جماعت سے لے کر بی اے کے آخری سال تک وظیفہ خوار رہے۔
ملازمت کے اعتبار سے بھی انہیں ایک خاص مقام حاصل ہے۔ محکمۂ تعلیم میں غالباً یہ پہلی مثال ہے کہ کوئی شخص محض ایک ٹیچر کی حیثیت سے محکمہ میں شامل ہوا اور اپنی خداداد قابلیت و صلاحیت اور محنت و دیانت سے مختلف اہم اسامیوں پر حسن کارکردگی کا ایک اعلیٰ معیار قائم کرتے ہوئے ڈائریکٹر کے عہدے تک پہنچ گیا ہو۔ آپ محکمۂ تعلیم میں ایک قابل، فرض شناس، خوش خلق، ہمدرد اور دیندار افسر کی حیثیت سے مشہور رہے اور ۳۱ سال تک ملک و قوم کی خدمت کرنے کے بعد ۱۹۵۱ء میں عزت و آبرو کے ساتھ اپنے فرائض منصبی سے سبکدوش ہو گئے۔ شاعری میں ان کا شمار ایسے بزرگوں میں ہوتا ہے جن کو اللہ تعالےٰ شعر گوئی کا ملکہ وہبی طور پر عطا فرماتا ہے اور وہ مشقِ سخن اور عروضی کاوشوں کے بغیر بھی اچھے شعر کہہ لیتے ہیں۔
یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ ان کی شاعری کی ابتدا ایک طویل نعتیہ نظم سے ہوتی ہے جس کا نام "پیکرِ رحمت" ہے جو بارہ بندوں میں منقسم اور ۱۵۱ اشعار پر مشتمل ہے اور ایک کتابچہ موسوم بہ "شانِ مصطفےٰ" کی شکل میں علیحدہ طور پر طبع ہو چکی ہے۔ یہ نعت خاص وہبی شاعری کا ایک نادر نمونہ ہے۔ مولانا غلام رسول صاحب مہر نے جو ملک کے مشہور و معروف شاعر و ادیب اور ایک بلند پایہ صحافی و نقاد ہیں۔ اِس نعت

کو اردو زبان میں ایک مثالی نعت قرار دیا ہے۔ شعر گوئی میں سید صاحب موصوف کا طبعی رجحان اللہ تعالیٰ
اور اُس کے محبوبؐ پاک کی حمد و ثنا کی طرف رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی طرحی غزلوں میں بھی نعت کا رنگ
غالب ہے جن کے محرک کم و بیش انجمنِ ترقی ادب ماڈل ٹاؤن کے مشاعرے ہوتے رہے ہیں۔

سید صاحب کا کلام اپنی منفرد نوعیت کے اعتبار سے ممتاز بھی ہے اور دل پذیر بھی۔ بیان کی روانی،
الفاظ کی برجستگی، فکر کی گہرائی اور مضامین کی بلندی اِن کے کلام کے نمایاں اور قابلِ ستائش پہلو ہیں۔

○

نگاہ شوق کی اپنی زباں ہوگئی تو کیا ہو سکا
حکایت قلب وجاں کی یوں بیاں ہوگی تو کیا ہوگا

تڑپ اُٹھیں خدا کی رحمتیں اشکِ ندامت پر
زباں جب حالِ دل کی ترجماں ہوگی تو کیا ہوگا

جو ہے مستور جلووں پر بھی ما ہو سکا یہ عالم
وہ شمعِ حسن محفل میں عیاں ہوگی تو کیا ہوگا

نگاہِ ناز جب اٹھی قیامت ہوگئی برپا
نگہ کو جستجوئے قلب وجاں ہوگی تو کیا ہوگا

میں اتنی پردہ داری پر بھی غرقِ صد ندامت ہوں
عطا میرے جوارح کو زباں ہوگی تو کیا ہوگا

فروزاں ہی نہیں ہے دل میں شمعِ نورِ ایماں جب
جگانے کے لئے ہم کو اذاں ہوگی تو کیا ہوگا

کفن باندھے ہوئے سر سے جو نکلے عاشقِ صادق
محبت اُس کی رسوائے جہاں ہوگی تو کیا ہوگا

شہنشاہی سے خوشتر کیف ومستی کی ہے اک ساعت
یہ لذت دردِ دل کی جاوداں ہوگی تو کیا ہوگا

خداوندِ دو عالم جب ثنا خوانِ محمدؐ ہے
اگر ساری خدائی مدح خواں ہوگی تو کیا ہوگا

وہ محبوبِ خدا اتنے رفیع الشان ہیں واللہ
ضیائے شمس محتاجِ بیاں ہوگی تو کیا ہوگا

خبر کس کو کہ قلبِ ترمذی کے گوشے گوشے میں
اگر حبِ شہ کون ومکاں ہوگی تو کیا ہوگا

اسلام کی تعلیم ؛ خیالات کی اصلاح
اقوال کی، افعال کی، عادات کی اصلاح

ممکن ہی نہیں صورتِ حالات کی اصلاح
گر ہو نہ سکے پہلے خیالات کی اصلاح

کردار کی تعمیر میں ہے خشتِ اساسی
افکار کی، اخلاق کی، جذبات کی اصلاح

بیداریٔ افکار کا ہوتا ہے نتیجہ !
فرسودہ حکایات و روایات کی اصلاح

آئین بھی ہے فلسفہ بھی نورِ خدا بھی
قرآن سے ہو جملہ نظامات کی اصلاح

مالک نے عطا کی ہے تجھے اپنی نیابت
"رکھ پیشِ نظر صورتِ حالات کی اصلاح"

طوفان میں فیشن کے نئی پود ہے غرقاب
اللہ کرے صورتِ حالات کی اصلاح

بے دینی و عریانی و خود رائی و ایجاد
مسلم ہے تو کر جملہ خرافات کی اصلاح

ہے خدمتِ مخلوق بھی خالق کی عبادت
لازم ہے کہ ہو ذوقِ عبادات کی اصلاح

مسکینی و درویشی و تقویٰ میں ہے مضمر
خود طالبِ درجات و مقامات کی اصلاح

مصروف ہے انسان جو پروازِ خلا میں
شاید اُسے سوجھی ہے سماوات کی اصلاح

مغرب کو ہے اصلاحی مہمات کا چسکا
مشرق کو ہے مطلوب مہمات کی اصلاح

مبعوث کیا احمدِ مختار کو حق نے
جب دہر کو درکار تھی ہر بات کی اصلاح

ہر قول سے ہر فعل سے محبوبِ خدا کے
مقصود تھی انسان کے حالات کی اصلاح

خورشیدِ ہدایت جو بنا خُلقِ محمد
بس ہو گئی خود طرزِ ہدایات کی اصلاح

اے ترمذی! گو رحمتِ عالم ہیں خطا پوش
کچھ تُو بھی تو کر اپنی فضیحات کی اصلاح

وفا شعار کو تم نے یہ کیا کہا! گستاخ؛ — اگر یہ سچ ہے تو سوچو کہ کیوں ہوا گستاخ؛

حضور! کون سی ایسی خطا ہوئی سرزد — نیاز مند کو بھی آج کہہ دیا گستاخ!

خلافِ شانِ پیمبر زبان جو کھولے — وہ بے شعور ہے، بے شرم و بے حیا گستاخ

زباں دراز عدو ہو تو ٹھہرے خوش گفتار — کروں جو میں کبھی اظہارِ مدّعا! گستاخ

مجال کس کو تھی محفل میں لب کشائی کی — کسی کی چشمِ عنایت نے کر دیا گستاخ

جسے نہ خوفِ خدا ہو نہ ڈر بزرگوں کا — اُسے میں کہوں! بے باک، ڈھیٹ، گستاخ

حسین ابنِ علیؑ سر بکف مجاہد تھے — لڑے جو ان کے مخالف، تھے برملا گستاخ

دکھائی تیغ زنی کی وہ شان کربل میں — نہایا خوں میں جو سامنے ہوا گستاخ

خدا کے ہوتے ہوئے جراتِ سیہ کاری — کہاں ٹھکانہ جو کہہ دے مجھے خدا گستاخ

مرادِ آیہ "لا ترفعو....." فقط یہ ہے — کہ ہو سکے نہ کوئی پیشِ مصطفیٰؐ گستاخ

کہا جو میں نے کہ گستاخیِ عدو دیکھو — ستم شعار نے مجھ کو ہی کہہ دیا گستاخ

ولائے سرورِ دو عالم ہے جوہرِ ایمان — کمی ہو اس میں تو مسلم بھی پُرخطا گستاخ

وہ حشر میں نہ کہیں برہمی سے یوں کہہ دیں — کہ جاؤ تم بھی تو آخر ہوئے وفا گستاخ

نظر ہے رحمتِ احمدؐ پہ ترمذی! ورنہ
ہے تم سے بڑھ کے کوئی قابلِ سزا گستاخ

دل پہ کچھ ایسی آ پڑی اُفتاد ! / ضبط بھی اب ہے مائلِ فریاد

قیدِ غم کی بھی ہے کوئی میعاد / کب کھُلے گا قفس یہ اے صیاد

شوقِ پرواز جانبِ صیّاد / ہو چکا پھر تو آشیاں آباد

ہم ہیں برباد اور وہ نقّاد / کیا کریں اُس سے شکوۂ بیداد

ناسزا ہے یہ شکوۂ بیداد / عاشقی میں ہے کب روا فریاد

عشق ہی سوزِ جانِ پروانہ / عشق ہی ضربِ تیشۂ فرہاد

عشق سے جوہرِ خودی روشن / عشق پر ہے حیات کی بنیاد

عشق میں غم بھی ایک لذت ہے / گرچہ کہنے کو جمع ہیں اضداد

عشقِ صادق جفا جو سہتا ہے / سہتا جاتا ہے شاد یا ناشاد

غم کے چرکے کچھ اور کھا پھر دیکھ / کیسے ملتی ہے عاشقی کی داد

عشق بازی میں خوں بہا کیسا / "خونِ فرہاد برسرِ فرہاد"

جسم گو ہے مقیّدِ اسباب / قلبِ مومن ہے بے گماں آزاد

نورِ احمدؐ سے روز و شب روشن / ذکرِ حق سے ہے ہر زماں آباد

مردِ مومن کے رو برو ہے شَل / زورِ فرعون و طاقتِ شدّاد

دل ہو مومن تو شانِ شاہی بھی / اک کنیزک ہے پیشِ پا افتاد

دین و دنیا میں سرخرو ہو تم
حبِ احمدؐ سے گر ہے دل آباد

جس سر میں ہو سودائے محمدؐ وہی سر ڈھونڈ
جس در پہ دو عالم کی جبیں ہے وہی در ڈھونڈ

سرشار ہو جو عشق سے وہ قلب و نظر ڈھونڈ
پھر وقتِ سحر سوز کے نالوں کا اثر ڈھونڈ

ہے عشق جنوں خیز کوئی چارہ سر ڈھونڈ
یا سر کے جھکانے کو کسی شوخ کا در ڈھونڈ

حاصل تجھے ہو جائے گا عرفانِ خدا بھی
تو پہلے ذرا اپنی حقیقت کی خبر ڈھونڈ

جلووں کی تمنا میں یہ آشفتہ سری کیا
جلوے بھی سمٹ آئیں گے تو اپنی نظر ڈھونڈ"

تاریکیٔ ظلماتِ معاصی سے نہ گھبرا
وا ہے درِ توبہ کوئی رحمت کی سحر ڈھونڈ

مغرب کی نظر جاتی ہے بس شمس و قمر تک
تو خالقِ ایں کارگہِ شمس و قمر ڈھونڈ

اسرار کا مخزن ہے جو خود سینۂ مومن
تو حدِ مکاں سے بھی پرے اوجِ بشر ڈھونڈ

تھک ہار کے کیوں بیٹھ رہے مردِ مجاہد
مقصود کی دھن ہے تو ادھر ڈھونڈ، ادھر ڈھونڈ

بجلی کی شعاعوں نے دلِ ذرہ کو چیرا
جو بجلی کا دل چیر دے وہ نورِ نظر ڈھونڈ

اس دورِ پر آشوب میں آرام کہاں ہے؟
آرام سے رہنا ہے تو پتھر کا جگر ڈھونڈ

ہے پہلی تجلی پہ بچھا تختِ محمدؐ!
سمجھانے کو یہ راز کوئی اہلِ نظر ڈھونڈ

اُٹھ جائیں حجاباتِ مکانی و زمانی
ہاں آہِ سحرگاہ! ذرا اور اثر ڈھونڈ

تسکین میسر نہیں گر قلبِ حزیں کو
اللہ کا لے نام اور اللہ کا گھر ڈھونڈ

مطلوب تجھے ہے جو درِ قربِ خداوند
اے ترمذی! محبوبِ خداوند کا در ڈھونڈ

○

مستیٔ حال کر طلب قال کے جام سے گزر — عارفِ حق شناس بن علمِ کلام سے گزر

بادہ کشِ الست کو جام و سبو سے کیا غرض — کیف و سرورِ عشق میں نشّۂ عام سے گزر

باعثِ زندگی بھی ہے حاصلِ زندگی بھی ہے — حدِّ مقامِ عشق کیا! فکرِ مقام سے گزر

ترکِ سجود گر ہی ترکِ وجود آگہی — دین کا اک نظام ہے ترکِ نظام سے گزر

راہ میں ہے بچھا ہوا حرص و ہوس کا دام بھی — طائرِ شوقِ سرمدی! دانہ و دام سے گزر

چاند کا تذکرہ ہے کیا! عارضِ روئے مصطفیٰ — مطلعِ آفتاب ہے! ماہِ تمام سے گزر

مقصدِ جانِ ترمذی حُبِّ جنابِ مجتبیٰ
کام ہے اُن کے نام سے غیر کے نام سے گزر

○

ذاتِ پاکِ مصطفیٰ سے گر کسی کا دل ہے دُور — بارگاہِ کبریا کے قُرب کی منزل ہے دُور

مرحبا! خوش آمدی! اے جانِ عالم زندہ باش — تُو جو اب دل میں مکیں ہے میری ہر مشکل ہے دُور

عقل کو گر جستجوئے کیف و مستی ہے تو خیر! — ورنہ منزل تو کجا خود جادۂ منزل ہے دُور

محوِ "اقرب"، کہہ کے مالک آپ ہے نگرانِ حال — میرے پائے شوق کو پھر کون سی منزل ہے دُور

تیرہ شب، کشتی شکستہ، جوشِ طوفاں، زورِ موج — ناخدا بے دل، ہراساں قافلہ، ساحل ہے دُور

حق کی رحمت کی نظر سے ناخدا بنتی ہے موج — دامنِ رحمت نہ چھوڑو لاکھ گو ساحل ہے دُور

وا ہے ہر دم بابِ رحمت مالکِ جوّاد کا — شومیٔ قسمت! جو اُس در سے کوئی سائل ہے دُور

حکمِ "واسجد واقترب" ہے قُرب کا داعی مگر — قُربِ لاحاصل ہے یہ بھی سجدہ میں گر دل ہے دُور

ہے جبینِ شوق میری ہر قدم پر سجدہ ریز — ارضِ ایمن سامنے لیکن مری منزل ہے دُور

گو فدائے مجتبیٰ ہیں قلب و جانِ ترمذی
وائے محرومی! ابھی تک نسبتِ محفل ہے دُور

○

زندگی بدلی ہے بدلا ہے جہاں کا انداز
ہے بدستور مگر دردِ نہاں کا انداز

خامشی گو ہے مرے اشکِ رواں کا انداز
ہے جنوں خیز مگر دل کی فغاں کا انداز

شدتِ غم میں بھی لب اپنے سِلے رہتے ہیں
درد نے سیکھ لیا ضبطِ فغاں کا انداز

ترجماں دل کی ہیں خاموش نگاہیں اپنی
بے زبانی میں بھی آیا ہے زباں کا انداز

روزِ اوّل سے ہے یہ لوح و قلم کا مظہر
قلبِ انساں میں ہے کون و مکاں کا انداز

میں ہی محروم رہوں تیرے کرم سے ساقی
بندۂ در سے تغافل ہے کہاں کا انداز

عاشقی کوئی تجارت تو نہیں اے واعظ
دل کے سودے میں کہاں سود و زیاں کا انداز

ترمذی کھول کے دل آہ و فغاں بھی کرلے
اُن کو مرغوب ہے اب تیری فغاں کا انداز

○

کتنا شیریں ہے محمدؐ کی زباں کا انداز
موہ لیتا ہے دل و جان بیاں کا انداز

رُوئے انور پہ عیاں حُسنِ زماں کا انداز
قلبِ اطہر میں نہاں دردِ جہاں کا انداز

ابتدا کی تھی جہاں عشق نے مے نوشی کی
یہ تری مست نگاہی ہے وہاں کا انداز

پیکرِ حُسنِ ازل، ختمِ رُسل، نورِ اتم
تیری ہر شان میں یکتائی شان کا انداز

مرجع و مرکز و محور ہو تمہیں خلقت کے
جسمِ عالم میں ہو تم روح و رواں کا انداز

عقلِ کل، جود و کرم، صدق و صفا، خلقِ عظیم
یہ محاسن ہیں ترے نام و نشاں کا انداز

شانِ مغفوری فدا تیرے غلاموں پہ بھی
جن کے فرمان میں ہے دَورِ زماں کا انداز

زندگی صدقہ تمہارا ہے فدا بھی تم پہ
فکرِ نعت ہے مرے ہدیۂ جاں کا انداز

ترمذی درد سے بے چین ہے جانِ عالم!
دل کے پردوں میں ہے اِک برقِ تپاں کا انداز

○

○

رہتا ہے جب خیال ترا دل کے آس پاس — تو بھی مکینِ دل رہے دل کی ہے التماس

چمکی ضیا نے نور سے آغوشِ آمنہ — طاری بتوں پہ ہو گیا اک لرزۂ ہراس

یعنی ظہورِ احمدِ ختم الرسل ہوا — انسان کو عطا ہوا توحید کا لباس

خلقِ خدا کا محسنِ اعظم عیاں ہوا — واجب ہوا ہے خلق پہ صد سجدۂ سپاس

نورِ نبیؐ سے ہو گئیں کافور ظلمتیں — راس آ گئی جہان کو ماہِ عرب کی راس

فیضانِ مصطفےٰ تھا کہ اُن کے غلام بھی — روشن ضمیر و عادل و حق گو و حق شناس

ہے آفتابِ حسن رُخِ انورِ حضورؐ — یہ مہرِ حسنِ ذات کا ہے مہرِ انعکاس

عرفان ہے تو دیکھ یہی صورتِ جمیل — آئینۂ جمال ہے حسنِ ازل کے پاس

ناآشنائے جلوۂ جاناں ہے تو اگر — "میرا تو کچھ قصور نہیں اے نگاہِ یاس"

ہر لحظہ تو ہے چشمِ تصور کے سامنے — بجھتی نہیں ہے پھر بھی تری دید کی پیاس

تیرے حریمِ ناز کو وہ پا سکے کہاں — واماندہ راہ میں ہے مرا طائرِ قیاس

قربان تیرے نام پہ ہے جانِ ترمذی
قائم تری ولا پہ ہے ایمان کی اساس

○

○

رہتا ہے مرے دل میں بھی اک ماہ جبیں خاص — دل ہے جو مکاں خاص تو ہے اُس کا مکیں خاص
اک نور ہُوا ظاہر و باطن متشکل ! — عالم کو نظر آیا محمدؐ سا حسیں خاص
ہے موردِ انوار درِ روضۂ اقدس — "جھکتی ہے جو اُس در پہ وہ ہوتی ہے جبیں خاص"
کیا تجھ سے کہوں شانِ دل و جانِ محمدؐ — ہیں دونوں یہ اسرارِ حقیقت کے امیں خاص
دل جلوہ گہِ نورِ خداوندِ دو عالم — جاں مرکزِ انوارِ سماوات و زمیں خاص
وہ ختمِ رُسل، نورِ ہدا، نُورِ مجسّم — وہ سیّدِ عالم وہ شہِ دینِ متیں خاص
وہ جانِ وفا، شانِ کرم، پیکرِ رحمت — وہ خاتمِ اخلاق و محاسن کے نگیں خاص
وہ ماہِ عرب، مہرِ عجم، نیّرِ اعظم — تنویرِ دو عالم کے لئے نورِ مبیں خاص
روشن ہے رُخِ شمس و قمر اُن کی ضیا سے — کونین کی محفل میں وہی صدر نشیں خاص
محبوبِ خدا بھی ہیں وہ مختارِ خدا بھی — ہے سلطنتِ کون و مکاں زیرِ نگیں خاص
ہے نقشِ کفِ پائے محمدؐ سے مشرّف — مقصودِ دو عالم ہوئی یثرب کی زمیں خاص
فیضانِ محمدؐ تھا کہ اوامِ جہاں میں — صحرا کے مکیں بن گئے افلاک نشیں خاص
شانِ درِ محبوبِ خدا کس سے بیاں ہو — دربانِ جہاں ہوتا ہے جبریلِ امیں خاص
جُرموں کو مرے رحمتِ احمدؐ نے اماں دی — یہ رحمتِ یزداں ہے اماں خاص امیں خاص
محبوب تو محبوب ہیں نعلین بھی اُن کے — کس شان سے جاتے ہیں سرِ عرشِ بریں خاص

صد شکر ہُوا جنتِ دلِ ترمذی روشن
وہ رشکِ قمر جب سے ہوئے دل کے مکیں خاص

○

○

رونقِ بزم ہے اب جلوۂ جاناں کا چراغ
رشکِ صد شمع ہے اُن کے رُخِ تاباں کا چراغ

ظلمتیں نفس کی بن جائیں نہ رہزن خود ہی
حق نے بخشا ہے ہمیں قلبِ فروزاں کا چراغ

عشق کے راہ نوردوں کی رفاقت کے لئے
ہے شبِ تار میں روشن دلِ سوزاں کا چراغ

رُوئے احمدؐ کا تصوّر ہی اسیری میں مری
آکے بن جاتا ہے تاریکیٔ زنداں کا چراغ

ہٹ گیا جب بھی کبھی رُوئے منوّر سے نقاب
رُوکشِ مہر ہُوا حُسنِ فروزاں کا چراغ

درد بھی ایک عنایت ہے تمہاری آقا
ہدیۂ چشمِ کرم ہے دلِ سوزاں کا چراغ

ہے جو پروانہ دلِ ترمذیؔ سوختہ جاں
شمعِ پروانہ ترے روئے درخشاں کا چراغ

○

عشقِ احمدؐ ہے زندگی کا چراغ
دین و دنیا کی سروری کا چراغ

آگہی گر ہو بندگی کا چراغ
بندگی خود ہو خواجگی کا چراغ

غم شرارِ حیاتِ قلبِ تپاں
"غم سے روشن ہے زندگی کا چراغ"

عشق باطن میں ہے طلسمِ حیات
حُسن ظاہر میں زندگی کا چراغ

عشق ساماں ہے ذرّہ ذرّہ یہاں
ذرّہ ذرّہ ہے دلبری کا چراغ

چشمِ بینا سے گر ہو سیرِ چمن
پتّا پتّا ہے آگہی کا چراغ

ہر قدم پر ہے سجدہ ریز جبیں
نقشِ پا بھی ہے رہبری کا چراغ

قلبِ مومن کی زندگی کے لئے
حُبِّ احمدؐ ہے روشنی کا چراغ

ترمذیؔ بہرِ رزمگاہِ حیات
دل میں روشن ہو آگہی کا چراغ

○

نہ رُخ مکاں کی طرف ہے نہ ہے زماں کی طرف
نظر ہے اپنی فقط ربِ دو جہاں کی طرف

دلِ فقیر کی پرواز نہ فلک سے ورا
وہ دیکھتا ہی نہیں حدِ لا مکاں کی طرف

شغف نہ دیر و حرم سے نہ شیخ جی سے غرض
جبینِ شوق رہی اُن کے آستاں کی طرف

کلی کلی ہے فسردہ ہے پتّہ پتّہ اداس
"رُخِ بہار نہیں صحنِ گلستاں کی طرف"

کرشمہ یہ بھی ترے تیرِ نیم کش کا ہے
نگاہِ گرم ہے کیوں قلبِ نیم جاں کی طرف

مری جبیں کو ترے نقشِ پا کی حسرت ہے
ادب سے راہ میں جھکتی ہے ہر نشاں کی طرف

کلامِ نزہتیؔ گر ہے نکات سے لبریز
رُخِ سخن بھی ہے یارانِ نکتہ داں کی طرف

○

اُٹھی جو رحمتِ حق کی نظر جہاں کی طرف
رُخِ بہار رہا ارض و آسماں کی طرف

ہوئی زمین مشرف قدومِ احمدؐ سے
پیامِ زندگی لائے وہ اِنس و جاں کی طرف

حبیبِ خاصِ خداوند و والیِ کونین
نگاہِ لطف رہی اُن کی دو جہاں کی طرف

وہ بن کے رحمتِ پروردگار ہم میں رہے
مشامِ روح تھا گو قدسِ لامکاں کی طرف

خدا کے بندوں کو توحید کا سبق دے کر
دکھائی راہ اُنہیں وادیٔ اماں کی طرف

دلوں کو اپنی محبت سے کر دیا زندہ
اٹھایا خاک نشینوں کو آسماں کی طرف

بنائے عزت و تکریم بن گیا تقویٰ
بڑھے غلام بھی فغفوریٔ جہاں کی طرف

بہار بن کے وہ آئیں تو کس طرح یہ کہوں
"رُخِ بہار نہیں صحنِ گلستاں کی طرف"

خوشا نصیب! اگر نزہتیؔ وہ جانِ جہاں
نظر اٹھائیں کبھی مجھ شکستہ جاں کی طرف

○

قرآں کا نور آیا ہے بن کر نوائے حق
"گونجی ہے آسماں سے زمیں تک صدائے حق"

مسلم کا قال نعتِ نبیؐ و ثنائے حق
مسلم کا حال خُلقِ محمدؐ ادائے حق

مطلوب ہے ولائے محمدؐ ولائے حق
مقصود ہے رضائے محمدؐ رضائے حق

ہے آفتابِ زندگی وہ دلربائے حق
محبوبِ کائنات ہے وہ مہ لقائے حق

وہ تاجدارِ انبیا وہ ختمِ مرسلیں
وہ انتخابِ خَلق ہے وہ مدعائے حق

تھی ذاتِ حق خزانۂ مخفی قدیم سے
یہ مصطفٰےؐ تھے جو کہ ہوئے درکشائے حق

عشقِ نبیؐ ہے جنتِ فردوس کی کلید
عشقِ نبیؐ ہے ہدیۂ شوقِ لقائے حق

مثلِ حسینؑ شوقِ شہادت کی سرخوشی
ہے بندگانِ خاص پہ چیدہ عطائے حق

باطل سے کب دبیں گے وہ جانباز و سرفروش
مقصودِ زندگی ہے جنہیں بس رضائے حق

حق گو حق پرست ہیں اور حق طلب ہیں ہم
لڑتے بھی ہیں تو لڑتے ہیں زیرِ لوائے حق

فکرِ شکست و فتح سے بالا ہے عزمِ دل
ہم ہیں کفن بدوش تو بہرِ رضائے حق

اے ترمذی رضائے محمدؐ پہ رکھ نظر
لاریب ہے رضائے محمدؐ رضائے حق

عشق سے دل جو داغدار نہیں　　حسنِ فطرت سے ہمکنار نہیں

مے فشاں گر نگاہِ یار نہیں　　توبہ! پھر ہم بھی بادہ خوار نہیں

ہو نہ سرشارِ عشق سے جب تک　　آدمی کا کوئی وقار نہیں

توبہ دل نے جو عشق سے کر لی　　"دلِ ناداں پہ اعتبار نہیں"

حسنِ سیرت ہی شمعِ محفل ہے　　شکل و صورت کا اعتبار نہیں

حسن مستورِ نورِ ارض و سما　　جلوہ انگلن ہے آشکار نہیں

نور سے نور گر نہ ہو واصل　　کسی منزل کا اعتبار نہیں

نحنُ اقرب" میں راز ہے مضمر　　بے خبر ہے جو راز دار نہیں

بخدا آپ ہے وہ سرِ بشر　　کیا بشر سرِ کردگار نہیں

شانِ محبوبِ حق سے بالاتر　　کوئی قدرت کا شاہکار نہیں

وہ ہیں ختم الرسل کہ بعد اُن کے　　کسی مرسل کا انتظار نہیں

جلوہ فرما ہیں تختِ دل پر وہ　　اُن سا کوئی بھی تاجدار نہیں

بات جو اُن کے ہاں قبول نہیں　　قابلِ نظرِ کردگار نہیں

زندگی اُس پہ ایک تہمت ہے　　مصطفےٰ پر جو جاں نثار نہیں

عشقِ احمدؐ میں جان دی جس نے　　اُس کو کوئی بھی اضطرار نہیں

شکوۂ درد ترمذی! کیسا

دردِ دل کیا عطائے یار نہیں!

اِک نظر کی آرزو میں ہے جہانِ آرزو" — خودگستاخی ہے اب فکرِ بیانِ آرزو!

اور کیا ہو مختصر میرا بیانِ آرزو — "اک نظر کی آرزو میں ہے جہانِ آرزو"!

تھا جہاں پہلو میں میرے اِک جہانِ آرزو — اب وہاں ہے داغِ حسرت نوحہ خوانِ آرزو

بات مانیں یا نہ مانیں آپ کو ہے اختیار — بندہ پرور سُن تو لیجیے داستانِ آرزو

کیا تسلّی دشت میں ہو نقشِ پائے قیس سے؟ — کس کو کچھ اُمید! بعد از امتحانِ آرزو

بےکسی میں حالِ دل کہنے کی طاقت ہے کسے؟ — بے زبانی ہی مری ہے ترجمانِ آرزو

ہے انہیں کے دم قدم سے آبروئے زندگی — زندۂ جاوید ہیں یہ کشتگانِ آرزو

جوشِ وحشت، آہِ سوزاں، دردِ پیہم، نیشِ غم — یاد ہے ہم کو بہارِ گلستانِ آرزو

عرش و کرسی و زمین و آسماں لوح و قلم — ہیں ازل سے سب کے سب منّت کشانِ آرزو

داغِ حسرت بھی ہے سینے سے لگا رکھنے کی چیز — حشر کو شاید وہ دیکھیں یہ نشانِ آرزو

بے گماں ہیں دونوں عالم میں جنابِ مصطفےٰ! — میری جانِ آرزو میرا جہانِ آرزو

ترمذی ایس اور کیا مانگیں درِ اقدس پہ ہم

"اک نظر کی آرزو میں ہے جہانِ آرزو"

شاعرہ وحید

نام ناصرجہاں بیگم، قلمی نام شاعرہ وحید، تخلص شاعرہ۔ آپ کے جدِ امجد خواجہ میر درد علیہ رحمتہ تھے۔ آپ کے بزرگوں میں سب سے پہلے معروف شاعر آپ کے پر دادا خواجہ عندلیب تھے۔ خواجہ میر درد، میر اثر ان ہی کی نسل سے ہوئے۔ اس خاندان کی سکونت پشت ہا پشت سے دہلی میں رہی۔ چنانچہ شاعرہ وحید بھی ۱۹۲۷ء میں خواجہ میر درد علیہ رحمتہ کی بارہ دری، کوچہ چیلان میں پیدا ہوئیں۔

شاعرہ وحید کے بزرگ اقتدار اور دولت مندی کی وجہ سے ملازمت یا محنت کو بنظرِ حقارت دیکھتے تھے۔ گھر سے الگ تھلگ مہمان خانے میں ان کا دیوان سجا رہتا۔ فرش پر عمدہ قالین بچھے ہوتے جن پر سلیقے سے گاؤ تکیے لگے رہتے۔ چاندی کے چمکتے ہوئے حقے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر دھرے ہوتے۔ ملازم زعفران آمیز تمباکو سے حقہ تازہ کر کے مہمانوں کے سامنے رکھتے۔ مہمانوں میں شہر بھر کے شرفا، سخن فہم اور ادبا و شعرا جمع ہوتے۔ پورا مہمان خانہ خوشبوؤں سے مہک جاتا۔ شعر پر شعر ہوتے اور داد کے ڈونگرے برستے۔ رات یونہی گذر جاتی۔ دن کو گیارہ بارہ بجے تک سویا جاتا پھر معمولات سے فارغ ہو کر احباب کے ساتھ چوسر — یا ستار وغیرہ کا شغل شروع ہو جاتا اور صبح سے شام ہو جاتی۔

یہ تھا وہ ماحول جس میں شاعرہ وحید نے آنکھ کھولی۔ شعر خوانی اور واہ واہ کا شور ننھی منی شاعرہ وحید کو پسند آتا اور یہ بھی ان لوگوں کی نقلیں اتارنے لگیں اور ہر بات اسی طرز اور اسی انداز میں کہنے کی کوشش کرتیں۔ اس وقت ان کی عمر چھ سات برس کی تھی۔ وہ لوگ ان کی ان حرکات پر خوش ہوتے اور نواز رخود ان کے والد صاحب ناصر وحید اس سلسلہ میں ان کی بہت حوصلہ افزائی کرتے وہ انہیں مہمان خانے میں لے جاتے اور مہمانوں کو ان کی توتلی زبان سے شعر سنواتے اور سارا مہمان خانہ واہ واہ کے شور سے گونج اٹھتا پھر وہاں کا ہر اہلِ مجلس ان کا نام لینے کے بجائے انہیں شاعرہ کہہ کر مخاطب کرنے

لگا ۔ اور خود دل میں بھی شاعرہ ہی کہلوانے میں خوشی محسوس ہونے لگی ۔ ایک روز حاضرین میں سے ایک شاعر نے ازراہِ مزاح کہہ دیا تم نقل خوب اتارتی ہو ۔ شاعرہ وحید کو یہ بات ناگوار گزری اور منہ بسور کر کہا میں تو شاعرہ ہوں ۔ وہ کہنے لگے "شاعرہ اسے کہتے ہیں جو دوسروں کی نقلیں اتارنے اور دوسروں کے شعر سنانے کے بجائے خود شعر کہے ۔ یہ بات تم میں نہیں" ۔ اس سے شاعرہ وحید کو سخت صدمہ ہوا اور دو تین وقت کھانا نہیں کھایا انہیں اب یہی دھن تھی کہ خود شعر کہیں ۔ اگرچہ یہ نہیں جانتی تھیں کہ شعر کیا ہوتا ہے اور کس طرح کہا جاتا ہے ۔ جب شعر نہ ہو سکے اور بھوک بھی بہت ستانے لگی تو رونے لگیں یہاں تک کہ سسکیاں بھرتے سو گئیں ۔ صبح آنکھ کھلی تو مسہری کے پاس والد صاحب اور ایک طبیب بیٹھے تھے ۔ بات یہ تھی کہ شاعرہ وحید کو غم سے بخار ہو گیا تھا ۔ والد صاحب نے انہیں کچھ کھلانے کی کوشش کی یہ بپھر اکڑ گئیں اور روتے ہوئے کہا نہیں کھاؤں گی ۔ اگر شعر نہیں کہہ سکی تو یونہی مر جاؤں گی ۔ والد صاحب پھڑک اُٹھے ۔ گود میں اٹھا کر کہنے لگے اور کس طرح شعر کہے گی ؟ تونے تو شعر کہہ بھی دیا اور پہلا مصرع تو وزن میں بالکل پورا ہے ۔ پھر طبیب سے مخاطب ہو کر کہا "بخدا یہ ضرور شاعرہ بنے گی" اور ساتھ ہی دہرانے لگے ۔

ع نہیں کھاؤں گی کچھ نہیں کھاؤں گی ۔

شاعرہ وحید کی ابتدائی شاعری اساتذۂ قدیم کے انداز کی تھی ۔ اُس وقت دلّی کے کوچہ و بازار حضرتِ داغ کے کلام سے گونج رہے تھے ۔ مجلسِ سماع ہو یا طوائف کا مجرا ۔ کوئی ادبی محفل ہو یا کھلنڈروں کا اجتماع ۔ داغ ہر رنگ میں جلوہ آرا ہوتے تھے ۔ ممکن نہ تھا کہ یہ داغ کا اثر قبول نہ کریں چنانچہ آپ کے ابتدائی کلام پر داغ کا رنگ غالب رہا ۔ لیکن اس روش اور اس انداز کی شاعری سے یہ بہت جلد اُکتا گئیں ۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ انہیں جن حالات سے دوچار ہونا پڑا ان سے ان کی طبیعت میں ہر چیز سے بغاوت کا رجحان پیدا ہو گیا ۔ زندگی کی تلخیوں نے آپ کی شاعری کا ایک نیا رُخ متعین کر دیا ۔ آپ نے استادی شاگردی اور مروجہ طریقوں کی پیروی کو بھی اپنی طبیعت کے خلاف محسوس کیا اور جو کچھ کہا خود اعتمادی سے کہا ۔ نہ کسی کو دکھایا نہ مشورہ لیا ۔

تقسیم ہند کے بعد اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ پاکستان آئیں ۔ اور یہاں عرصہ دراز تک نثر و نظم لکھتی رہیں پھر لاہور میں "قدر اکادمی" کے نام سے ایک اشاعتی ادارہ قائم کیا اور اپنا مجموعہ کلام "شکستِ ساز سے پہلے" خود ہی شائع کیا ۔ مجموعہ کلام کے بعد کئی افسانے، ناول اور ڈرامے لکھے ۔ ایک ڈرامہ "جشنِ فرہاد" حال ہی میں شائع ہوا ہے ۔ آپ انہیں اپنی ادبی زندگی کا ماحصل سمجھتی ہیں ۔ قدر اکادمی کی مطبوعات حسنِ ذوق کا آئینہ ہوتی ہیں ۔ محترم عبدالرشید صاحب مہتمم صدر انجمن ترقی ادب ماڈل ٹاؤن کے افسانوں کا مجموعہ "دوست اور دشمن" اسی اکادمی نے شائع کیا ہے ۔

ہوتا ہے اس جہاں میں کسے ناگوار جھوٹ — جب سچ ہوا ذلیل تو عالی وقار، جھوٹ
تہذیبِ نو کا شاعرہ ہے شاہکار جھوٹ — بے اختیار سچ ہوا، با اختیار، جھوٹ
کتنا حسین فریب ہے پروردگار جھوٹ — جانِ قرار جھوٹ ہے، جانِ بہار جھوٹ
یہ صبح و شام جھوٹ، یہ لیل و نہار جھوٹ — سارا ہی زندگی کا ہے اب کاروبار جھوٹ

بنتی نہیں ہے بات بھی سچ بات کے لئے — جب تک نہ بولا جائے یہاں بار بار جھوٹ
یوں سچ بھی دے رہا ہے یہاں جھوٹ کو خراج — سچ بات کے لئے بھی کرو اختیار، جھوٹ
اپنی وفا کے لاکھ دئیے تو نے گو فریب — تیری نظر سے ہو ہی گیا آشکار جھوٹ
اب منزلِ وفا کا بھروسا نہیں رہا — اے عشق بن گئی ہے تری رہگزار جھوٹ

سچ ہی کا بول بالا رہا شاعرہ سدا
سچ پائیدار ہی رہا، ناپائیدار جھوٹ

○

بُری نہیں ہے اگرچہ تمہارے پیار کی بحث
نہ آئی راس کسی کو بھی بار بار کی بحث

جنون و وحشت و وارفتگی کے متوالو
عبث ہے آج محبّت کے اعتبار کی بحث

ہر اک مقام پہ شاکی ہے آدمی کی نظر
نہ راس آئی تجسّس کے کاروبار کی بحث

وہ لوگ چاند ستاروں کو چھو کے لوٹ آئے
جنہیں قبول نہ تھی شوقِ مستعار کی بحث

نہ اُلجھیں کس لئے نظمِ جہاں سے اہلِ خرد
اُلجھ گئی ہے تری زلفِ مشکبار کی بحث

نظر کے سامنے اب ہیں حقائقِ ہستی
زمانہ چھوڑ رہا ہے تمہارے پیار کی بحث

وہی جہاں میں ہے رفتارِ وقت کا محرم
جسے عزیز نہیں عشقِ تابکار کی بحث

بہار آئی بھی اے شاعرہ چلی بھی گئی
نہ ختم ہو سکی آزردہ بہار کی بحث

○

○

خوش آگیا زمانے کو دردِ نہاں کا رقص — ہے زیست کے جلو میں مری داستاں کا رقص
سمجھا ہے اک جہاں جسے دورِ زماں کا رقص — ممکن ہے یہ بھی ہو کسی آتش بجاں کا رقص
ہوگا کبھی تو ختم دلِ ناتواں کا رقص — مدت سے میرے لب پہ ہے آہ و فغاں کا رقص
دیکھا تھا جس نگاہ نے تیغ و سناں کا رقص — حیرت سے دیکھتی ہے وہ دورِ زماں کا رقص

تاریکیوں میں ڈوب نہ جائے شعورِ زیست — ارزاں ہے آج گیسوئے عنبر فشاں کا رقص
یا توڑ اس حصار کو یا خود حصار بن — اے عشق یوں نہ دیکھ غمِ دو جہاں کا رقص
رنگینیٔ جمال سے فرصت جو ہو کبھی — دیکھو رخِ حیات پہ اشکِ رواں کا رقص
جس شہرِ آرزو میں چراغاں نہ ہو، وہاں — کیسی خوشی، کدھر کی مسرت، کہاں کا رقص
تو میرے ساتھ ساتھ نہ چل اے غمِ حبیب — میرے تو ہم رکاب ہے سود و زیاں کا رقص

تم بھی چلو تو شاعرہ لے کر کوئی غزل
بزمِ سخن میں آج ہے لطفِ بیاں کا رقص

○

اے زلیخائے وطن، تُو ہے دل و جاں کی متاع
ماہِ کنعاں جس طرح تھا قلبِ کنعاں کی متاع

اے وطن، میرے وطن، خونِ شہیداں کی متاع
غازیانِ سرکبف، ارضِ رجز خواں کی متاع

تجھ سے قائم ہے نگارانِ بہاراں کا بھرم
تیری طلعت ہے ہر اِک قلبِ فروزاں کی متاع

رُوح کی گہرائیوں میں ضو فگن تیرا جمال
تیری چاہت بن گئی ہے اب دل و جاں کی متاع

کس قدر جاں سوز تھے تیری طلب کے مرحلے
کس قدر پیاری تھی لیکن تیرے ارماں کی متاع

کس قدر ارزاں ہوا تھا تیرے پروانوں کا خوں
کتنی بے حرمت ہوئی تھی دین و ایماں کی متاع

کفر دستک دے رہا ہے پھر درِ اسلام پر
بڑھ گئی ہے آج پھر خطرے میں قرآں کی متاع

آج پھر تیغِ اَجل کفّار پر لہرائے گی
آج پھر تاریخ اپنے آپ کو دوہرائے گی

○

غم کا کس طرح مداوا ہو سکا　　موت آئی بھی تو پھر کیا ہو گا

معتبر پہلے نہ تھا ذوقِ نظر　　آپ کو درد میں پایا ہو گا

راس آ جائے جسے محرومی　　کون اُس دل کا مسیحا ہو گا

یہ نگاہیں ہیں کہ بے ساختہ پن　　پھر جو دیکھو گے تو چرچا ہو گا

خلوتِ غم میں کہاں نازِ جمال　　صرف احساس کا جھونکا ہو گا

بزم میں گو نہ اُٹھی مجھ پہ نظر　　تم نے غیروں سے تو پوچھا ہو گا

اک اُچٹتی سی نظر ہی ڈالو　　درد کا کچھ تو مداوا ہو گا

شاعرہ صبحِ ازل سے پہلے
کس کو اللہ نے چاہا ہو گا

○

عشق کی آنچ سے جو فکر نمایاں ہو گا　　پیکرِ زیست میں ڈھل جائے تو انساں ہو گا

رُوح سے ربط ہے گر میرے خلوصِ فن کو　　موت کے بعد بھی احساس غزل خواں ہو گا

بھیگ جا اور بھی پلکوں کے ستارے پی کر　　مجھ پہ احساں یہ ترا اے شبِ ہجراں ہو گا

یہ ضیا بار دھندلکے ہیں نظر کی تقدیر　　قلبِ ہستی میں بھلا کیسے چراغاں ہو گا

موت کے گھاٹ اُتر جاتی ہے ہر موجِ نفس　　اور کیا اس کے سوا عالمِ امکاں ہو گا

خلوتِ روح میں جو حسن ہے جلوت میں کہاں　　جاں سے گزریں تو نظارۂ جاناں ہو گا

یاں ترے غم کو کروں دل سے جدا تو کیسے　　یہ تو وہ غم ہے جو ہر دل میں فروزاں ہو گا

زندگی ڈھلنے لگے شاعرہ، جب آہوں میں
عرصۂ زیست میں کس طرح چراغاں ہو گا

○

○

دیدہ و دل کے بیاباں نہیں دیکھے جاتے — بت کدے شوق کے ویراں نہیں دیکھے جاتے

جن کو کانٹوں میں بھی آتا ہے نظر حسنِ بہار — اُن سے پھولوں کے گریباں نہیں دیکھے جاتے

جذبۂ عشق! نہ کر فاش غمِ مہجوری — مُنفعل تارِ رگِ جاں نہیں دیکھے جاتے

اے خدا تُو نے نظر دی ہے تو تعبیر بھی دے — ہم سے اب خوابِ پریشاں نہیں دیکھے جاتے

اے نزیگل کے تمنائی - بڑھا لفتِ نظر — کیا خزاؤں میں گلستاں نہیں دیکھے جاتے

جشنِ فریاد رہا خلوتِ دل تک محدود — ہم سے پلکوں کے چراغاں نہیں دیکھے جاتے

وہ مری فکر میں اے شاعرہ روشن ہیں سدا
جو ستارے سرِ مژگاں نہیں دیکھے جاتے

○

دل جب احساس کے پیمانے میں ڈھل جاتا ہے — زندگانی کا ہر انداز بدل جاتا ہے

عمر بھر بھٹکا ہوا رہتا ہے انساں کا شعور — موت نزدیک جب آتی ہے سنبھل جاتا ہے

عشق کو مہلتِ اظہارِ تمنا بھی نہیں — شمع جس کے لیے روتی ہے وہ جل جاتا ہے

غم ہر انساں کے تعاقب میں ہے سائے کی طرح — یہ وہ جادو ہے جو ہر چیز پہ چل جاتا ہے

کسی انساں کو مل جاتا ہے جب محورِ غم — گردشِ وقت کی سرحد سے نکل جاتا ہے

جھوٹے وعدوں پہ بھی جی لیتا ہے احساسِ وفا — کتنا ناداں ہے کھلونوں سے بہل جاتا ہے

اعتبارِ غمِ ہستی نہ کرو ـــــ دل والو — رنگ کی بات ہی کیا رنگ بدل جاتا ہے

کس قدر خام ہے اے شاعرہ معیارِ وفا
وقت کے ساتھ ہی انسان بدل جاتا ہے

○

صاحبزادہ محمد امیر حمزہ شامی

گیارھویں صدی ہجری کے سر برآوردہ صوفیائے کرام میں حضرت عبدالغنی شامی ایک عظیم المرتبت بزرگ
تھے آپ نقشبندی مجددی سلسلہ سے تھے ۔ تاج العارفین کے لقب سے معروف اور اپنے زمانے کے اقطاب
میں شمار ہوتے تھے ۔ اُن کے اخلاف کے مختلف گھرانوں میں مذہب و تصوف اور شعر و ادب کا چرچا
پیوستہ رہا ہے ۔ صاحبزادہ محمد امیر شامی اسی خاندان کے ایک علم دوست اور متمول گھرانے میں ۶ جولائی
۱۹۰۰ء کو پیدا ہوئے ۔ جب آپ نے ہوش سنبھالا تو آپ کے گھر میں اگر ایک طرف خاندانی روایات کے
عین مطابق مذہب و تصوف کا نمایاں اثر اور شعر و ادب کا چرچا تھا تو دوسری طرف آپ کے والد کی
سرکاری ملازمت کے افسرانہ تقاضے سے لباس، طرزِ رہائش، بود و باند پر مغربیت بھی اثر انداز تھی ۔
آپ کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی اور چوتھی جماعت سے باقاعدہ سکول میں داخل کئے گئے ۔ اس کے بعد
یہاں آپ کی باضابطہ تعلیم اعلیٰ مدارج تک انگریزی نظام کے تحت سکول اور کالج میں ہوئی وہاں خاندانی
روایات اور گھر کی فضا کے اثر سے مذہب و تصوف اور شعر و ادب کا ذوق پیدا ہوا ۔ سکول اور کالج کی
تعلیم میں انگریزی، ریاضیات اور سائنسی علوم پر زور اور گھریلو اثرات سے طبیعت مشرقیت کا رنگ قبول
کرتی رہی ۔ جلد ہی مطالعے کے شوق نے نصابی کتابوں کے دائرے سے باہر قدم نکالا ۔ عربی، فارسی، اردو
اسلامیات، فلسفہ اور دیگر علوم میں معلومات نجی تحصیل اور ذاتی مطالعے سے حاصل ہوتی رہیں ۔
آپ نے سب سے پہلے شعر اُس وقت کہا جب آپ میٹرک کے طالب علم تھے ۔ اُس وقت تک
آپ اردو، فارسی شعرا کے کلام کا کافی مطالعہ کر چکے تھے ۔ چنانچہ شعر گوئی شروع کی تو اساتذہ

کا کلام ہی آپ کی رہنمائی کرتا رہا اور آپ اردو، فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے رہے۔

اردو شعرا میں آپ کو سب سے زیادہ غالب اور اقبال پسند رہے ہیں اور ان ہی کا کلام آپ نے بالاستیعاب مطالعہ بھی کیا ہے۔ باقی شعرا کا کلام جستہ جستہ پڑھا۔ جو شاعر کسی وقت زیر مطالعہ ہوتا اس کے رنگ میں شعر کہنے کی کوشش کرتے لیکن درحقیقت غالب اور اقبال کی فارسی آمیز اردو سے آپ کو طبعاً زیادہ لگاؤ تھا۔ غالب کا کلام آپ کو اتنا پسند تھا کہ آپ غالب کے طرز بیدل والے اشعار کے تتبع میں بھی اشعار کہتے رہے۔

صاحبزادہ شامی صاحب نے ہر صنفِ کلام میں طبع آزمائی کی ہے۔ غزل قصیدہ، رباعی، ترکیب بند مثنوی، نظم یہاں تک کہ آزاد شاعری میں بھی ایک آدھ تجربہ کیا ہے۔ طویل چیزوں میں تقسیم ہند سے پہلے کی دو نامکمل مثنویاں "ختم نبوت" اور "بہار نامہ" قابلِ ذکر ہیں جو، ۴۷ ۱۹ء کے فسادات میں آپ کی لائبریری کی دوسری کتب کے ساتھ ضائع ہو گئیں۔

آپ مشاعروں میں بہت کم جاتے ہیں۔ اپنی ذہنی کاوشوں میں آپ علمی اور تحقیقی کام کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس سلسلہ میں آپ خاصا کام کر چکے ہیں۔ اور شائع ہونے والے کافی مسودات آپ کے پاس موجود ہیں۔

○

اب نہیں رسمِ وفا سے اہلِ دنیا آشنا — اپنے بیگانے ہوئے ہیں آشنا نا آشنا

ہائے اندازِ تغافل ہائے استغنائے حسن — آپ تو ہم سے کبھی تھے ہی نہ گویا آشنا

چشمِ وا، دلِ مضطرب، آغوش رہینِ انتظار — ہے مری ہستی کا ہر ہر جزو تمنا آشنا

حسن سرکش، عشق آوارہ، ہوس مطلب پرست — وحشت آبادِ جہاں میں کون کس کا آشنا

کیا کیا مجنوں نے آخر خاک اڑانے کے سوا — ہے مآلِ جوشِ وحشت سے بھی دنیا آشنا

پرتوِ خور سے ہے لرزاں قطرۂ شبنم کا دل — خود فنا آمادہ و فطرت تماشا آشنا

دل ہمارا ہی سہی اب اُن سے کیا مانگیں گے ہم — آشنا سے کیا کرے آخر تقاضا آشنا

سبزہ پامالِ صبا، شبنم سے تر دامانِ گل — کس طرح کہیے ہے وہ بیگانہ یہ ناآشنا

اُس وفا دشمن کو شاؔکی آشنا کہتے ہو تم
جو وفا ناآشنا ہو وہ بھی کیا آشنا

دلِ برباد غبارِ رہِ خوباں نہ ہوا — لُٹ گیا مال ہمارا مگر ارزاں نہ ہوا

ہے سوا زہد کے بھی اور بہت کچھ درکار — بن گیا شیخ فرشتہ مگر انساں نہ ہوا

دلِ حسرت زدہ داغوں سے ہوا باغ و بہار — ہے یہ وہ شہر کہ اُجڑا بھی تو ویراں نہ ہوا

دل دیا اور نہ مانگی نگہِ لطف کی بھیک — میں ترا ہو کے بھی شرمندۂ احساں نہ ہوا

خاک بھی شاؔکی کی بتخانے کے باہر نہ گئی
یہ وہ کافر ہے کہ مر کے بھی مسلماں نہ ہوا

حسنِ عریاں ہے عشق ہے آزاد
اب جسے دیکھو سو ہے مادر زاد

ہر کوئی تھا خود اپنے غم میں اسیر
کون سنتا یہاں مری فریاد

دہر مکتب ہے اہلِ دل کے لئے
لطمۂ غم ہے سیلیِ استاد

عشق میں جان کا زیاں ہے تو ہو
دل دیا تم کو ہرچہ بادا باد

ہے جنوں شرطِ دشت و صحرا کیا
ذرّے ذرّے میں ہے جہاں آباد

سب سُنیں اور کچھ نہ سمجھے کوئی
ہے یہ طرزِ فغاں مری ایجاد

اک تماشا ہے اور سو آفت
اک تمنّا ہے اور سو افتاد

کشتِ تدبیر ہے سو لا حاصل
قصرِ اُمّید ہے سو بے بنیاد

موسمِ گل کے خوں سے رنگیں ہے
برگِ گل بھی ہے نشترِ فصّاد

آدمی آدمی کی گھات میں ہے
آپ ہی صید آپ ہی صیّاد

کون اب کس سے خوں بہا مانگے
"خونِ فرہاد برسرِ فرہاد"

کس نے توڑا طلسمِ بود و نبود
کس نے دیکھا مآلِ کون و فساد

فلسفہ ہو کہ شعر ہو شاخیؔ
اک خلش ہے کہ جس کی ہے روداد

○

رُندھ گئی شدّتِ جذبات سے میری آواز
تندیٔ زخمہ سے بے تار ہُوا جاتا ہے ساز

جس کو دشنک کبھی سمجھا میں کبھی پاؤں کی چاپ
خود مرے دل کے دھڑکنے کی وہ نکلی آواز

کوششِ ضبط کے آثار ہیں چہرے سے عیاں
ہے خموشی بھی مرے دردِ نہاں کی غمّاز

سمتِ پرواز معیّن ہے نہ منزل کا یقیں
زندگی کیا ہے شبِ تار میں سعیٔ پرواز

ذرّہ ذرّہ ہے اُسی نورِ ازل کا پرتو
آئینہ دارِ حقیقت ہے حقیقت میں مجاز

چیرہ دستانِ سیاست کا تطاول دیکھو
سچ تو کہتے ہیں کہ اشرار کی رسّی ہے دراز

رقص و مے نوشی و عریانی و موسیقی و فلم
گویا اب دیں کے شعائر ہیں نہ روزہ نہ نماز

آنکھ پر ناز ہے نرگس کو اسے کیا معلوم
اہلِ بینش کی بصیرت نہیں بے سوز و گداز

ہے ہوسناکی کا اک کھیل محبت ہو کہ حُسن
اب تو اک قصّۂ پارینہ ہیں محمود و ایاز

دے کے دل آپ سے ہم کرتے تقاضائے کرم؟
عشق تھا کوئی تجارت تو نہ تھی بندہ نواز

راحتِ بے سر و سامانیٔ حرماں مت پوچھ
کوئی اُمید نہ حسرت نہ کوئی حرص نہ آز

بے کسی میں بھی ہے سو چین تو ہزار آزادی
نہ کوئی دوست نہ دشمن نہ کوئی محرمِ راز

اک ترے ہو کے ہوئے دونوں جہاں سے فارغ
اب کھلا ہم پہ کہ سو ناز کا حامل ہے نیاز

تُو وہ یکتا کہ کوئی مثل نہ کوئی ہمتا
میں وہ تنہا کہ کوئی یار نہ کوئی دمساز

رہ گیا غم رگِ پے میں تو ہوئے لب خاموش
سیکھے شاقی نے بھی اب ضبطِ فغاں کے انداز

○

ہے ہماری آب و گل کا جزو میخانے کی خاک
بارور ہو کوئی کوشش ہم کو سمجھانے کی خاک

خاک ہونے پر نہ جائے گی مری آوارگی
دشت دشت اُڑتی پھرے گی تیرے دیوانے کی خاک

انبساطِ روح کو کیا تنگئ زنداں کا ڈر
شیشۂ ساعت میں بھی رقصاں ہے مستانے کی خاک

جس ورق پر حالِ دل تھا نذرِ آتش کر دیا
یُوں اڑا دی حسن نے اُلفت کے افسانے کی خاک

امتیازِ ما و تو کیونکر کریں اہلِ فنا
مٹ گئے پر ایک ہے سب اپنے بیگانے کی خاک

میرے گھر پہنچے ہیں وہ میں آج ہی گھر پر نہیں
اے جنوں بے وقت چھانی ہم نے ویرانے کی خاک

آبِ آتش رنگ کی حرمت کی باندھی ہے ہوا
حضرتِ واعظ تمہارے منہ میں میخانے کی خاک

لے اڑی شاؔمی کی مشتِ خاک کو مینا کی آگ
عرش پر پہنچی ہے زورِ مے سے میخانے کی خاک

محرومِ لذتِ غمِ جاناں ہیں آج کل
ہم کشتۂ کشاکشِ دوراں ہیں آج کل

ہاں اے خیالِ زلفِ بتاں مت ستا ہمیں
کہہ تو دیا کہ ہم بھی پریشاں ہیں آج کل

بے منتِ جنوں یہاں دامن ہے تار تار
ہم مفلسی سے دست و گریباں ہیں آج کل

جوں نقشِ پا ہیں خاک بکف اور رہ نشیں
ہم خاکسار بے سر و ساماں ہیں آج کل

نے جستجو، نہ ذوقِ تگ و دو، نہ اضطراب
ذوق آشنائے راحتِ حرماں ہیں آج کل

نے روز ہائے ہجر نہ شب ہائے انتظار
ہم بے نیازِ گردشِ دوراں ہیں آج کل

شاؔمی بہ ازو جامِ مصائب بہ رنج و غم
با وصف اِس کے آپ غزل خواں ہیں آج کل

○

طوفان بن کے گزریں گے خود اپنے سر سے ہم
آخر تو کام لیں گے کوئی چشمِ تر سے ہم

رُکتے نہیں وطن میں نشاطِ سفر سے ہم
بیتاب تر ہیں موجِ نسیمِ سحر سے ہم

روشن ہیں ہم پہ یاس و یقین و گماں کے موڑ
گذرے ہیں لاکھوں بار اسی راہگذر سے ہم

خود ہم نے اپنی سادہ دلی کے مزے لئے
اب کیا گلا کریں بتِ بیداد گر سے ہم

اپنی نگاہِ شوق بھی ناکام تو نہیں
اتنا تو پا گئے ہیں تمہاری نظر سے ہم

چلنے پہ اختیار نہ رُکنے پہ اختیار
نکلے مثالِ مہرۂ شطرنج گھر سے ہم

رہزن سے بچ نکلنے کی شاید ہو کچھ سبیل
کیسے بچیں گے رہزنیٔ راہبر سے ہم

شاقؔی ہم اپنے آپ سے گویا گزر گئے
گذرے تھے اتفاق سے اُس رہگذر سے ہم

○

تم کو خدا کا خوف نہ خلقِ خدا کی شرم
رکھ لی ہمیں نے پاسِ وفا سے وفا کی شرم

موجوں کے بل سفینہ کنارے پہ آ لگا
رکھ لی مرے خدا نے مرے ناخدا کی شرم

اے دل! ہیں وہ بھی دل سے تو مائل بالتفات
شرما کے اب تو رکھتے ہیں اپنی حیا کی شرم

لایا اُنہیں کا ذوقِ جفا کھینچ کر انہیں
آنے سے اُن کے رہ گئی میری دعا کی شرم

گل کی قبا ہے چاک فروغِ شباب سے
اے عندلیب! رہ گئی تیری صدا کی شرم

ہم اور شیخ دل نہ بتوں سے لگا سکے
حوروں کا اس کو فکر تھی ہم کو خدا کی شرم

آؤ کہ ہو نہ جذبِ محبت کہیں ذلیل
رکھے تو آشنا ہی رکھے آشنا کی شرم

شاقؔی کہاں کے شاعرِ رنگین نوا تھے ہم؛
دی داد سب نے رکھ لی ہماری نوا کی شرم

○

ن رنگ و بو اک نقشِ باطل ہے جہاں میں ہوں — حقیقت ہی حقیقت کے مقابل ہے جہاں میں ہوں

ل میں بھی سکوں ہے جوش پر بھی ضبط غالب ہے — ادب دیباچۂ آدابِ محفل ہے جہاں میں ہوں

ب آسا سکونِ قلب ہے یاں عین طوفاں میں — کہ ہر موجِ بلا آغوشِ ساحل ہے جہاں میں ہوں

نے تلملانے میں بھی اک احساسِ راحت ہے — کہ غم کو اعتبارِ عیش حاصل ہے جہاں میں ہوں

ہر ہر نفس میں عیدِ قرباں کی مسرت ہے — نفس گویا دمِ شمشیرِ قاتل ہے جہاں میں ہوں

اگاہی ہے یہ یا خود فراموشی خدا جانے — کہ مدہوشی میں بھی ادراک شامل ہے جہاں میں ہوں

چشمِ کشادہ حلقۂ دامِ تماشا ہے — یہاں تو جلوہ خود اک مرغِ بسمل ہے جہاں میں ہوں

ہے تمنا ہے تمنا ہے تقاضا ہے — مگر عرضِ مطالب سخت مشکل ہے جہاں میں ہوں

ہزاروں منزلیں اس رہ میں ہوں گی جذب و مستی کی
کہ یہ تو ابتدا کی ایک منزل ہے جہاں میں ہوں

اک موجِ خوں ہے گل جو تماشا کرے کوئی — خاک آرزوئے دیدۂ بینا کرے کوئی

تھی اک نگاہِ ناز میں سو دعوتِ نظر — دیکھا کچھ اس ادا سے کہ دیکھا کرے کوئی

سو بار عزمِ ترکِ محبت کیا مگر — جب دل ہی دے نہ ساتھ تو پھر کیا کرے کوئی

ہے فرطِ غم بجائے خود اک گونہ بیخودی — کیوں اہتمامِ ساغر و مینا کرے کوئی

وا کی ہے ذوقِ دید نے آغوشِ چشمِ شوق — اب اور کیسے عرضِ تمنا کرے کوئی

اے دستِ شوق بڑھ کے الٹ دے نقابِ حسن — یہ وقت ہے کہ جرأتِ بیجا کرے کوئی

بینا ہوئی جو آنکھ زباں گنگ ہو گئی — ممکن کہاں کہ راز کو افشا کرے کوئی

شاقیؔ ہمیں تو آنے کی تقریب چاہیئے
ہر روز ہم سے وعدۂ فردا کرے کوئی

نام ظہیر احمد فاروقی تخلص شفق ۱۹ جون ۱۹۳۴ء کو منظفر گڑھ (یو۔ پی) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے
انوی تعلیم ہائی سکول مرادآباد میں پائی۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان پہنچے۔ سکھر میں اقامت اختیار کی اور
ے ہائی سکول سکھر ہی سے میٹرک پاس کیا۔

ان کے شاعر بننے کی داستان بہت دلچسپ ہے۔ سکول میں مشاعرہ ہوا۔ شعرا حضرات کی تعداد بہت
ی۔ مشاعرہ کو کامیاب بنانے کے لئے منتظمین نے میٹرک کے طلبا میں غزلیں تقسیم کیں تاکہ وہ ایمرجنسی
ر کی حیثیت سے مشاعرہ میں پڑھ سکیں۔ ان کو جو غزل دی گئی اس میں تخلص "شفق" تھا چنانچہ اُس دن
اج تک آپ شفق ہیں۔ اس مستعار لی ہوئی غزل کے چند اشعار انہیں آج تک یاد ہیں۔ آپ بھی
ف اٹھائیں ؎

نگاہِ ناز گر آمادہ بیکار ہو جائے	زمانہ جان دینے کے لئے تیار ہو جائے
یہی عالم رہا کچھ دن اگر احساسِ الفت کا	شفق گھبرا کے اک دن پھر نہ بادہ خوار ہو جائے

اِس غزل پر انہیں بہت داد ملی۔ درحقیقت اسی داد نے طبیعت کو شعر کہنے کی طرف مائل کیا۔ پھر
کے بعد جب پھر مشاعرہ ہوا تو انہوں نے طرح میں لکھی ہوئی غزل پڑھی۔

بازیٔ عشق میں جناب شفق	آپ ہی کہئے کیا نہیں ہوتا

سامعین نے کافی ہمت افزائی کی اور اس طرح یہ باقاعدہ شعر کہنے لگے۔ دریں اثنا اِن
الد کا تبادلہ کراچی ہو گیا۔ یہاں کا ماحول ذوقِ شاعری کو تقویت دینے میں بہت معاون ثابت
۔ وقار انجمیری۔ تجلی امروہوی اور حضرت قمر جلالوی سے کافی قرب رہا۔ ہر دو تین ماہ بعد ان کے
خود محفلِ مشاعرہ منعقد کرتے تھے چنانچہ ان کا ذوق پروان چڑھتا رہا۔ اور اشعار سنورتے

رہے۔ لیکن اِن صحبتوں کا نتیجہ بُرا نکلا۔ ایف۔ ایس۔ سی میں فیل ہوگئے۔ انتقاماً شاعری کو طلاق دے دی۔ لیکن ۱۹۵۵ء میں بی ایس سی کرنے کے بعد طبیعت نے پھر شعر و شاعری کی طرف متوجہ ہونے پر مجبور کر دیا۔ اس زمانہ میں جو غزلیں کہیں وہ خاصی کامیاب رہیں۔ بی۔ ایس۔ سی کرنے کے بعد پبلک ایڈمنسٹریشن میں کراچی ہی سے ایم اے کیا اور اس زمانہ میں بھی مشاعروں میں شرکت جاری رہی۔

تعلیم کے بعد تلاشِ معاش میں اُلجھ کر رہ گئے۔ باٹا شو کمپنی میں دو سال گزارے۔ پھر واپڈا کی ملازمت بحیثیت اسسٹنٹ پرنسپل انجینیر کے اختیار کی۔ واپڈا کی ملازمت کے دوران ہی جناب منظور احسن عباسی کے صاحبزادے قیصر علی عباسی سے ملاقات ہوئی۔ جنھوں نے انجمن ترقیٔ ادب ماڈل ٹاؤن کے پندرہ روزہ مشاعروں میں شرکت کی دعوت دی۔ اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ گھریلو حالات خود ان کی زبانی یہ ہیں۔ "نومبر ۶۲ء میں ایک حادثہ سے دوچار ہوئے۔ شادی ہوگئی۔ بیگم آگئیں۔ پھر ایک بچی آگئی۔ گھبرا کر ہم امریکہ چلے گئے۔ چھ ماہ بعد واپس آئے تو ایک اور "حضور کا سلام" ہماری راہ تک رہی تھی۔ یا لنس لیا ہی تھا کہ اللہ تعالیٰ نے تیسری سے نوازا۔ شعر کہنے کا زمانہ رخصت سا ہوتا جا رہا ہے۔ غالباً مستقل راگنیاں سننے کا زمانہ آگیا ہے۔ چنانچہ بچیوں کی مستقل راگنیوں میں کبھی کبھی بیگم کی "ملتانی کافی" بھی سُننے میں آجاتی ہے۔

○

○

شعلۂ حسرتِ تباہ سے بچ　　بچ سکے تو مری نگاہ سے بچ
گیسوئے حُسن کی پناہ سے بچ　　اِس انوکھی سی قتل گاہ سے بچ
رحمتِ حق کو آزما لے دل　　تُو نہ ہرگز کسی گناہ سے بچ
منفعل ہو گا شیشۂ ساقی　　آج واعظ نہ تُو گناہ سے بچ
تجربوں نے سبق دیا ہے شفقؔ
دوست بن، دوست کی پناہ سے بچ

○

کیا کیا نہ وارِ قلب پہ کرتی چلی گئی　　کنجِ قفس میں گلشنِ جنت نما کی یاد
ساحل پہ رہ کے راحتِ طوفاں ڈھونڈیئے　　اب تک ہے بات ہم کو یہ موجِ بلا کی یاد
ساقی، شراب، مطرب و نغماتِ زندگی　　ایسے میں کس کو آئی ہے ناصح خدا کی یاد
جھٹلائیں کس طرح کہ حقیقت ہے یہ شفقؔ
دھوکہ دیا بتوں نے تو آئی خدا کی یاد

○

جب بدل ہی نہ سکا چشمِ بُتاں کا انداز　　”درد نے سیکھ لیا ضبطِ فغاں کا انداز“
جرأتِ اشک کو محدود رکھا پلکوں تک　　تاکہ دلکش سا رہے سوزِ نہاں کا انداز
کس طرح وعدۂ فردا پہ یقین آ جائے　　جبکہ ملتا ہو ”نہیں“ سے تری ”ہاں“ کا انداز
آج تک گردشِ دوراں سے ہیں اُلجھے اُلجھے　　وہ جو اپنا نہ سکے بزمِ جہاں کا انداز
مطمئن کیسے نشیمن کی طرف سے ہوں شفقؔ
مطمئن کُن ہے کہاں برقِ تپاں کا انداز

○

مقامِ خوشی ہے، مگر غم سے ناصح
کہ کھلتے ہیں گُل اشکِ شبنم سے ناصح

نہ ناداں بن تو یہ ہے زخمِ دل کا
نہ بھر پائے گا تیرے مرہم سے ناصح

خوشا رہبرِ کارواں کی عنایت
کہ ذوقِ طلب بھی چھینا ہم سے ناصح

بہ فیضِ طبیعت اُلجھتا رہا ہے
کبھی اُن سے ناصح کبھی ہم سے ناصح

ہزاروں حوادث سے ہم بچ کے نکلے
نہ نِکلے مگر زلفِ پرخم سے ناصح

بس اتنی خطا ہے کہ تھوڑی سی پی لی
شفقؔ آج برہم رہا ہم سے ناصح

○

اک سمت جب ہوا رہزن و راہبر کا رُخ
پھر کارواں کرے بھی تو آخر کدھر کا رُخ

اے کاش کوئی بدلے مرے ہمسفر کا رُخ
"منزل اُدھر نہیں ہے جدھر راہبر کا رُخ"

پھر دل نے کرلیا ہے تری رہگذر کا رُخ
اب کیا دکھائے دیکھئے اِس بے خبر کا رُخ

تاریکیٔ الم سے نہ گھبراؤ دوستو
ہوتا ہے سوئے شب ہی تو حُسنِ سحر کا رُخ

غمہائے زندگی کو ٹھکانہ نہ جب ملا
تو بے تکلفی سے کیا میرے گھر کا رُخ

گو بار ہا لٹے ہیں تری راہگذار پر
ہم پھر بھی کررہے ہیں تری رہگذر کا رُخ

ناحق حضور آپ پشیمان ہو گئے
اُس سمت تو نہ تھا مرے دامانِ تر کا رُخ

دو چار تنکے جمع کئے تھے کہ پھر شفقؔ
ہونے لگا ہے شورشِ برق و شرر کا رُخ

○

○

حسرتیں تڑپیں، تڑپ کر رہ گئیں پھر دل کے پاس
وائے ناکامی پہونچ سکتے نہیں منزل کے پاس

کج نگاہی کے سوا ہم کو نہ کچھ بھی مل سکا
بیٹھ کر ہم نے بھی دیکھا صاحبِ محفل کے پاس

اک تمہاری یاد تھی، سو وہ بھی تم نے چھین لی
اور کیا چھینو گے تم، رکھا ہی کیا ہے دل کے پاس

کارواں لُٹتا گیا، اِس کا ہمیں کچھ غم نہیں
غم ہے یہ، رہبر نے لُوٹا ہے اسے منزل کے پاس

آ گئے ہو گر، تو بیٹھو، تمکنت کیسی یہاں
جا نہیں مخصوص کوئی بزمِ اہلِ دل کے پاس

تُو فقط ذوقِ طلب کو دے یقینِ معتبر
خود ہی پھر کھنچ آئے گی منزل، نہ جا منزل کے پاس

بدنصیبی کے شفقؔ قائل نہیں تھے ہم، مگر
ہم نے دیکھے ہیں سفینے ڈوبتے ساحل کے پاس

○

ڈوبے، مگر نہ رکھا کناروں سے ربط و ضبط
توہینِ زندگی تھا سہاروں سے ربط و ضبط

موقوف تم پہ ہی تو نہیں ترکِ دوستی
رکھتا ہے کون درد کے ماروں سے ربط و ضبط

کس منہ سے آشیاں کی تباہی کا ہو گلہ
خود ہی بڑھایا تھا شراروں سے ربط و ضبط

کھلنے لگے ہیں پھول گریباں کے تار سے
راس آ گیا شفقؔ کو بہاروں سے ربط و ضبط

○

○

زینتِ چشم بنا جب سرِ مژگاں کا چراغ
منفعل ہو کے رہا محفلِ جاناں کا چراغ

شدتِ غم سے جو غنچے کا جگر چاک ہوا
لوگ سمجھے کہ جلا فصلِ بہاراں کا چراغ

آج کیوں ہم سے گریزاں ہو شبستاں والو
کل تو ہم ہی نے جلایا تھا شبستاں کا چراغ

عالمِ نزع ہے، آ جاؤ، عنایت ہو گی
ٹمٹماتا ہے ابھی دیدۂ ویراں کا چراغ

آپ کے غم سے میں کس طرح کنارا کر لوں
آپ کے غم سے ہے روشن سرِ مژگاں کا چراغ

والیٔ وقت کا ایوان نہیں بچ سکتا
گر بھڑک اٹھا کبھی جرأتِ انساں کا چراغ

ہے وہ خود دار شفق ڈھونڈتا پھرتا ہے جسے
آج بھی نوحہ بہ لب منزلِ جاناں کا چراغ

○

پھر اُٹھ رہا ہے دھواں میرے آشیاں کی طرف
رُخِ بہار ہے کیا صحنِ گلستاں کی طرف

ہزار سجدے جبینِ نیاز میں مچلے
اٹھی ہے جب بھی نظر اُن کے آستاں کی طرف

جگر کے داغ ہیں غماز اِس حقیقت کے
کہ ہم گئے تھے کبھی بزمِ دوستاں کی طرف

ہمارے خون کے چھینٹے ہیں یہ بہار نہیں
نگاہِ غور سے دیکھو تو گلستاں کی طرف

میں تلخ تلخ حقائق بیان کرتا رہا
ہزار بندشیں لیکن مری زباں کی طرف

○

O

یوں تو قابو میں کسی صورت نہیں آتا ہے دل
ہاں اگر ہو زلف تو اکثر اُلجھ جاتا ہے دل

ابتدائے عشق میں ہم دل کو بہلاتے رہے
انتہا اب ہو گئی تو ہم کو بہلاتا ہے دل

بارہا مایوس لوٹے ہیں جہاں سے اہلِ دل
آج اُس محفل میں پھر ہم کو لئے جاتا ہے دل

کیسے دستورِ زباں بندی کی پابندی کروں
عقل گر خاموش رکھتی ہے تو اکتاتا ہے دل

تشنۂ سوزِ یقیں ہے آج بھی ذوقِ یقیں
میکدے پھر راہِ کعبہ سے لئے جاتا ہے دل

اللہ اللہ انتظارِ یار کی نیرنگیاں
دل کو سمجھاتا ہوں میں اور مجھ کو سمجھاتا ہے دل

اے شفق دیوانگی تجھ پر ہی کیا موقوف ہے
ہر کوئی دیوانہ بن جاتا ہے جب آتا ہے دل

O

○

ہم کو آغاز میں انجام سے ڈر لگتا ہے
کتنا وہمِ غلط اقدام سے ڈر لگتا ہے

گو کہ حاصل ہے مجھے کیفیتِ لالہ و گل
پھر بھی اِس زیست کے انجام سے ڈر لگتا ہے

آج کیا تیرے تصرف میں کمی ہے ساقی
ورنہ کیا بات ہے کیوں جام سے ڈر لگتا ہے

انقلابات کے آثار کا فقدان ہے آج
دلِ آسودۂ آلام سے ڈر لگتا ہے

اپنی ناکام تمنّا سے محبت ہے مجھے
مجھ کو ہر سعیٔ خوش انجام سے ڈر لگتا ہے

میرے نزدیک ہر اک غم ہے شفقؔ جانِ حیات
خوگرِ درد ہوں آرام سے ڈر لگتا ہے

○

بیکار ہے سعیٔ عیش و طرب یہ جورِ فلک کم کیا ہوگا
جینے کا سہارا دنیا میں جز تلخیٔ پیہم کیا ہوگا

اے چارہ گرو، اے چارہ گرو، نادان نہ بنو، ناداں نہ بنو
یہ زخم ہے اور وہ بھی دل کا شرمندۂ مرہم کیا ہوگا

رنگین گلوں کی شادابی پروردۂ اشکِ شبنم ہے
جو شرحِ فروغِ حسن کرے وہ دیدۂ پُرنم کیا ہوگا

بے چین ہو تم، بیتاب ہو تم، حالانکہ ابھی خاموش ہوں میں
یہ ضبطِ فغاں کا عالم ہے تو آہ کا عالم کیا ہوگا

آنکھیں ہیں مذاقِ دید نہیں، بیگانۂ خواہش دل ہے شفقؔ
اب اِس سے سوا انجامِ اُلفت ہوگا بھی تو برہم کیا ہوگا

○

پروفیسر حفیظ صدیقی ایم۔اے

نام حفیظ صدیقی، تخلص حفیظ۔ حفیظ صدیقی ۲۸ جون ۱۹۳۴ء کو چوہان قریشیاں نزد پسرور ضلع سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گورنمنٹ ہائی سکول پسرور میں حاصل کی اور وہیں سے ۱۹۵۰ء میں انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ بی اے کا امتحان لاہور کے اسلامیہ کالج سے اور ایم اے پنجاب یونیورسٹی سے پاس کیا۔ اس کے بعد آپ کالج میں لیکچرار مقرر ہو گئے۔ اس وقت آپ جناح اسلامیہ کالج سیالکوٹ میں اُردو کے پروفیسر ہیں۔

پیدائش سے لے کر حفیظ صدیقی کے حالات نہایت ناموافق اور حوصلہ شکن رہے ہیں۔ زندگی کے ہر موڑ پر نئے مصائب اور نئی آزمائشوں نے آپ کا استقبال کیا۔ آپ نے ہمیشہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ان سے بے تکلف مصافحہ کیا۔ آپ کی ذہنی و قلبی صلاحیتوں اور خارجی اثرات نے آپ کی جو شخصیت متشکل کی اس کا عکس آپ کی ہر تحریر میں نظر آتا ہے۔ بے شمار مشکلات کے ہجوم میں آپ نے جس جسارت اور اولوالعزمی سے تعلیمی اور ادبی ترقی کا راستہ تلاش کیا اور پھر اس راستے پر بے جھجک قدم مارا وہ ہمارے معاشرے کے لئے باعثِ فخر اور ہماری نوجوان پود کے لئے قابلِ تقلید ہے۔

حفیظ صدیقی نے غزل، نظم، افسانہ، تنقید غرضیکہ ادب کے ہر میدان میں طبیعت کی جولانی دکھائی ہے اور ان کی ہر جولانی کامیاب ہے۔ آپ ایک کامیاب ادیب اور کامیاب تر انسان ہیں۔

○

بہاروں میں جو دل کی چوٹ ابھر آئی تو کیا ہو گا
تمنا بن گئی خود ہی تمنائی تو کیا ہو گا

مجھے اہلِ خرد کی بزمِ حیرت میں نہ لے جاؤ
وہاں جا کر اگر مجھ کو ہنسی آئی تو کیا ہو گا

وقارِ صبر تو قائم ہے تنہائی میں رونے سے
کسی کی انجمن میں آنکھ بھر آئی تو کیا ہو گا

ابھی سے ہیں گریباں چاک اہلِ شوق گلشن میں
خدا جانے چمن میں جب بہار آئی تو کیا ہو گا

ابھی تو مطمئن ہیں عشرتِ عالم کو ٹھکرا کر
طبیعت اپنی غم سے بھی جو گھبرائی تو کیا ہو گا

صبا کو ناز ہے یوں تو بہت نازک خرامی پر
صبا کے سامنے اُن کی زلف لہرائی تو کیا ہو گا

تمہیں یہ آنکھ سے ہم نے چھپا کر دل میں رکھا ہے
زمانہ آ گیا بن کر تماشائی تو کیا ہو گا

اگرچہ ترکِ ساغر کا ارادہ اب مصمم ہے
کسی مہوش نے آنکھوں سے جو برسائی تو کیا ہو گا

حفیظ انکار کب ہم نے کیا صحرا نوردی سے
نہ راس آئی اگر یہ آبلہ پائی تو کیا ہو گا

○

مرے لبوں پہ ترا نام اگر نہیں ہوتا
فغاں میں درد دعا میں اثر نہیں ہوتا

غمِ حیات کی تاریک رہگزاروں میں
جو تُو نہیں تو کوئی ہم سفر نہیں ہوتا

یہ بات ذوقِ نظر کی ہے لوگ کیا سمجھیں
جمالِ یار کا پہلو کدھر نہیں ہوتا

وہاں وہاں بھی تمہارا گمان گزرا ہے
جہاں جہاں سے تمہارا گزر نہیں ہوتا

وہ اشک دل میں جو گر رہے وہی ہے گوہرِ ناب
مگر جو آنکھ سے ٹپکے گہر نہیں ہوتا

ہم اس خیال سے تنہا رہے زمانے میں
ہر ایک راہنما، راہبر نہیں ہوتا

بہت حسین سہی خوابِ زندگی لیکن
نہالِ خواب کبھی بارور نہیں ہوتا

کسی کی چشمِ کرم کا یہ فیض ہے یارو
ہمیں حوادثِ عالم کا ڈر نہیں ہوتا

رہِ طلب میں مسلسل میں چل رہا ہوں حفیظ
سفر حیات کا کیوں مختصر نہیں ہوتا

○

پھر آئی ہے فصلِ بہاراں یارو پھر سے گلشن مہکا
پھر آباد کرو مے خانے تیز کرو پھر غم کی صہبا

عقل کی راہ میں قدم قدم پہ دنیا سوچ سمجھ کر جائے
کون مرے گا، کون جئے گا، دل کی راہ پہ کس نے سوچا

دنیا کی بڑھتی رونق میں اپنا مقدر تنہائی ہے
ساتھ کہاں تک دیوانے کا آج بھی تنہا کل بھی تنہا

آج تری صورت بھی پیارے بیگانی سی لگتی ہے
ہر صورت تیری صورت تھی، ہم پر وہ عالم بھی گزرا

فکر و نظر نے راہِ طلب میں گرچہ اُجالے برسائے
گوہرِ مقصد ہاتھ نہ آیا گھوم پھرے ہم صحرا صحرا

تیری قسم ہے جانِ تمنا، تجھ سے بچھڑ کر جی نہ سکیں گے
گلی گلی نظریں ڈھونڈیں گی قریہ قریہ دل بھٹکے گا

گلشن گلشن پھول کھلے تھے، دل کو سکوں بھی حاصل تھا
وہ جو نہیں تھا خلوتِ دل میں اہلِ نظر کو کچھ بھی نہ بھایا

حسن کی دنیا گرچہ حسیں تھی، لیکن اپنی میت نہیں تھی
ہم نے حفیظ زارِ جہاں میں ماہ وشوں سے دھوکا کھایا

○

آج سبھی دنیا بیگانی، آج سبھی بیگانے لوگ
کون کہیں سے ڈھونڈ کے لائے وہ جانے پہچانے لوگ

جب تک تیری بات نہ سمجھے جاہل کہلائے دنیا میں
تیری بات سمجھ پائے تو کہلائے دیوانے لوگ

جب تک اپنا جام تھا خالی آنکھ اٹھا کر دیکھا کس نے
جام بھرا دیکھا تو لائے بھر بھر کے پیمانے لوگ

اب تو اپنے شہر میں بھی ہم بات کریں تو ڈرتے ہیں
بات ذرا سی لب پر آئی کہتے ہیں افسانے لوگ

اپنے اپنے دکھڑے جھیلو اپنے اپنے غم بانٹو
چھوڑو یارو بات ہماری ہم ٹھہرے دیوانے لوگ

فصلِ بہاراں رخصت ہو گی جب موسم صحنِ گلشن سے
جوشِ جنوں میں ڈھونڈ ہی لیں گے خود جا کر ویرانے لوگ

تجھ کو حفیظ اب راہِ طلب میں کام بصیرت سے لینا ہے
ورنہ میں کیسے پہچانوں جانے اور انجانے لوگ

پھر وہی میں ہوں پھر وہی ترا غم
ہر نئی راہ زیست کا ماتم

قلب کی موت ہے سکونِ حیات
زندگی دل کی سوزشِ پیہم

موت سے گر خراج لینا ہے
ہنس کے لہراؤ زیست کا پرچم

خوف آنے لگا ہے جینے سے
ہجر کی آگ جب ہوئی ہے کم

ہر نفس میں نئی نئی اُلجھن
زندگی ہے کسی کی زلف کا خم

جب سے اُس نے نگاہ پھیری ہے
زندگی کا مزاج ہے برہم

ڈوب جائے نہ آرزو کا جہاں
وہ حسیں آنکھ اِس قدر پرنم

پھر مرا ظرف کارفرما ہے
پھر سمٹنے لگے ہیں دیر و حرم

منزلِ فن نظر نہیں آتی
اُڑ رہا ہے غبارِ لوح و قلم

آگ پی کے گزر کے شعلوں سے
ہم نے رکھا ہے عاشقی کا بھرم

اپنا سرمایہ ہے عزمِ انساں
ہم سے قائم ہے عظمتِ آدم

دیکھنا ہے اگر خلوص کا رنگ
آ ملائیں تجھے حفیظ سے ہم

افکار میں وہ پہلا سا اب بانکپن کہاں / فن کا تو ایک نام ہی باقی ہے فن کہاں

وہ دور آ گیا ہے کہ جھوٹے ہیں مدعی / اے دوست اب وہ عظمتِ دار و رسن کہاں

جن میں پناہ لیتے تھے مفرورِ زندگی / روپوش ہو گئے ہیں وہ دشت و دمن کہاں

آسائشِ حیات میسر نہیں کہیں / کانٹے بچھے ہیں راہ میں سرو و سمن کہاں

حیرت سے ڈھونڈتی ہے مروت کی آبرو / چاندی کی جھیل کیا ہوئی تیرا بدن کہاں

شیریں کا قصر دیتا ہے آواز دہر سے / آوارہ راستوں میں ہے تو کوہ کن کہاں

آسودگیِ فکر میسر نہیں حفیظ
مل کر تو لوگ بیٹھتے ہیں انجمن کہاں

غم کوئی بھی ہو نعمتِ یزداں ہے عزیزو / جاں دے کے بھی ہاتھ آئے تو ارزاں ہے عزیزو

یہ کون سی منزل ہے جنونِ رہِ غم کی / مجھ سے مرا سایہ بھی گریزاں ہے عزیزو

اک درد میں آسائشِ ہستی تھی میسر / اب دل کا لہو بھی سرِ مژگاں ہے عزیزو

یا خار ہیں یا دھول سی ہے حدِ نظر تک / یہ صحنِ چمن ہے کہ بیاباں ہے عزیزو

تم بھی مری مانند ذرا دل کو جلاؤ / تم کو بھی اگر شوقِ چراغاں ہے عزیزو

اب فصلِ بہار آئے نہ آئے مجھے کیا غم / یہ ہاتھ ہے میرا یہ گریباں ہے عزیزو

دل اپنا پریشاں ہو تو یوں لگتا ہے جیسے
ہر انجمنِ ناز پریشاں ہے عزیزو

○

آہوں سے سروکار ہے، کیا جانیئے کیا ہو
دل غم کا طرف دار ہے، کیا جانیئے کیا ہو

مذکور زمانے کا نہیں، جانِ تمنا!
دل تجھ سے بھی بیزار ہے، کیا جانیئے کیا ہو

وہ دل کہ فقط تیرے تصور کا امیں تھا
ہر غم کا طلب گار ہے، کیا جانیئے کیا ہو

ہیں میری نگاہوں میں تبسم کی سزائیں
مسرور دلِ زار ہے، کیا جانیئے کیا ہو

بازار کی رونق میں اضافہ ہے بہر طور
مایوس خریدار ہے، کیا جانیئے کیا ہو

شہکار تو ہر آن ابھرتے ہیں نظر میں
الجھا ہوا فن کار ہے، کیا جانیئے کیا ہو

ہر وقت گرفتار ہے جنت کی ہوس میں
زاہد بھی گنہگار ہے، کیا جانیئے کیا ہو

پہلے تو یہ غم تھا کہ جنوں چھوڑ گیا ساتھ
اب فہم گراں بار ہے، کیا جانیئے کیا ہو

کس دور میں یوں جنسِ وفا آ کے رکی تھی
یوسف سرِ بازار ہے، کیا جانیئے کیا ہو

○

تمام عمر یہی سوچتے گزاری ہے
بساطِ شوق کی بازی بھی کیسے ہاری ہے

ہر ایک شے کا مقدر فنا ہے دنیا میں
ہمارے بعد غمِ زندگی کی باری ہے

لرز رہے ہیں زمانے کی بے ثباتی سے
مہ و نجوم پہ کس درجہ خوف طاری ہے

نہیں ہے کشمکشِ زندگی کا جس میں وجود
وہ زندگانی مذاقِ جنوں پہ بھاری ہے

کبھی سکون کی دولت بھی مل ہی جائے گی
ابھی تو شغل فقیروں کا اشک باری ہے

تلاشِ عیش کرو، غم سے دور دور رہو
گریز غم سے مگر غیر اختیاری ہے

زمانہ سن کے جسے بن گیا ہے پیکرِ غم
کہو حفیظ کہ وہ داستاں ہماری ہے

○
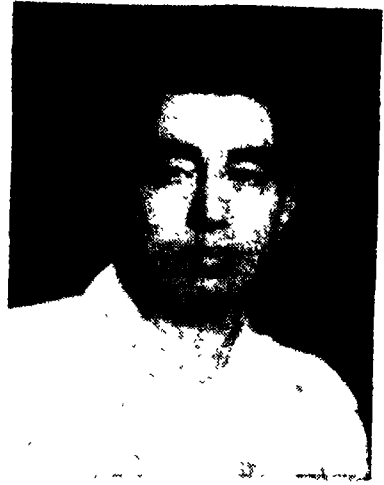
سیّد سلیم واسطی

سیّد محمد سلیم واسطی اپنا تخلص واسطی کرتے ہیں ۔ لیکن کبھی کبھی سلیم بھی تخلص کر لیتے ہیں ۔ یہ لاہور کے ایک ممتاز علمی خاندان کے چشم و چراغ ہیں ۔ اِن کے مورثِ اعلیٰ معرکہ تھانیسر میں سلطان محمود غوری کے ہمرکاب لڑے ۔ فتح کے بعد وہ قصبہ شاہ آباد ضلع کرنال میں آباد ہو گئے ۔ واسطی صاحب کے دادا مولوی سیّد غلام قادر گزشتہ عیسوی صدی کے آخر میں سنٹرل ماڈل ہائی سکول لاہور کے مدرّس اعلیٰ تھے اور مبارک تخلص کرتے تھے ۔ انہوں نے شیکسپیئر کے ڈرامہ مڈسمر نائٹس ڈریم اور ملٹن کی انگریزی نظم لا الیگرو کا اردو میں منظوم ترجمہ کیا ۔ واسطی صاحب کے والدِ محترم پروفیسر ایم اے غنی صاحب مرحوم اسلامیہ کالج لاہور میں چالیس سال پروفیسر، وائس پرنسپل اور پرنسپل رہے ۔ تصانیفِ شیکسپیئر کی تدریس میں وہ اپنی مثال نہیں رکھتے تھے ۔

پروفیسر ایم اے غنی کے سب سے بڑے صاحبزادہ مشہور ماہرِ تعلیم سیّد جمیل واسطی ایم اے کینٹب ہیں ۔ وہ سینٹ سٹیفن کالج دہلی اور گورنمنٹ کالج لاہور میں کئی برس انگریزی کے پروفیسر رہے ۔ قیامِ پاکستان کے بعد سندھ مدرسہ کالج کراچی کے پرنسپل مقرر ہوئے ۔ پھر انہیں مرکزی حکومتِ پاکستان کی انتظامیہ میں لے لیا گیا جہاں سے وہ ڈپٹی سیکرٹری محکمہ تعلیم کے عہدے سے ریٹائر ہوئے ۔ اب وہ سندھ یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی ادب کے صدر ہیں ۔ دوسرے صاحبزادے لاہور کے مشہور ڈاکٹر میجر خلیل واسطی ہیں جو اِن دنوں کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور کے پروفیسر ہیں ۔

سیّد محمد سلیم واسطی، پروفیسر ایم اے غنی کے تیسرے صاحبزادہ ہیں ۔ یہ لاہور میں ۲۲ دسمبر ۱۹۱۴ء کو پیدا ہوئے ۔ ابتدائی تعلیم میونسپل پرائمری سکول لنگے منڈی لاہور میں پائی ۔ انٹرنس کا امتحان اسلامیہ ہائی سکول شیرانوالہ گیٹ لاہور سے ۱۹۳۲ء میں پاس کیا اور بی اے آنرز کی ڈگری ۱۹۳۶ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے حاصل کی ۔ کئی سال بعد پنجاب یونیورسٹی سے جرنلزم کا ڈپلومہ لیا ۔

گورنمنٹ کالج لاہور سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد آپ سرکاری ملازمت میں منسلک ہوگئے اور مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ اب لاہور کی سول سیکرٹریٹ میں ویسٹ پاکستان مینیم ویجز بورڈ کے سیکرٹری ہیں۔

اِن پر اِن کے خاندانی ماحولِ علم و ادب کا گہرا اثر ہے۔ ملازمت کی بندشوں کے باوجود بلند پایہ کتب کا مطالعہ اور علمی و ادبی مجالس میں شرکت آپ نے کبھی نہیں چھوڑی۔ طبیعت بے فکر، بذلہ سنج اور لاابالی لے کر آئے ہیں۔ ظرافت و مزاح کا خاصا عنصر پایا جاتا ہے۔ یہ خصائص اِن کے کلام کا زیور ہیں۔ شعر عام روش سے ہٹ کر کہتے ہیں۔ کلام ترنم سے پڑھتے ہیں اور خوب سماں باندھ دیتے ہیں۔

○

○

بولو بڑی خوشی سے عدو سے ہزار جھوٹ
جانو گے ہم سے بولے اگر ایک بار جھوٹ

ہم نے کہا کہ آپ کا عہدِ وفا غلط
کہنے لگے کہ آپ کا جی تو ہے پیار جھوٹ

کس کس طرح فریبِ وفا کھا رہا ہے خود
سچ مانتا ہے یہ دلِ ناکردہ کار جھوٹ

پڑتی ہے ماننی ہمیں ہر وجہِ ترکِ عہد
ہوتا ہے ان حسینوں کو کیا سازگار جھوٹ

ہم چھیڑ چھاڑ کر گئے مستی کی آڑ میں
کیا کام آگیا ہمیں یہ شاندار جھوٹ

اس خوف سے کہ اپنا کہیں جھوٹ کھل نہ جائے
گھبرا کے بول دیتے ہیں ہم اور چار جھوٹ

حیران ہیں کہ اب کریں کیا کاروبار ہم
دنیا میں آج کل ہے سبھی کاروبار جھوٹ

باندھا ہے خوب جھوٹ کو ہر ایک شعر میں
تیری غزل میں واسطیؔ ہے بے شمار جھوٹ

○

باقی تھی جاں مریض ہیں کھا کر جگر کی چوٹ
دم ہی نکل گیا جو لگی چارہ گر کی چوٹ

پیٹا رقیب کو تو دکھانا پڑا اُنہیں
گھٹنوں کی چوٹ پیٹھ کی چوٹ اور سر کی چوٹ

پرسش کو میری آئے تو تھا چارہ گر بھی واں
بسمل تھا وہ بھی کھاتے ہی تیرِ نظر کی چوٹ

لڑتے ہیں سینہ تان کے رہزن سے راہرو
اُٹھتے نہیں مگر جو لگے راہبر کی چوٹ

اک روز مجھ پہ لغزشِ پا سے وہ گر پڑے
تھی کیا لطیف ہائے وہ اس سیم بر کی چوٹ

کھاتے رہے ہیں چوٹیں سدا راہِ عشق میں
اے چارہ گر دکھائیں تمہیں ہم کدھر کی چوٹ

انسانیت ہے نوحہ کناں آج تک سلیمؔ
ابلیس سے بشر کو لگی ہے جو شر کی چوٹ

○

○

لگتا تھا دُور سے کسی سروِ چمن کا ناچ
دیکھا جو پاس آ کے تھا اک زہرہ فن کا ناچ

تازہ مشامِ جاں ہیں معطر ہے سب فضا
محفل میں ہو رہا ہے جو مشکِ ختن کا ناچ

بجلی چمک رہی تھی قریبِ آفتاب کے
وہ تیرا جسم اور وہ تیرے پیرہن کا ناچ

انساں کو ناچ ناچنے پڑتے ہیں سینکڑوں
لیکن خدا بچائے نہ رنج و محن کا ناچ

دیوانہ وار بڑھتا گیا سرفروشِ قوم
یہ دیکھنے کہ کیسا ہے دار و رسن کا ناچ

کیوں واسطیؔ سوختہ جاں کو ہو چھیڑتے
دیکھو نہ بدنصیب کے دل کی جلن کا ناچ

○

اے صنم زاہدوں کی راہ سے بچ
خاص کر پیرِ خانقاہ سے بچ

مئے الفت سے روکنا ہے گناہ
تُو بھی پی زاہد اس گناہ سے بچ

ہجر سے کم نہ ہوگا رنجِ وصال
پاس اگر زر نہیں تو بیاہ سے بچ

آ فقیروں کے پاس شاہی کر
لے خرد قربِ بادشاہ سے بچ

کہیں تحسین مضحکہ ہی نہ ہو
بے ہنر ایسی واہ واہ سے بچ

اُس کی رحمت سے کیوں ہے تُو مایوس
اے گنہگار! اِس گناہ سے بچ

واسطی خیر چاہتا ہے اگر
بُتِ ایماں شکن کی چاہ سے بچ

○

نصیحت تری کم نہیں ستم سے ناصح
بھلا ہو گی مے ترک کیا ہم سے ناصح

نہیں زندگی یہ بھی کچھ اس سے کمتر
ڈرائیے نہ ہم کو جہنم سے ناصح

تجھے سن کے میخوار پیتے ہیں بھر بھر
ہے محفل میں رونق ترے دم سے ناصح

اِدھر مے بھی ہے۔ دلبرِ نازنیں بھی
اُدھر مر رہا ہے اِسی غم سے ناصح

وہ دینے کو تھا بزم کو درسِ تقوےٰ
ہوا مست مطرب کی چھم چھم سے ناصح

ہر اک کو خطا کار ہے تو سمجھتا
تجھے کد ہے کیوں سارے عالم سے ناصح

بہت میرے مرنے پہ میخوار روئے
بہت خوش ہوا میرے ماتم سے ناصح

بہت تنگ اولادِ آدم ہے اُس سے
بہت تنگ اولادِ آدم سے ناصح

سبق سادگی کا پڑھا کر ہے بھرتا
شکم اپنا مرغِ مسلّم سے ناصح

قبا پر تری کیا نظر آ رہے ہیں
گلابی سے یہ داغ مدھم سے ناصح

اُلجھ ہی پڑا میکشوں سے وہ کل شب
اِسی کشمکش میں گرا دھم سے ناصح

پیٹے ہو گئے تم کوچۂ واسطی میں
نظر آ رہے ہو جو برہم سے ناصح

○

قلب و جگر کی سمت ہے تیرِ نظر کا رُخ — تیرِ نظر کی سمت ہے قلب و جگر کا رُخ

اے کاش یوں بھی ہو کبھی تاثیرِ جذبِ دل — تو میرے گھر کا رخ کرے میں تیرے گھر کا رُخ

اب جی میں ہے کہ پیرویٔ راہزن کریں — منزل نہیں اُدھر ہے جدھر راہبر کا رُخ

اللہ رے جذبِ شوق کہ سجدہ جدھر کریں — ہوتا ہے سر کے سامنے ہی تیرے در کا رُخ

کوشش ہے دوستوں کی کہ چھوٹے ترا خیال — چھُٹتے ہی اُن سے کرتا ہوں میں تیرے گھر کا رُخ

بس ہاتھ میری نبض پہ رکھتے ہی ہو گیا — قبلے کی سمت پھر دعا چارہ گر کا رُخ

خوش فہمی مجھ کو اور عدو کو یہی رہی — میری طرف تھا بزم میں اُس جلوہ گر کا رُخ

ہم سوچتے تھے بھول گئے ہو تسلیم کو
صد شکر ہے کہ تم نے کیا تو اِدھر کا رُخ

○

فرقت میں اُن کی رنج کے سارے اثر لذیذ — شیریں ہے آبِ چشم و کبابِ جگر لذیذ

دشنامِ یار مے کا مزہ دے گئی ہمیں — تھی تیز اور تلخ بہت تھی مگر لذیذ

دل لے گئے وہ اور مرا سر کھا گیا رقیب — دل اُن کو اور اس کو ہوا مغزِ سر لذیذ

رخسار اور آنکھ کے بوسے لیے جو آج — کتنے تھے کیا کہوں یہ ترے خشک و تر لذیذ

آدم کے تجربے سے یہ معلوم ہو گیا — گندم ثمر سے خلد کے ہے بیشتر لذیذ

گذری شبِ وصال تو نیند آئی صبحدم — پُر کیف رت جگا تھا تو خوابِ سحر لذیذ

شعروں میں تیرے کتنی حلاوت ہے واسطی
کچھ کم ہی ہم نے دیکھے ہیں اتنے ثمر لذیذ

○

نورِ سحر بھی چھائے گا، ظلمتِ شام سے گزر
ہوگی ضرور عید بھی، ماہِ صیام سے گزر

بعدِ سلام لے صبا، کہنا مرا بھی ماجرا
جب بھی ترا ہو روضۂ خیرِ انامؐ سے گزر

تیز ہے زیست کا سفر، چال کو اپنی تیز کر
بچھڑے گا کارواں سے تو، دیکھ قیام سے گزر

حرص و ہوا کی دیویاں، راہ میں دیں گی جھلکیاں
ورنہ ملیں گی تلخیاں، اُن کے پیام سے گزر

فتنہ و شر کا ہے یہ دور، مکر و فریب کے ہیں طور
گوشے میں بیٹھ، جام پی، دہر کے دام سے گزر

دیکھا ہے یہ ہزار بار، رک ہی گیا ہے کاروبار
جب بھی انہوں نے ہے کیا منظرِ عام سے گزر

خوفِ خدا تو کر سلیم، ساقی ہے اور شے کا جام
ماہِ صیام اور یہ کام! کارِ حرام سے گزر

دلِ فرقت زدہ میں برقِ تپاں کا انداز
گریۂ چشم میں ہے آبِ رواں کا انداز

کم نہیں لطف سے بھی جور کہ نظروں میں تو ہیں
راحتِ جاں ہے ہر اک دشمنِ جاں کا انداز

آخرِ کار اُتر آئی پری شیشے میں
وہ مرا شوقِ تمنّا وہ زباں کا انداز

وعظ کے حیلے سے دیدار کو اُن کے آنا
واعظِ پیر میں ہے حرصِ جواں کا انداز

اُن کا اندازِ کرم خلد میں بھی یاد آیا
ہم کو بھایا نہیں کچھ حورِ جناں کا انداز

تیری صحبت میں خزاں بھی ہے بہاروں سے سوا
تو نہ ہو جب تو بہاروں میں خزاں کا انداز

خشمگیں ہو کے اتر آئے ہو کیوں گالی پہ
یہ زباں کیسی ہے صاحب یہ کہاں کا انداز

بولے وہ واسطی کی جرأتِ رندانہ پہ
مجھ کو بھاتا ہے اسی مردِ جواں کا انداز

تیری جبیں پہ بل مری افسردگی کا راز
اور مسکراہٹیں تری میری خوشی کا راز

رازِ حیات کی ہے تلاش ابلہوں کو آج
داناؤں سے تو حل نہ ہوا زندگی کا راز

خود جس کے جلووں نے مجھے بے خود بنا دیا
وہ مجھ سے پوچھتے ہیں مری بے خودی کا راز

توصیفِ حسنِ دوست ہے گو سعیِ رائگاں
کوشش مگر یہی ہے مری شاعری کا راز

آئے وہ اپنی زلفیں پریشاں کئے ہوئے
خُل پہ کھل گیا مری دیوانگی کا راز

دیکھا تو جھانکتے تھے وہ کھڑکی سے رات کو
حیراں تھا گلی میں ہے کیا چاندنی کا راز

وہ شوخ جا رہا ہے جو صد کبر و ناز سے
اِک وہ ہی جانتا ہے فقط واسطی کا راز

حیف ہے ہم کو یادِ یار کا ہوش
ہے خزاں کا نہ کچھ بہار کا ہوش

یوں چمن میں وہ بے نقاب آئے
اڑ گیا دیکھ کر بہار کا ہوش

عشق کی یہ بھی ایک منزل ہے
اپنے گھر کا نہ کوئے یار کا ہوش

تابِ نظارۂ جمال کسے
اب کہاں اُن کے ہوشیار کا ہوش

اُن کے لب ہیں لبِ مسیحائی
اُن کی آنکھیں ہیں مے گسار کا ہوش

غمِ دوراں کے سر ہے یہ الزام
نہ رہا ہم کو اُن کے پیار کا ہوش

تیرے دیوانے کا ہے وہ عالم
اب رسن کا اُسے نہ دار کا ہوش

اُن کے وہ خندہ ہائے دُزدیدہ
لے اڑے واسطیِ زار کا ہوش

○

لکھا تھا ہم نے اُن کو فقط ایک بار خط — دھمکی کے آئے ہم کو رقیبوں سے چار خط
اُن کو پڑھے بغیر وہ گو پھینکتے رہے — پر ہم بھی اُن کو لکھتے رہے بار بار خط
کہنے لگے کہ خود اُسے جائیں گے ڈھونڈنے — کم بخت نے نہیں بھیجے ہیں بے شمار خط
ہے کیا عجب جفا پہ وہ نادم ہوں اور خود آئیں — لکھا ہے فرطِ شوق سے اِک شاہکار خط
نزدیک کا ہے پیار کہ ہو ہمکنار دوست — اور دور ہو جو دوست تو ہے اُس کا پیار خط
گر خط نہ ہو تو گھٹ کے ہی رہ جائے زندگی — دنیا کے کاروبار کا دار و مدار خط

یہ مسکراہٹیں ترے چہرے پہ واسطی
آیا ہے شاید اُن کا کوئی شاندار خط

○

جس شام دن میں چل دیا کہہ کے وہ یار الوداع — ہوش و حواس الفراق، صبر و قرار الوداع
عشق کی بھینٹ چڑھ گئے مال و منال ننگ و نام — رہ گئی تھی یہ جانِ زار یہ بھی نثار الوداع
ہائے شہیدِ عشق کی موت بھی کیا عظیم تھی — کہتے گئے تھے دوست یار سلسلہ وار الوداع
ہم نے اٹھا لیا ہے آج باغ سے اپنا آشیاں — سات سلام باغباں، کبک و ہزار الوداع
بن گیا تھا یہ خارزار تیرے قدم سے لالہ زار — تو ہی نہیں تو عشرتِ باغ و بہار الوداع
تھیں یہ تمام رونقیں وقتِ شباب ہی کے ساتھ — یہ نہ رہا تو چھیڑ چھاڑ بوس و کنار الوداع
مرنے کا اب ہو غم ہی کیا آ کے وہ بہرِ فاتحہ — کہنے لگے چوم چوم کر سنگِ مزار الوداع

دہر کے جاہ و مال پہ کر نہ غرور واسطی
کہنی پڑے گی اِن کو بھی آخر کار الوداع

○

○

قلبِ رقیب باعثِ کینہ رہا ہے داغ داغ
قلب تو اک طرف تمام سینہ ہوا ہے داغ داغ

پڑنے لگی ہیں مدبھری نظریں کسی کی بار بار
جامۂ اتقا مرا ہونے لگا ہے داغ داغ

زلفِ سیاہ دیکھ کر ابرِ سیاہ رو دیا
چہرے کی دیکھ کر چمک چاند ہوا ہے داغ داغ

سکتہ ہوا ہے سرو کو قامتِ یار دیکھ کر
رخ کا نکھار دیکھ کر گل بھی ہوا ہے داغ داغ

جل رہے ہیں عدو کے گھر آمدِ یار پر چراغ
سوزِ غمِ فراق سے سینہ مرا ہے داغ داغ

ٹپکے جو اشکِ انفعال حکم دیا رحیم نے
جا کہ ترے گناہ کا دھویا گیا ہے داغ داغ

تیرے مزاج کے طفیل قلبِ سلیمؔ واسطی
گاہ رہا ہے باغ باغ گاہ رہا ہے داغ داغ

○

تیرے بالوں میں ہو جیسے دُرِ غلطاں کا چراغ
ہے شبِ تار میں روشن دلِ سوزاں کا چراغ

اُف وہ شادابیٔ موسم کہ لگی تھی اک آگ
ہر گلِ تر نظر آتا تھا گلستاں کا چراغ

ہو گئے سرد سبھی کفر کے آتش خانے
جبکہ ضو ریز عرب میں ہوا یزداں کا چراغ

دن کو غم خوار تھی دھندلی سی ضیا روزن کی
مونسِ بیکسیٔ شب ہے مرے زنداں کا چراغ

قلب پر راہزنی ہائے الم کے باوصف
ہمت افزا رہا مجھ کو ترے ارماں کا چراغ

قلبِ واعظ کو ریا مانعِ تنویر رہی
یوں وہ دنیا کو دکھاتا پھرا قرآں کا چراغ

تیرے ہوتے کسی فانوس کی حاجت کیا ہے
ہے ترے چہرے کی تنویر شبستاں کا چراغ

تیرہ بختی میں سسکتی سی پڑی جانِ سلیمؔ
ایسی ہے جیسے کہ ہو گورِ غریباں کا چراغ

○

○

اک عرضِ مدعا ہے، کرو گر خطا معاف — دِل تم پہ آ رہا ہے، مگر ہو سزا معاف

ہوتی ہے اِن حسینوں کو جور و جفا معاف — یہ قتل بھی کریں تو ہے اِن کی خطا معاف

خود حُسن ہے سفارشِ اوّل حسین کی — اکثر ہوئی ہے دیکھ کے اُس کو سزا معاف

کی عرض میرے جرم ہیں رحمت سے گر فزوں — دے دیجئے سزا مجھے، آئی صدا معاف

جو بندگانِ حق پہ کرے جور ناروا — کر دے گا اُس کو کیسے بھلا پھر خدا معاف

چھوڑا نہ میں نے کوئی بھی موقع گناہ کا — پر وہ رحیم بھی مجھے کرتا رہا معاف

چوما جو اُن کو کہنے لگے پھر نہ ہو یہ بات — تم آدمی بُرے نہیں اب کے کیا معاف

لپٹے وہ واسطی سے، منانے کے واسطے
اُس نے بھی خوب دیر لگا کر کیا معاف

○

رقیب اُس بزم میں رہتا ہے اکثر میرے آنے تک — نہیں آتی نظر پھر اُس کی صورت میرے جانے تک

بڑی مشکل سے تنکے تنکے کر کے اس کو جوڑا ہے — کوئی بجلی نہ آ پہنچے الٰہی آشیانے تک

بہت چنگیزیاں کرتے رہے جو زندگانی میں — بالآخر ایک دن اُن کو بھی چھوڑ آئے ٹھکانے تک

مرے اندوہ کی لہریں ہیں تسکین تیرے ملنے کی — مرے گلشن میں رونق ہے تو تیرے مسکرانے تک

پھر اس کے بعد الٰہی کیوں یکایک رک گیا طوفاں — نہایت برق کی تیزی کیا مرا خرمن جلانے تک

بہت تلملا رہا، ہٹتا رہا، بیکتا رہا یہ دل — تمہارا تیر جا پہنچا مگر اپنے نشانے تک

انہیں آغوش میں لے ہی لیا اک روز مستی میں — بہانے اُن کے لئے آئے ہیں بھی اس بہانے تک

پھر اس کے بعد کوئی اور در دیکھے۔ یہ ناممکن — کوئی دیوانہ آ پہنچے جو تیرے آستانے تک

گدا ہے اصل میں دربارِ سرکارِ دو عالمؐ کا
سلیمِ واسطی اک دھوم ہے جس کی زمانے تک

اے خوشا قسمت وہ بت ہے میرا مہماں آج کل
میرا ویرانہ ہے رشکِ صد گلستاں آج کل

زخمِ دل بھرنے لگے ہیں کیا مریضِ عشق کے
تاک میں ہے پھر نگاہِ نازِ جاناں آج کل

کیا بہار آنے کو ہے اٹھنے لگے ہیں خود بخود
ہاتھ دیوانوں کے پھر سوئے گریباں آج کل

فصلِ گل آئی ہے اور پھر ہو رہے ہیں انتظام
تاکہ مستحکم رہے دیوارِ زنداں آج کل

میں ہوں اُن کا میہماں اور ان کا ہمسایہ رقیب
مر رہا ہے وہ کنارِ آبِ حیواں آج کل

شیخ کو اک روز دھوکے میں پلا دی تھی شراب
بن گیا ہے دیکھئے اب کیسا انساں آج کل

میں ہوں اور آغوش میں وہ ماہرو ساغر بدست
پاس پھٹکیں پھر بھلا کیا رنج و حرماں آج کل

ہر قدم پر حسن رہزن، ہر نظر قاتل صفات
کس قدر مشکل ہے مجھ کو حفظِ ایماں آج کل

وہ بتانِ کافر اور نرغے میں اُن کے واسطی
اک مصیبت میں ہے یہ مردِ مسلماں آج کل

کیا حسیں موقعے گنوائے اِس تذبذب نے مرے
سوچتا ہی رہ گیا ایسا نہ ہو ویسا نہ ہو

نامہ بر ہر روز میرے گھر سے جاتا ہے گذر
منتظر رہتا ہوں تیرا خط کہیں لایا نہ ہو

کس طرح کا میٹھا میٹھا درد زخمِ دل میں ہے
یہ عطا اُس کی ہے یارب زخم یہ اچھا نہ ہو

اُن کو چھیڑا جب ہنسی میں، اُٹھ کے وہ کہنے لگے
کیا غضب کرتے ہو، ہٹ جاؤ کوئی آتا نہ ہو

آج کل مجھ سے وہ پہلا سا نہیں ہے التفات
میں بھی سمجھوں گا عدو سے اُس نے بہکایا نہ ہو

اور بھی ہوں گے جہاں میں رند اور شاہد پرست
واسطی کی طرح لیکن کوئی بھی رسوا نہ ہو

قمر صدیقی ایم اے

۳۰ ستمبر ۱۹۲۹ء کو جالندھر میں پیدا ہوئے۔ جب ہوش سنبھالا تو خود کو سبوہارہ ضلع بجنور میں پایا۔ ابھی دس گیارہ سال ہی کی عمر تھی کہ شفقتِ پدری سے محروم ہو گئے۔ والدہ ماجدہ نے سخت محنت مشقت سے پالا پوسا۔ ابتدائی اور ثانوی تعلیم ضلع نینی تال میں مکمل کی اور پاکستان فضائیہ میں چلے گئے۔ لیکن طبعِ شاعرانہ کی بنا پر یہاں نباہ نہ کر سکے۔ اور وہاں سے چھٹکارا حاصل کر کے ادبی ماحول میں آ بسے۔ اعلیٰ تعلیم پنجاب یونیورسٹی سے حاصل کی۔ مختلف سرکاری ملازمتوں کے بعد آخر ش سلسلہ درس و تدریس پر آ کر ٹھہرا۔ آج کل ایک مقامی پرائیوٹ کالج کے شعبۂ ادبیاتِ اردو کے انچارج ہیں۔

شاعری کے باب میں استادی شاگردی کے قائل نہیں۔ ابھی پندرہ سال ہی کی عمر تھی کہ شعر موزوں کرنے لگے تھے۔ مسلسل مطالعہ اور فن سے لگن نے شاعری کو اُجال دیا۔ عموماً فی البدیہہ کہتے ہیں۔ اکثر طرحی غزلیں مشاعرہ گاہ میں کہی ہیں۔ شعر گوئی کے لئے وقت یا مقام کی قید نہیں۔ جب اور جہاں تحریک ہوئی شعر کہہ لئے۔ حافظہ روشن ہے۔ متقدمین اور جدید شعراء کا کلام ہمیشہ زیرِ مطالعہ رہتا ہے۔ اکتسابِ فن ان کا پسندیدہ شغل ہے۔ جہاں سے اور جس کسی سے کام کی بات مل جائے ذہن میں بے تکلف منتقل ہو جاتی ہے۔ انہیں اپنے فن سے عقیدت ہے اور اسے زندگی کا حاصل سمجھتے ہیں۔

○

بھٹکے ہوئے رہتے ہیں کئی دن سے خیالات
کیا جانیے کیا پیش کریں ارض و سماوات

پھر درپئے آزار ہوئی گردشِ حالات
پھر چھوڑنا پڑ جائے گا یہ شہرِ طلسمات

ساغر ہیں شکستہ کبھی ساقی نہیں موجود
اس حال میں آئے بھی تو کیا لطف دے برسات

راحت کو بھی منسوب کیا رنج و الم سے
اس درجہ مرے دل میں غموں کی ہوئی بہتات

سُن غور سے اک روز ہو ذوقِ سماعت
خاموشی سے پیغام دیا کرتے ہیں ذرات

مل جائیں سرِ راہ تو کھلتے نہیں واعظ
میخانے میں ہوتی ہے مگر خوب ملاقات

کیوں محفلِ رنداں میں بھی خاموش قمر ہیں
معلوم یہ ہوتا ہے کہ اچھے نہیں حالات

○

ہے اس لئے عزیز مجھے یہ جگر کی چوٹ
بخشی ہوئی ہے خاص کسی فتنہ گر کی چوٹ

یہ اور بات آپ نے دیکھا نہیں اِدھر
محسوس کر رہا ہوں ابھی تک نظر کی چوٹ

جو لوگ سنگدل ہیں مروت سے دور ہیں
ان پر نہ پڑ سکے گی ہمارے ہنر کی چوٹ

منزل پہ آئے ہم کو زمانہ گذر گیا
تازہ ہے دل پہ گردِ سرِ رہگذر کی چوٹ

میرا ہی نامہ لے کے وہ آیا جواب میں
کھائی ہے میں نے دل میں ترے نامہ بر کی چوٹ

اشکوں کے بدلے سارے جہاں کو خرید لوں
ہر شے سے قیمتی ہے مری چشمِ تر کی چوٹ

وہ دور ہیں تو چاند ستاروں کو کیا کروں
شدت سے پڑ رہی جگر پہ قمر کی چوٹ

○

ہوگا اُدھر ہی گردشِ شام و سحر کا رُخ
یعنی جدھر ہُوا تری نیچی نظر کا رُخ

کیا دیکھتے ہیں آپ ہمارے جگر کا رُخ
بس مسکرا کے پھیر دیے تیر و تبر کا رُخ

آیا کبھی جو بام پہ وہ رشکِ صد غزال
کیوں پڑ گیا ہے ماند سا شمس و قمر کا رُخ

ہم کو بھی آشیاں میں چراغاں کا شوق ہے
اے کاش! اِس طرف بھی ہو برق و شرر کا رُخ

اِس راستے میں شیخ جی! پڑتا ہے میکدہ
ہے بے خبر سے جناب اِدھر یہ کدھر کا رُخ

کیا جانے اُن کے کوچے سے لایا ہے کیا خبر
کیوں فق سا ہو رہا ہے مرے نامہ بر کا رُخ

رسوائیِ خیال ہمیشہ ہوئی نصیب
ہم پھر بھی کر رہے ہیں تری رہگذر کا رُخ

لگتی ہے کچھ عجیب نئی شاعری اِسے
ہرگز نہ پھر سکے گا اِدھر کو قمر کا رُخ

خوابِ حسین ترے سے جگایا گیا ہوں میں
یہ کس خطا پہ ہوش میں لایا گیا ہوں میں

اب تک ہے میرے ذہن میں خوشبو بسی ہوئی
پھولوں کی انجمن سے اُٹھایا گیا ہوں میں

لوح و قلم بھی میرے لئے اشکبار ہیں
حرفِ غلط سمجھ کے مٹایا گیا ہوں میں

شاید بنانے والے نے سمجھی ہو مصلحت
اپنی نگاہ سے بھی چھپایا گیا ہوں میں

اتنا کرم ضرور ہُوا تیری یاد سے
تاروں کی روشنی میں سُلایا گیا ہوں میں

یہ حشر ہے یہاں مجھے آرام چاہیئے
دنیا میں ہر قدم پہ ستایا گیا ہوں میں

میرا مقام عرش تھا اب فرش ہے قمر
کتنی بلندیوں سے گرایا گیا ہوں میں

○

یوں ہوئی رسمِ رہروی خاموش
لوگ کرتے ہیں رہزنی خاموش

زندگی یوں گزر نہیں سکتی
ہم بھی خاموش آپ بھی خاموش

جس میں خوش رنگ پھول کھِلتے تھے
اب وہ رُت بھی گزر گئی خاموش

تبصرے ہو رہے ہیں یُوں ہم پر
اپنے گویا ہیں اجنبی خاموش

اتنی تشہیر کب مناسب ہے!
کیجئے ہم سے دوستی خاموش

کوئی پروانہ داد دے نہ سکا
شمع محفل میں جل بجھی خاموش

کس ڈگر پر حیات چل نکلی
دوستی حیب ہے دشمنی خاموش

کُنجِ تنہائی سے تعلق ہے
کٹ رہی ہے بڑی بھلی خاموش

میکشی کے بھی کچھ قرینے ہیں
با ادب بیٹھ اور پی خاموش

کوئی چہرہ تو آشنا ہوتا
پھر رہے ہیں گلی گلی خاموش

کیوں ادب پر جمود سا ہے قمرؔ
مدتوں سے ہے شاعری خاموش

○

○

بخشش کی اگرچہ مجھے اُمید نہیں خاص
چمکیں گے سرِ حشر مرے داغِ جبیں خاص

یوں ہی غمِ حالات پہ کچھ سوچ رہا ہوں
جانے غمِ محبوب کوئی بات نہیں خاص

اندازہ تو کیجیے مرے معیارِ نظر کا
فہرست میں آتے ہیں مری زہرہ جبیں خاص

کچھ ایسا ستاتا ہے زمانہ مجھے ساقی
دنیا کو کیا ترک، بس آتا ہوں یہیں خاص

جھکتی ہے جو ہر در پہ وہ ہوتی ہے جبیں عام
جھکتی ہے جو اُس در پہ وہ ہوتی ہے جبیں خاص

جلوے تو ہر اِک حال میں مرکوزِ نظر ہیں
کچھ پردہ نشیں عام ہیں کچھ پردہ نشیں خاص

آئے ہیں قمرؔ عارضی انداز میں ہم تو
کیا سوچ کے ہوتے ہیں یہاں لوگ مکیں خاص

○

دستِ حنائی سے جو لکھے وہ نگارِ خط
مضموں ہو عطر بیز، تو ہو مُشکبارِ خط

ایک ایک لفظ تھا غمِ ہستی کا آئینہ
موصول کل ہوا ہے مجھے اِک دلفگار خط

منزل کا علم، اور نہ قاصد کی کچھ خبر
تحریر کر رہا ہے غریب الدّیار خط

اُس بے وفا سے ایک شکایت رہی مجھے
مضموں تھا سب کا ایک، لکھے بے شمار خط

اِس طور لکھ کہ آنکھ سے آنسو نکل پڑیں
لکھتے سے روز روز کے، لکھ ایک بار خط

مُدّت کے بعد اُس نے یہ فقرہ لکھا مجھے
"پیارے قمرؔ! لکھو نہ ہمیں بار بار خط"

○

○

گرچہ نہ کر سکے سحر و شام کا لحاظ — ہم نے سدا کیا دلِ ناکام کا لحاظ

پہنچے ہیں دشت میں گل و غنچہ کو چھوڑ کر — ہم نے کیا ہے گردشِ ایام کا لحاظ

رکھنا ہے تُو جو جلوۂ محبوب کی طلب — کرنا پڑے گا پہلے در و بام کا لحاظ

پھر دیکھیے کہ ہوتی ہے تکمیل کس طرح — آغاز میں جو کیجیے انجام کا لحاظ

واعظ کی شخصیت میں کوئی دلکشی نہیں — کرتے ہیں لوگ جامۂ احرام کا لحاظ

صیاد! باشعور پرندوں کو داد دے — گر گر کے کر رہے ہیں ترے دام کا لحاظ

اِک بار بھی نہ ہنس کے بھرا ساغرِ طلب — ساقی نے بھی کیا نہ مرے جام کا لحاظ

خلوت میں بھی ملا ہے مرا چاند لے قمرؔ
جلوت میں بھی کیا ہے مرے نام کا لحاظ

○

کوچۂ جاناں میں مجھ کو کھینچ کر لاتا ہے دل — دوستی کے روپ میں دشمن ہوا جاتا ہے دل

زندگی کی آگ نے کندن بنایا ہے اسے — کثرتِ آلام میں کتنا سکوں پاتا ہے دل

کاش مل جائے کہیں سے روشنی عرفان کی — ہر قدم پر ہم نشینو! ٹھوکریں کھاتا ہے دل

سرمئی سائے فضا میں ہر طرف چھانے لگے — کوئی اُن سے جا کے یہ کہہ دے کہ گھبراتا ہے دل

میکدے سے دُور اُکساتا ہے ترکِ جام پر — میکدہ نزدیک آتے ہی مچل جاتا ہے دل

آج توڑا ہے یقیناً اُس نے پیمانِ وفا — "ڈوبی جاتی ہیں نبضیں بیٹھا جاتا ہے دل"

نصف شب سے اس لئے مجھ کو عقیدت ہے قمرؔ
نصف شب ہوتے ہی اکثر اشک برساتا ہے دل

○

○

میں شاعر ہوں پرواز ہے لامکاں تک
رسائی ہے میری غمِ دو جہاں تک

بیاباں بھی گلزار ہو جائے اک دن
بہاریں ہیں محدود کیوں گلستاں تک

ابھی تو صراحی شکستہ ہوئی ہے
کہیں بات پہنچے نہ پیرِ مغاں تک

بڑے مرحلے ہیں بڑے فاصلے ہیں
ہماری جبیں سے ترے آستاں تک

ابھی سے تجھے نیند آنے لگی ہے
فسانہ چلے گا نہ جانے کہاں تک

نہ پوچھو کہ ہم لوگ پہنچے ہیں کیونکر
نشاطِ سخن سے غمِ بے کراں تک

کبھی آتشِ گل کچھ اس طرح بھڑکے
منور ہو گلشن مرے آشیاں تک

یہ چشمے یہ کہسار بھی دیدنی ہیں
نہ محدود کر خود کو حسنِ بتاں تک

مصائب نے کس موڑ پر لاکے چھوڑا
گریزاں ہوئی مجھ سے عمرِ رواں تک

کبھی قصۂ دل جو ہم نے سنایا
بگولے زمیں سے چلے آسماں تک

قمرؔ عشق تو ایک جنسِ گراں ہے
نہ محدود کر اس کو سود و زیاں تک

○

ہر کلی میں موج زن ہے آج سامانِ بہار　　کتنا مشک انگیز ہے لے دوست دامانِ بہار
ہر نئی کونپل بہار جاوداں کی ہے نقیب　　پتہ پتہ ہے گلستاں میں ثنا خوانِ بہار
اس روش سے اس روش تک روشنی کا ہے سماں　　دیدنی ہے ہم نشیں جشنِ چراغانِ بہار
بن گئے ہیں خوبصورت پھول جزوِ زندگی　　ہر نظر میں بس گیا ہے حسنِ تابانِ بہار
موجِ نکہت سرحدِ افلاک کو چھونے لگی
آسماں سے گفت گو کرتا ہے ایوانِ بہار

جدھر دیکھا اُدھر یلغار تھی غم ہائے دوراں کی　　یہی تعبیر تھی شاید میرے خوابِ پریشاں کی
غم حالات سے گھبرا کے جب سر پھوڑنا چاہا　　اسیروں سے گریزاں ہو گئی دیوار زنداں کی
میں فصلِ گُل سے پہلے اپنا دامن چاک کر بیٹھا　　الٰہی لاج رہ جائے میرے چاکِ گریباں کی
چمک کر دل کے داغوں نے اُجالا کر دیا دل میں　　چلو اچھا ہوا صورت نظر آئی چراغاں کی
تجھے کیا علم شہرت ہو گئی ہے ایک عالم میں
تیری زلفِ پریشاں کی میرے حالِ پریشاں کی

بُرا کیا کہ بہاروں سے دل لگا بیٹھے　　تیری گلی کے نظاروں سے دِل لگا بیٹھے
بہت تلاش کیا زندگی کی راہوں میں　　غمِ حیات کے ماروں سے دِل لگا بیٹھے
ہمیں چمن کی فضائیں کبھی نہ راس آئیں　　ملے نہ پھول تو خاروں سے دِل لگا بیٹھے
ڈبو دیا انہیں طوفاں نے غم کی لہروں میں　　جو تنگ آ کے کناروں سے دِل لگا بیٹھے
قدم قدم پہ ستایا قمر زمانے نے
بڑے عجیب سہاروں سے دل لگا بیٹھے

ڈاکٹر حشمت آرا حجاب

نام حشمت آرا، تخلص حجاب۔ آج سے تقریباً ۴۸ برس قبل بارہ بنکی نواب گنج (بھارت) میں پیدا ہوئیں۔
بارہ بنکی میں آپ کا خاندان اسلامی روایات کی تابندہ نشانی سمجھا جاتا تھا۔ انہوں نے اپنے جید عالم
باپ کے زیرِ تربیت قرآن مجید کا گہرا مطالعہ کیا اور مذہبی علوم حاصل کئے۔
شاعری کی ابتدا تقریباً گیارہ سال کی عمر سے ہوئی اور اس کا محرک والدہ کے انتقال کا سانحہ تھا۔
اس کے بعد زندگی شعر و ادب سے وابستہ ہو کر رہ گئی۔
سرگرم ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۳۰ء میں "خاتونِ مشرق" میرٹھ کی مدیرہ معاون کی حیثیت سے ہوا۔
۱۹۳۶ء میں یونیورسل ہومیو پیتھک کالج رجسٹرڈ سے ہومیو ڈاکٹری پاس کی۔ ۱۹۳۷ء میں ڈاکٹر رفیق احمد
پرنسپل ہومیو پیتھک ٹریننگ سنٹر سے شادی ہو گئی۔
۱۹۴۵ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ادیب عالم کا امتحان پاس کیا۔ مذہبی ماحول میں پرورش پانے کے
باعث ان کے کلام پر بھی مذہبی خیالات اور قومی جذبات و احساسات کی گہری چھاپ ہے اور نظموں میں
ان کا یہ رنگ بہت نمایاں ہوتا ہے۔ غالب اور جگر مراد آبادی سے بہت متاثر ہیں اور اسی وجہ سے
ان کا زیادہ رجحان غزل کی طرف ہے۔ ان کے اشعار میں گہرائی بھی ہوتی ہے اور گیرائی بھی۔

دل ہے کہ بے نیازِ بہار و خزاں ہے اب
فکرِ چمن ہے اب نہ غمِ آشیاں ہے اب

پھوٹی ہوئی کرن ہے سحر کا گماں ہے اب
حدِّ نگاہ تک کوئی جلوہ فشاں ہے اب

اِک مشتِ خاک اور یہ تنظیمِ آب و گِل
میری نظر میں وُسعتِ کون و مکاں ہے اب

کیا کیا کہیں گے اُن سے یہ سوچا تھا ہم نے آج
جب آ گئے وہ سامنے ساکت زباں ہے اب

تاریکیاں بھی چھٹ گئیں اشکِ رواں کے ساتھ
برسات کا وہ موسمِ رنگیں بیاں ہے اب

بدلا ہوا چمن کا نظامِ بہار ہے
جس سمت دیکھتی ہوں خزاں ہی خزاں ہے اب

بیگانہ بن کے کیوں نہ سرِ راہ وہ ملیں
پہلی سی رسم و راہ بھی اُن سے کہاں ہے اب

اِس دورِ حادثات میں ہوں گامزن حجابؔ
ہاں میرا ہمسفر مرا عزمِ جواں ہے اب

معراجِ شوق پا گئی انسان کی تڑپ
عرشِ بریں پہ لے گئی ایمان کی تڑپ

دل کے ہر اک ورق پہ اُترتی چلی گئی
کیا تھی کتابِ عشق کے عنوان کی تڑپ

شبنم بکھر کے پارۂ سیماب بن گئی
دیکھی جو گُل کے چاکِ گریباں کی تڑپ

تحلیل آنسوؤں میں ہوا ہے غمِ حیات
دیکھی نہیں ہے آپ نے طوفان کی تڑپ

گھبرا کے اُن کو خود ہی اُلٹنا پڑا نقاب
رازآشنا تھی چشمِ پریشان کی تڑپ

کوئی بجھا سکے گا نہ روشن چراغِ دل
بادِ سحر ہو یا غمِ طوفان کی تڑپ

پھولوں کے بدلے کانٹے ہی کانٹے جہاں ملے
پھر لے چلی ہے دید کے ارمان کی تڑپ

با اعتبارِ فن تو یہ جائز نہیں حجابؔ
ہر شعر میں ہے نون کے اعلان کی تڑپ

ہے مبہت خوب مرے دیدۂ تر کی صورت — اشک پلکوں پہ چمکتے ہیں گہر کی صورت
ہے تصور میں کسی رشکِ قمر کی صورت — مطلعِ شمس و قمر ہے مرے گھر کی صورت
بھول جائے وہ چمن چاک گریباں کر لے — دیکھ لے گُل جو مرے داغِ جگر کی صورت
چھائی ہے ہر در و دیوار پہ ویرانی سی — جوشِ وحشت نے بدل دی مرے گھر کی صورت
شدتِ دردِ محبت شبِ فرقت توبہ — شاید اب ہم کبھی دیکھیں نہ سحر کی صورت
جلوۂ حسنِ ستم کیش پہ کب گذری ہے — کیوں پریشاں ہے مرے ذوقِ نظر کی صورت
دیکھ لیں وہ مری بے تابیٔ دل کا عالم — دیکھنا چاہیں اگر برق و شرر کی صورت

خیر و شر میں نہیں اب کوئی بھی تفریق حجاب
اِس زمانے میں کہاں اپنی گذر کی صورت

آئی بہار وقت کا عنواں گیا پلٹ — قصرِ جنوں بصورتِ زنداں گیا پلٹ
ہر جنبشِ نگاہ پہ لرزاں ہے زندگی — نظریں ملا کے دشمنِ ایماں گیا پلٹ
دو دن بھی ہم بہار بداماں نہ رہ سکے — آ کر کوئی بہار بداماں گیا پلٹ
ہل چل سی مچ رہی ہے دلِ بیقرار میں — شاید کسی نگاہ کا پیکاں گیا پلٹ
بھٹکے ہوؤں کو لایا رہِ مستقیم پہ — تقدیرِ کائنات اک انساں گیا پلٹ
رنگینیٔ بہارِ چمن اُن کی ذات تھی — جب وہ گئے تو رنگِ گلستاں گیا پلٹ
محسوس ہو رہا ہے یہی ہر نفس کے ساتھ — جیسے سکوں بہ حالِ پریشاں گیا پلٹ

انساں یہاں کے جورِ مسلسل سے اے حجاب
گھبرا گیا تو بے سر و ساماں گیا پلٹ

خزاں سے کوئی تعلق نہ ہے بہار کی بحث — جنوں میں رنگ بدلتی ہے اُس کے پیار کی بحث

چمن میں جس کے تبسم سے پھول کھلتے ہیں — یہاں تو ہے اُسی صد رشکِ لالہ زار کی بحث

الم نصیبوں کو ملتا نہیں قرار یہاں — نہ چھیڑیے دلِ وحشت زدہ قرار کی بحث

رہِ حیات میں یہ مشکلیں ارے توبہ — قدم قدم پہ ہے ہنگامِ روزگار کی بحث

ہر ایک بات پہ جی بھر کے بحث کر لیجے — کہ آج ختم ہی ہو جائے بار بار کی بحث

نہ تبصرہ ہے گلوں پر نہ خار پر تنقید — نہ بزمِ دہر میں وہ شبنم و شرار کی بحث

سُنا مغنّی محفل کوئی حسین نغمہ — اُنہیں پسند نہیں میرے حالِ زار کی بحث

نشانِ جادۂ منزل نہ مل سکا جس سے — ہے کارواں میں اُسی رہ کے غبار کی بحث

زبانِ لوح و قلم پہ ہے تیری حمد و ثنا — کمالِ اوج پہ پہونچی ترے وقار کی بحث

مجال کیا جو کوئی تجھ پہ تبصرہ کرنا — ہزار رنگ میں دنیا نے گو ہزار کی بحث

ہو جرم کوئی تو سولی بھی کیجئے تجویز — یہ میرا قصۂ غم ہے کہاں ہے دار کی بحث

کسی کلی کی بھی شبنم سے پیاس بجھ نہ سکی — روش روش پہ رہی گرچہ آبشار کی بحث

حجابؔ ہم تو نہ پہونچے کسی نتیجے پر
یہاں فضول ہے ایثار و اعتبار کی بحث

○

کیسے سمجھے ہو مریضِ شبِ ہجراں کا علاج — تم سے ہو گا نہ مرے قلبِ پریشاں کا علاج

نہ کیا اُس نے زباں سے کبھی اقرارِ وفا — کیا کرے اب کوئی اُس دشمنِ ایماں کا علاج

نگہِ ناز سے اک جھوٹی تسلی ہی سہی — کچھ تو ہو جائے دلِ سوختہ ساماں کا علاج

تجھ سے شکوہ بھی کریں گے تری بے مہری کا — پہلے کچھ سوچ تو لیں تنگیٔ داماں کا علاج

زندگی کے لئے ہوتی ہے کشاکش لیکن — موت کر دیتی ہے آ کر غمِ دوراں کا علاج

یہ الگ بات ہے کچھ آپ توجہ نہ کریں — آپ کے بس میں نہیں کیا مرے ارماں کا علاج

لطف اندوزِ خودی ہو کے خدا کو بھولا — کیا ہو اس عہد فراموشیٔ انساں کا علاج

کارگر ہو نہ سکی جب کوئی تدبیر حجابؔ
بن گئی حشر میں توبہ مرے عصیاں کا علاج

○

ہے شرط کہ ہو پہلے خیالات کی اصلاح — ہو جائے گی خود کہنہ روایات کی اصلاح

جو وعدے کو ایفا نہیں کرتے کبھی ان سے — ممکن نہیں پابندیٔ اوقات کی اصلاح

بدلے ہیں کئی رنگ یہاں نظمِ جہاں نے — ہوتی ہی رہی گردشِ حالات کی اصلاح

رقصاں ہیں لہو شیشہ و ساغر مے و مینا — شاید ہے کسی رندِ خرابات کی اصلاح

ہو جائے جنوں میں نہ کوئی لغزشِ بیجا — اے دل تجھے کچھ چاہیئے جذبات کی اصلاح

یہ دل ہوسِ جاہ سے جب تک نہ ہو خالی — مشکل ہے زمانے میں جنابات کی اصلاح

مانا کہ حجابؔ آپ سخن فہم ہیں لیکن
اچھی نہیں ہر بات میں بے بات کی اصلاح

○

جب جوشِ جنوں میں ہم اُن سے اظہارِ تمنا کرتے ہیں
بر ہم تو نہیں ہوتے لیکن وہ حشر کا وعدا کرتے ہیں

جن کو ہو ودیعت ہر عالم ہوں جن پہ ترے الطاف و کرم
وہ ایک اشارے سے اپنے قطرے کو بھی دریا کرتے ہیں

او تشنۂ زر کے متوالے یہ تیری سمجھ سے باہر ہے
یہ ہم کو خبر ہے دنیا میں ہم کیسے گذارا کرتے ہیں

مخمورِ شرابِ شوق ہوں میں کیوں فکرِ غمِ دنیا ہو مجھے
جو حرص و ہوس کے طالب ہیں انجام وہ سوچا کرتے ہیں

معراجِ مذاقِ شوق ہے یہ یا کوئی سفر کی منزل ہے
پاتے ہیں نہیں کو بیشِ نظر جب دیدۂ دل وا کرتے ہیں

بے ساختہ دنیا کھنچتی ہے اندازِ تکلم پر اُن کے
کس حسن سے وہ اک بات نئی ہر بات میں پیدا کرتے ہیں

اک لحظہ سکوں ہو جاتا ہے کچھ غم سے رہائی ہوتی ہے
بیتابئ دل سے گھبرا کر جب اُن کو پکارا کرتے ہیں

دنیا کی ہر اک شے پر اُن کو ہوتی ہے بہت قدرت حاصل
وہ لوگ جو دنیا میں رہ کر دُنیا سے کنارا کرتے ہیں

لگ جاتی ہے جب اپنی ہی نظر آرائشِ حسنِ رنگیں پر
آپ آئینہ لے کر کیوں آخر زلفوں کو سنوارا کرتے ہیں

ہر چند کہ محفل میں اُن کی اٹھتی ہیں نگاہیں غیروں پر
اور ہم یہ سمجھتے ہیں جیسے وہ ہم کو اشارا کرتے ہیں

اک ساغرِ زریں کی خاطر میخانۂ ساقی میں اکثر
یہ رندِ بلاکش بھی کیا کیا احسان گوارا کرتے ہیں

اُلٹی ہیں سوا باتِ دنیا اللہ ہے چلن اِس دنیا کا
ہم اُن سے محبت کرتے ہیں وہ ہم سے کنارا کرتے ہیں

کیا جانے حجابؔ ان لوگوں پر کیوں مجھ کو ہنسی سی آتی ہے
جو عشق کے ماروں پر اکثر الزام تراشا کرتے ہیں

○

حالِ دل اپنا سنانے کا اثر ہو کہ نہ ہو
مہرباں کوئی بہ اندازِ دگر ہو کہ نہ ہو

جادۂ عشق میں رکھا ہے قدم مدت سے
یہ محبت کی مہم دیکھئے سر ہو کہ نہ ہو

لاؤ کچھ تلخیٔ حالات سے دامن بھر لیں
حاصلِ عشق مرادِ رہِ جگر ہو کہ نہ ہو

صبحدم پہلے تو جل اٹھتا تھا دامن گل کا
اب نہاں سینۂ شبنم میں شرر ہو کہ نہ ہو

آپ کچھ دُور چلیں ساتھ قیادت کے لئے
ہم سے اس راہ میں تکمیلِ سفر ہو کہ نہ ہو

اس لئے میرے نشیمن پہ گرانے میں وہ برق
اور کسی دل میں کہیں مشقِ نظر ہو کہ نہ ہو

دو گھڑی کے لئے آ جا کہ لبوں پر دم ہے
"ٹل نہ جائے شبِ ہجراں کی سحر ہو کہ نہ ہو"

آج تو صبح ہی سے تیرگی جاری ہے حجابؔ
خندہ لب آج گلستاں کی سحر ہو کہ نہ ہو

○

دل کی لگی سے کام رکھ شوق میں دل لگی نہ دیکھ
رسمِ وفا نبھائے جا حُسن کی بے رُخی نہ دیکھ

یہ ہیں معاملاتِ عشق یہ ہے اصُولِ دوستی
نذرِ نیازِ ناز ہو حاصلِ بندگی نہ دیکھ

دیکھ ہزار بار دیکھ اے مری چشمِ شوق انہیں
اُن پہ کھُلے جو رازِ دل ایسے انہیں کبھی نہ دیکھ

آخری منزلوں میں روز لٹتے ہیں آ کے قافلے
فطرتِ راہبر نہ پوچھ حاصلِ رہبری نہ دیکھ

چاہیے سلامتی اگر اپنی تو بحرِ عشق میں
موت سے ہمکنار ہو ساحلِ زندگی نہ دیکھ

شام ڈھلی، جلے چراغ، داغِ جگر ہیں تابناک
دل کے قریب آ کے دیکھ دُور سے روشنی نہ دیکھ

دارِ فنا میں ہر طرف حسنِ بقا کا شور ہے
ذرۂ خاک کو بھی تو بھول کے سرسری نہ دیکھ

اشکوں کو تو بنا نجوم، اشکوں سے کہکشاں تراش
دل ہی تو چاند ہے حجابؔ چاند کی چاندنی نہ دیکھ

○

○

یہ پاسِ ضبط مقیّد زباں ہے ابھی — کہاں لبوں پہ ہے سینہ میں جو دھواں ہے ابھی

فضائے دہر میں آوازِ کُن فکاں ہے ابھی — تمہارا نقشِ حسیں سرخیٔ جہاں ہے ابھی

مری نگاہ میں ماضی کی داستاں ہے ابھی — وہی ہے شاخِ نشیمن وہی دھواں ہے ابھی

قدم بڑھائے چلو منزلوں کے دیوانو — کہ منزلوں سے بہت دُور کارواں ہے ابھی

ہزار بادِ مخالف چلے تو کیا غم ہے — رہِ حیات میں جو عزم ہے جواں ہے ابھی

سنا رہا ہے ہر اک پھول داستانِ بہار — روش روش پہ مگر شورشِ خزاں ہے ابھی

کہاں کہاں تجھے ڈھونڈا کہاں کہاں پوچھا — خیال اپنا نہ جانے کہاں کہاں ہے ابھی

بجھا سکیں گے نہ جھونکے غمِ جہاں کے اسے — چراغِ دل تری محفل میں ضو فشاں ہے ابھی

خلوص ڈھونڈ نہ اس شہرِ پُرجفا میں حجاب
متاعِ عشق و وفا اس جگہ گراں ہے ابھی

○

چھپ چھپ کے وہ تڑپاتا ہے ہمیں اور دُور سے دیکھا کرتا ہے
جو ظلم بھی کرتا ہے ظالم دُنیا سے نرالا کرتا ہے

فطرت کے اصولوں پر جس کو ہوتا ہے یقینِ مستحکم
وہ عزمِ مصمم سے اپنے ہر دَور کو بدلا کرتا ہے

اک بار پلٹ دو پھر بڑھ کر بے رنگ بساطِ گلشن کو
پیغام کوئی یہ دیتا ہے یہ وقت تقاضا کرتا ہے

تو دیکھ حجاب اس کی وسعت لفظوں پہ نہ جا شاعر کے کبھی
جو دل پہ گزرتی ہے اس کے وہ بات ہی لکھا کرتا ہے

○

پروفیسر محمد خاں کلیم ایم۔ اے

نام محمد خاں تخلص کلیمؔ۔ اِن کے والد میاں رحمت علی، بینے وال ضلع ہوشیار پور (ہند) کے ایک ممتاز علمی و تعلیمی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ محمد خاں کلیمؔ اُن کے تین بیٹوں میں سے سب سے چھوٹے ہیں۔ ۲۳ فروری ۱۹۲۴ء کو بینے وال میں پیدا ہوئے اور وہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ پھر سیالکوٹ چلے آئے۔ جہاں والد کے انتقال کے بعد اُن کے بڑے بھائی میاں محمد یعقوب بسلسلہ درس و تدریس مقیم ہو گئے تھے۔ وہیں ۱۹۴۵ء میں بی اے اور ۱۹۴۷ء میں بی۔ ٹی پاس کر کے جامکے ہائی سکول میں انگلش ماسٹر مقرر ہوئے، پھر ہیڈ ماسٹر اور اے۔ ڈی۔ آئی کے عہدوں پر متعین ہوئے۔ اسی دوران فارسی اور پھر اردو میں ایم اے پاس کیا۔ کچھ عرصہ گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ اور بہاول پور میں بطور لیکچرار خدمات انجام دیں اور آج کل سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں لیکچرار ہیں۔

شاعری کا ملکہ تو وہبی ہے لیکن اِس کی تحریک برادرِ بزرگ جناب طفیلؔ ہوشیار پوری کی دیکھا دیکھی ہوئی اور جناب درویش آمین حزیںؔ (سیالکوٹی) کے فیضان سے پروان چڑھی۔ جن کے بارے میں وہ خود کہتے ہیں کہ "اُن سے نسبتِ تلمذ کی اہلیت نہ تھی لیکن اُن کی شفقت اور کرم فرمائی سے فیض یاب ہوتا رہا۔ اِس متاعِ عزیز پر مجھے ہمیشہ ناز رہے گا۔"

علامہ اقبالؒ کے پرستار ہیں اور اِن کے کلام پر علّامہ کے افکار و خیالات کی گہری چھاپ ہوتی ہے۔

○

کیا جانے کب ہوئے نگہہ و دل الگ الگ — محسوس ہو رہی ہے جو مشکل الگ الگ
یکساں ہیں بہار و خزاں کی نوازشیں — ہر دَور میں رہا غمِ حاصل الگ الگ
کس طرح ہم نے رکھی ہے مقتل کی آبرو — سوچا کریں گے خنجر و قاتل الگ الگ
ہر موج نے سفینے کو آغوش میں لیا — گرداب نے بنا دئے ساحل الگ الگ
اسرار تیرے عقل و جنوں پر نہ کھل سکے — دونوں سجا کے رہ گئے محفل الگ الگ
کچھ یوں بھی مل سکی نہ ہمیں دولتِ سکون — قلب و نگاہ کی رہی منزل الگ الگ

وہ اے کلیم بزم رگِ جاں میں آ گئے
ہر آنکھ دیکھتی رہی محمل الگ الگ

○

کاوشِ جاں کا تصورِ غمِ جاناں کا خیال — میکدے میں نہ رہا گردشِ دوراں کا خیال
بڑھ گئی اتنی پریشانیٔ حالات اپنی — اب نہیں دل میں کہیں زلفِ پریشاں کا خیال
لب پہ آتا ہی نہیں حالِ شکستِ دل کا — کس قدر رہتا ہے مجھ کو ترے احساں کا خیال
بیخودی جانے ہمیں لائی ہے کس منزل پہ — اب نہ دامن کی خبر ہے نہ گریباں کا خیال
سجدۂ آدم کو نہ کرنا تو کوئی جرم نہ تھا — اہرمن کو نہ رہا عظمتِ یزداں کا خیال
سلسلے عرضِ طلب کے نہ کبھی ختم ہوئے — نہ رہا مجھ کو کبھی تنگیٔ داماں کا خیال

فیصلہ کر نہ سکے ہجر تھا یا وصل کلیم
ان کی محفل میں رہا نہ رگِ جاں کا خیال

○

رندوں میں نام کو نہ ملا جب ریا کا نام
ہم میکدے میں آ گئے لے کر خدا کا نام

جب حادثاتِ دل کا کہیں ذکر چھڑ گیا
ہم نے دبی زباں سے لیا بے وفا کا نام

احساں شناس پاؤ گے ہم ایسے پھر کہاں
گرداب میں بھی لے نہ سکے ناخدا کا نام

دل کون سے مقام پہ جانے پہنچ گیا
ترکِ طلب کا ذکر نہ لب پر دعا کا نام

مرتے ہیں ہم اک ایک ادا کے جمال پر
حسنِ نظر ہے اصل میں حسنِ رضا کا نام

اب ہم ہیں اور اجنبی یادوں کے سلسلے
لیں گے نہ مصلحت سے کسی آشنا کا نام

دشوار تھے کلیم غمِ جاں کے مرحلے
ہر ابتدا کو دیتے رہے ابتدا کا نام

حریفِ چشمِ بصیرت کوئی نقاب نہیں
یہ اور بات ہمیں دیکھنے کی تاب نہیں

مسرتِ ابدی ہے فراق ہو کہ وصال
مری نگاہِ تمنا میں اضطراب نہیں

سکونِ قلب ملا اور نہ آبرو ہی رہی
کسی طرح بھی مرا درد کامیاب نہیں

ہزار شکر کہ بخشا گیا ہے غم تیرا
یہ انتخاب مگر حسنِ انتخاب نہیں

بہار اب کے بڑی بیدلی سے آئی ہے
گلوں کا رقص نہیں نغمۂ شباب نہیں

اب اس مقام پہ پہنچا ہے کاروانِ خیال
ترے لئے بھی مرے دل میں اضطراب نہیں

وہ جس کو چاہیں بلاتے ہیں اپنی خلوت میں
کلیمِ طور کی محفل ہی انتخاب نہیں

○

میرے دل کے لالہ زاروں کو نہ جانے کیا ہوا
اِس گلستاں کی بہاروں کو نہ جانے کیا ہوا

کوئی تو دیتا تسلّی کوئی آنسو پونچھتا
میرے غم کے رازداروں کو نہ جانے کیا ہوا

اب کہیں تسکین کی صورت نظر آتی نہیں
زندگی کی رہگذاروں کو نہ جانے کیا ہوا

پوچھتے ہیں وہ شبِ اندوہ و غم کی داستاں
آج پلکوں کے ستاروں کو نہ جانے کیا ہوا

سامنے اُن کے زباں ساکت نظر خاموش ہے
عمر بھر کے بیقراروں کو نہ جانے کیا ہوا

اب مسلسل خامشی پر مطمئن ہیں اے کلیم
دل کی بیہم خلفشاروں کو نہ جانے کیا ہوا

○

جو دل کی رہگذاروں میں نہاں معلوم ہوتی ہے
وہ گمراہی بھی منزل کا نشاں معلوم ہوتی ہے

نہ جانے کون سی منزل میں ہے دیوانگی دل کی
کہ اب ہر سود کی خواہش زیاں معلوم ہوتی ہے

ہر اک دھڑکن نے آج اک التجا کا روپ بدلا ہے
ہمارے دل کے پہلو میں زباں معلوم ہوتی ہے

ترے اسرار ڈھل کر رہ گئے ہیں میری پلکوں پر
محبت آج کتنی شادماں معلوم ہوتی ہے

خدا اور برتری آدم کی منوائے فرشتوں سے
ہمیں تو بات کوئی درمیاں معلوم ہوتی ہے

اگرچہ طُور پر وہ اے کلیم اب آ نہیں سکتے
مگر اُمّید ہر لحظہ جواں معلوم ہوتی ہے

○

○

نہ مل سکا تجھے اب تک جنونِ بے باکی — سبب ہے اس کا فقط تیری ناخوش ادراکی
اگرچہ سدرہ پہ بستے ہیں جبرئیلِ امیں — بلند تر ہے مگر اُن سے آدمِ خاکی
یہ آج کل جو ہے ماحول داغ داغ ترا — یہ پھوٹ نکلی ہے قلب و نظر کی ناپاکی
وہ لامکاں کی بھی وسعت میں آ نہیں سکتے — اگرچہ اُن کا نشیمن ہے پیکرِ خاکی
کھُلے ہیں اس میں سکونِ دوام کے اسرار — عجیب چیز ہے پچھلے پہر کی نمناکی
اُسی کے در سے ملے گا سکونِ دیدہ و دل
خطاب جس کا ہے "یٰسین" شانِ لولاکی

○

جب بھی ہم عزمِ سفر سے نکلے — حادثے راہگذر سے نکلے
جن میں پنہاں تھی متاعِ غمِ دوست — اشک وہ دیدۂ تر سے نکلے
جن کو محفل میں تری بار ملا — گردشِ شام و سحر سے نکلے
مل گیا راہِ تمنا کا سراغ — سرحدِ فکر و نظر سے نکلے
دولتِ درد میسر آئی — کام کیا دیدۂ تر سے نکلے
عظمتِ دل کو بھلا بیٹھے کلیم
حلقۂ اہلِ نظر سے نکلے

○

بے تاب ہے طوفانِ تمنّا سے ہر اک لَے
آہنگ میں نغمے کے دھڑکتا ہے دلِ نَے

ہم خلوتِ جاناں کی منازل سے بھی گزرے
اِک مرحلۂ عرضِ تمنا نہ ہُوا طے

تسکین کا ساماں ہو جب خاک نشینی
خاموش گزر جاتی ہے بے نغمہ و بے مَے

جس لَے میں سموئے ہوں غمِ دوست کے انوار
آشفتگیٔ دل کا مداوا ہے وُہی لَے

کر فاش نہ ہر بزم میں اسرارِ شبِ غم
اے دیدۂ پُرنم ترے آنسو ہیں بڑی شَے

اسلوبِ کلیم اور بھی ہیں عرضِ طلب کے
کب لذتِ فریاد ہے پابندِ لبِ نَے

حکیم صوفی حبیب اللہ حاوی

نام حبیب اللہ تخلص حاوی سلسلۂ خواجگانِ چشت کے ایک متبحر عالم ہیں۔ آپ ہندوستان کے مردم
ز خطہ موضع جالس میں، مئی ۱۹۱۴ء کو وجود میں آئے مگر آپ کی عام رہائش دہلی ہی میں رہی اور قیامِ
ستان کے بعد لاہور میں سکونت پذیر ہوئے۔ شعر و شاعری کا گھریلو ماحول بچپن ہی سے میسر تھا اس لئے
پنے بزرگوں کے ساتھ اکثر بزمِ سخن میں شریک ہوتے تھے۔ ۱۹۲۴ء میں ایک مصرع طرح کو آپ نے
ں طرح گرہ کیا ؎

جنبشِ بادِ صبا عام پکار آئی ہے ——— "آج پھر گلشنِ ہستی میں بہار آئی ہے"

حاوی صاحب کی یہ روانیٔ طبع دیکھ کر آپ کے چچا حاجی نذیر احمد نذیر اکثر حاوی صاحب کو شعر و سخن کی
رف رغبت دلاتے رہتے تھے۔ ۱۹۲۹ء میں ان کی تاکید مزید پر آپ نے دو غزلیں اور نظمیں لکھیں اور اپنے
ہزم چچا کی خدمت میں برائے اصلاح پیش کیں۔ بعد ازاں نذیر صاحب نے آپ کو اپنے ایک دوست عبدالوہا
ز جالسی کے سپرد کر دیا۔ حاوی صاحب خود فرماتے ہیں کہ میں نے راز صاحب سے بہت کچھ سیکھا اور فنِ شعر
ے وہ اہم نکات حاصل کئے جو کتابوں میں نہیں ملتے۔ اتفاقاً راز صاحب ایک شدید مرض میں مبتلا ہو کر معذور
ہو گئے اور اپنی اس معذوری کے سبب راز صاحب نے حاوی صاحب کو سید آل محمد نقوی مہر جالسی (ایم اے)
ے تلامذہ میں شامل کرا دیا۔ حاوی صاحب نے اگرچہ مہر جالسی سے بہت کم غزلوں پر اصلاح لی ہے مگر وہ
ن کا دلی ادب و احترام کرتے ہیں اور اپنے تلامذہ کو بھی اس کی ہدایت کرتے ہیں۔ حاوی صاحب نے اپنی زندگی
ے کسی دور میں بھی نام و نمود اور شہرت پسند نہیں کی ان کے علم و فضل اور نکتہ شناسی کا یہ عالم ہے کہ
بتدی چند ماہ کی اصلاح کے بعد اساتذۂ ادب کی صف میں کھڑا ہو جاتا ہے۔ حاوی صاحب فرماتے ہیں کہ
علیمی معیار کے سلسلہ میں میرے پاس کوئی ڈگری نہیں۔ میرا تعلیمی معیار میرے پیر و مرشد آفتابِ طریقت عارف

باللہ حضرت حافظ محمد حنیف صاحب رحمانیؒ کے روحانی فیوض کا اثر ہے ۔ قبلہ پیر و مرشد شعر و سخن سے گہری دلچسپی رکھتے اور شعر گوئی کی ترغیب دیتے ۔ ان کی فرمائش پر کئی نعتیں اور منقبتیں لکھیں ۔

حاوی صاحب نے ہر صنفِ ادب و سخن میں بے تکان اور مسلسل طبع آزمائی کی ہے ۔ بڑے زود گو ہیں ۔ تاہم نظموں اور غزلوں کی نسبت نعت اور منقبت آپ کو زیادہ مرغوب ہیں ۔ آپ نے بساطِ شعر و سخن پر جدت طرازی کے گراں بہا گوہر بکھیرے ہیں ۔

○

حسن کی زد میں اختیار کا ہوش — کس کو رہتا ہے جانِ زار کا ہوش
عشق سے جب ملے وقار کا ہوش — ہوش میں رکھیے اختیار کا ہوش
اللہ اللہ رے یادِ یار کا ہوش — بیقراری میں ہے قرار کا ہوش
ہوش ہے بے نیازِ ہوش مگر — ایک باقی ہے یادِ یار کا ہوش
خاک اُڑتی ہے کوئے جاناں میں — دیکھیے تو مرے غبار کا ہوش
ہوش میں کہہ رہا ہوں ہوش کی بات — ہوش پرور ہے خوفِ دار کا ہوش
کوچۂ یار وہ گلستاں ہے — گم جہاں پر ہے ہر بہار کا ہوش
عشق ہے بے نیازِ خار و گل — نہ خزاں کا نہ ہے بہار کا ہوش
چمن حسن کی فضاؤں میں — کھویا کھویا ہے ہوشیار کا ہوش
ہوشِ جلوہ ہیں جبکہ ہوش ہو گم — کس کو رہتا ہے تختِ دار کا ہوش

سانپ کے زہر پر رہا حاوی
دیکھیے عشقِ یارِ غار کا ہوش

روزِ ازل سے فکر و نظر ہیں فدائے حق
دل آشنائے حق ہے تو جاں مبتلائے حق

نذر دے کے جان کیجیے حاصل وفائے حق
مقصودِ زندگانی ہے رسمِ ادائے حق

مقبول ہو تو کیسے ہو اپنی دعائے حق
لازم ہے پہلے سیکھنی طرزِ ادائے حق

ظاہر کرو خود آپ ہی اپنی ضیائے حق
بن بن کے خود شناس بنو رونمائے حق

پھولوں کا رقص شاہدِ قدرت کا ہے خرام
گلشن میں گشت کرتی ہے رنگیں ادائے حق

ہر سانس ایک نغمہ ہے، دل صوتِ رباب
تارِ نفس سے سنتا ہوں ہر دم نوائے حق

الفت میں خاک چھانیے دھونی رمائیے
ہوتی ہے کوئے یار میں حاصل رضائے حق

وہ روشناسِ دولتِ لطفِ عظیم ہے
حاصل کیا ہے جس نے مقامِ گدائے حق

دل کو جگر کو آنکھ کو حق کی ہے جستجو
بھاتا نہیں ہے کچھ بھی مجھے ماسوائے حق

حاصل اسے حیاتِ حقیقی کا لطف ہے
ہے جس کی زندگی کو میسر لقائے حق

دل میں جما رہا ہوں میں نقشِ رخِ صنم
رکھوں گا اس میں ایک دن آخر بنائے حق

حق بیں ہیں حق شناس ہیں حق گو ہیں حق نما
رکھی تھی بتکدہ میں ہمیں نے بنائے حق

حق کہہ کے دار عشق کا حق دار بن گیا
میری حیات و موت ہے حاوی برائے حق

داغِ غم داغِ الم سے جب چمک جاتا ہے دل　　آفتابِ عشق کی تنویر کہلاتا ہے دل

ان کی اعجازِ نظر کا یہ اثر پاتا ہے دل　　زخم کھاتا ہے جگر خود تیر بن جاتا ہے دل

جب جنونِ عشق کی حد سے گزر جاتا ہے دل　　جب یوں ہی ہو کے گم کون و مکاں پاتا ہے دل

دیکھتا ہوں جب کسی کے روئے روشن کا جمال　　تابشِ انوار سے پروانہ بن جاتا ہے دل

جب کتابِ روئے جاناں کی طرف کرتا ہے رخ　　معنیٔ قرآں کی تفسیر بن جاتا ہے دل

ان کے اک اک طور کو انداز کو انوار کو　　جلوہ کا دِ ناز سے آنکھوں میں بھر لاتا ہے دل

دل سمجھتے ہو جسے دل کی حقیقت وہ نہیں　　چشمِ عرفاں سے جو دیکھو تو نظر آتا ہے دل

حاوی دل کی بے وفائی کا کروں میں کیا بیاں
سامنے جاتا ہے جب ان کے بدل جاتا ہے دل

چمکے نہ کیوں کتابِ جفا میں وفا کا نام　　لکھا گیا ہے خون سے شہیدِ رضا کا نام

کہتے ہیں دردِ دل جسے ہے لا دوا کا نام　　ہرگز نہ اس کے سامنے لیجیے شفا کا نام

ویرانیاں نہ پوچھیے گلزارِ شوق کی　　کہتا ہے دل یہی کہ ہے بس خدا کا نام

گل تو کھلے ہوئے ہیں گلستانِ حسن میں　　لیکن نہیں ہے نام کو بوئے وفا کا نام

جب دیکھتا ہوں اس بتِ بے باک کا جمال　　بے اختیار آتا ہے لب پر خدا کا نام

اٹھتا ہے ایک درد سا ہوتا ہوں جب خموش　　یوں لب پہ بار بار ہے اس خوش ادا کا نام

کہتے ہیں لوگ وعدۂ فردا جسے حضور　　میری سمجھ میں وہ ہے فریبِ وفا کا نام

اے حاوی یوں سمجھیے ہمارے عروج کو
ناآشنا کی زد میں ہے اک آشنا کا نام

خطوطِ روئے صنم کا کوئی جواب نہیں
خود انتخاب ہیں محتاجِ انتخاب نہیں

وہ مردِ مرد نہیں مردِ کامیاب نہیں
کہ جس کے فعل میں کردارِ بوتراب نہیں

غموں کی نہر ہے آنکھوں میں سیلِ آب نہیں
نمودِ اشک ہے سینے میں التہاب نہیں

وہ زیست زیست نہیں زیست لاجواب نہیں
کہ جس میں ذوقِ شہادت کی آب و تاب نہیں

کمالِ حسنِ عقیدت سے باریاب نہیں
کہیں ہمارا مقدر تو کچھ خراب نہیں

نظر تو ہو چکی ہے جذب ان کے جلووں میں
ہنوز چشمِ جنوں بے نیازِ تاب نہیں

اب اڑتی پھرتی ہے ان کی گلی میں خاکِ حیات
زہے نصیب کہ مٹی مری خراب نہیں

لئے ہوئے دامنِ حسرت میں خوں کے لعل و گہر
تری نظر کا ہیں کیا مایۂ عتاب نہیں

جو قطع کر نہ سکے جنونوں کے پردوں کو
وہ چشم چشم نہیں ہے وہ تاب تاب نہیں

کہیں ہے درد، کہیں غم، کہیں الم کا سبق
کتابِ عشق کا آسان کوئی باب نہیں

نظر نہ آتا ہو جس میں جمالِ بیداری
وہ نیند نیند نہیں ہے وہ خواب خواب نہیں

تجلی نگاہ ہو جاتی ہے فضاؤں میں
کسی کا روئے منور تو بے نقاب نہیں

کتابِ روئے صنم بے حساب پڑھتا ہوں
کہ اس ثواب سے افضل کوئی ثواب نہیں

نوائے تارِ نفس میں بغور سنتا ہوں
پیامِ زیست ہے یہ نغمۂ رباب نہیں

حریفِ مقصدِ دل پہ نہ کیوں رہوں حاوی
خراب میں ہوں، مقدر مرا خراب نہیں

○

خلوصِ دل کا، سوزِ غم سے پڑھتا ہوں سبق اب تک
نمازِ راہِ الفت تھی ادق اور ہے ادق اب تک

ہے غرقابِ غمِ ہجراں، مسرت کا طبق اب تک
اثر انداز چشمِ تر میں ہے سوزِ قلق اب تک

نمایاں ہوتی ہے ہر شام کو خونیں شفق اب تک
فلک کے رخ سے ظاہر ہے شہیدوں کا قلق اب تک

جبیں کو رکھ کے سجدہ میں اٹھایا پھر نہ سجدے سے
ادائیں کر رہا ہوں میں نمازِ حق کا حق اب تک

لٹے تھے ہم، جلا تھا آشیاں، مدت ہوئی لیکن
تڑپتی ہے نظر میں برقِ سوزاں کی رمق اب تک

کتابِ عشق کو سمجھے تو کچھ اہلِ جنوں سمجھے
خرد والے الٹتے ہی رہے یونہی ورق اب تک

ہزاروں انقلاب آئے زمانے کے تمدن میں
مگر ہیں حلقۂ دار و رسن میں اہلِ حق اب تک

عیاں ہے شانِ اک اہلِ زمیں کی بامِ عالم پر
ہوئی مدت کہ ہے سینہ مہِ انور کا شق اب تک

رموزِ عشق کی تشریح کیونکر ہو سکے حاوی
بیانِ کیفِ عرفاں تھا ادق اور ہے ادق اب تک

○

تو اس سے بچ نہ بچ ہے ترے اختیار میں
کانٹے تو لازمی ہیں نظامِ بہار میں

جوشِ جنوں کی شان جو دیکھی بہار میں
عقلِ سلیم پھر نہ رہی اختیار میں

رقصاں کسی کی روح ہے رقصِ غبار میں
ورنہ بگولے اٹھتے ہیں کیوں دشت زار میں

آئے سکوں کہاں سے دلِ بے قرار میں
غم اختیار میں نہ خوشی اختیار میں

مرتا نہیں شہیدِ محبت خدا گواہ
آبِ بقا ہے خنجرِ قاتل کی دھار میں

وہ انہماکِ عشق تصور ہے رات دن
گم ہو گیا ہوں عرصۂ لیل و نہار میں

حاوی اگر رہا یونہی دستِ جنوں میں زور
اڑتے پھریں گے چاک گریباں بہار میں

○

○

چمن میں یہ کہے جو رِندوں کو یاد کر نہ سکے — وہ اختیارِ اصولِ مفاد کر نہ سکے

غلط غلط سا نظر آیا جملۂ ہستی — ہزار جبر پہ ہم اس پہ صاد کر نہ سکے

کتابِ عشق کا ہر باب تھا ادق سے ادق — تمام عمر کیا یاد - یاد کر نہ سکے

صدا اختلاف کا مرکز بنا ہوا ہے دماغ — دل و ضمیر بہم اتحاد کر نہ سکے

بھلا بنائیں گے اوروں کو معتقد وہ کیا — درست اپنا جو خود اعتقاد کر نہ سکے

عروجِ نسبت کا اُن کو نہ ہو سکا حاصل — جو دل کے کفر سے کارِ جہاد کر نہ سکے

ہزار ان کو بھلایا مگر بھلا نہ سکا — خلاف اس کے کہ وہ مجھ کو یاد کر نہ سکے

رہا عروج پہ پرچم مرے مقدر کا
کہ زیرِ عاؔدی کو اہلِ عناد کر نہ سکے

○

مری منزل نشانِ بے نشاں ہے — مرا عزم کارواں در کارواں ہے

حرم ہے دیر ہے یا لامکاں ہے — نہ جانے عشق کی منزل کہاں ہے

متاعِ عشق وہ بارِ گراں ہے — زمیں ساکت ہے لرزاں آسماں ہے

بلند اتنی مری طرزِ فغاں ہے — رسائی آسماں در آسماں ہے

نہیں شامل جو سوزِ عشق اس میں — اذاں بے کار سجدہ رائیگاں ہے

وفورِ سوز سے بہتے ہیں آنسو — غضب ہے آگ سے پانی رواں ہے

مری پلکوں پہ ٹھہرا ہے سمندر — ہر اک آنسو امینِ داستاں ہے

کھلا جو گُل مری قسمت کا عاؔدی
اُسی گُل پر نگاہِ باغباں ہے

○

نوابزادہ جمشید نصرت

نام سید عباس مرزا عرف جمشید، تخلص نصرت ۔ آپ کی ولادت دہلی میں یکم نومبر ۱۹۳۶ء کو ہوئی ۔ آپ دہلی کے ایک نواب خاندان کے فرد ہیں ۔ ان کے دادا نواب سید سلطان مرزا مرحوم و مغفور دہلی کی ایک ممتاز شخصیت تھے ۔ ان کے والد بزرگ سید سکندر مرزا مرحوم بڑے متدین متقی اور صوم و صلوٰۃ کے انتہائی پابند تھے ۔ عجب بات ہے کہ ان کے والد ماجد کو شعر و سخن سے دُور کا بھی لگاؤ نہ تھا ۔ ان کی دنیا تسبیح و مصلے پر مشتمل تھی لیکن ساتوں فرزند طبعِ موزوں لے کر آئے اور میدانِ شعر و سخن کے کامیاب شہسوار ثابت ہوئے ۔

جمشید نصرت نے ابھی مڈل کا امتحان ہی پاس کیا تھا کہ ۱۹۴۷ء کا انقلاب رونما ہو گیا ۔ وطنِ عزیز کو خیر باد کہا اور پاکستان چلے آئے ۔ آپ نے بی اے تک تعلیم حاصل کی اور سرکاری ملازمت اختیار کی ۔ ذوقِ شعر و ادب کی خاطر عالم اُردو اور فاضل اردو کے امتحانات پاس کئے ۔ آپ بڑے حلیم الطبع منکسر المزاج اور دوست نواز ہیں ۔ عقلِ سلیم قدرت کا ایک عطیہ ہے ۔ ہر مشکل میں انتہائی تحمل و صبر سے کام لیتے ہیں ۔

شاعری کا آغاز گیارہ سال کی عمر سے ہوا ۔ اصلاح کسی سے نہیں لی ۔ مشقِ سخن جاری رکھی البتہ کبھی کبھی ان کے سب سے بڑے بھائی جو صبا تخلص کرتے ہیں اور بہت عمدہ شعر کہتے ہیں ان کو غلطی پر ٹوک دیا کرتے تھے ۔ ان کی متعدد غزلیں رسالوں اور اخباروں میں شائع ہو چکی ہیں ۔

آپ کو نثر نگاری سے بھی گہرا لگاؤ ہے ۔ کئی افسانے اور ڈرامے لکھے جو طبیعت کے لاابالی پن کے ہاتھوں منزلِ اشاعت تک نہ پہنچ سکے ۔ ایک مرتبہ ناول لکھنا شروع کیا ابھی چند ہی باب لکھے تھے کہ نثر کی طوالت سے جی اُکتا گیا اور ناتمام چھوڑ دیا ۔

منزلیں نزدیک تھیں، دل دیدۂ آگاہ تھا زندگی کی راہ میں جب تک کوئی ہمراہ تھا

روٹھنا اُس کا مری رسوائی کا باعث بھی تھا صدمۂ جانکاہ پہ اک صدمۂ جانکاہ تھا

میرا کیا کرتا یہ طوفانِ غم و صدمات بھی میں تو سطحِ بحرِ ہستی پہ فقط اک کاہ تھا

کس نے منزل کا نشاں دے کر مجھے چونکا دیا کتنا آسودہ تھا میں جب ابھی بے راہ تھا

ہو گئے آرام سے نصرت چلو اچھا ہوا
زندگی کیا تھی کہ اک طوفانِ اشک و آہ تھا

جب سے پایا ہے ترے گیسوئے پیچاں کا مزاج پابہ زنجیر ہوا ہے دلِ ویراں کا مزاج

یاد ہے ہم کو ابھی تک ترے غمزے کی ادا زخمِ دل پوچھ رہے ہیں ترے مژگاں کا مزاج

اے خرابی درِ میخانہ تو کھُل لینے دے پوچھ لیتے ہیں ابھی گردشِ دوراں کا مزاج

بات کرنا تو کجا روئے سخن بھی نہ رہا اب تو ملتا ہی نہیں حُسنِ پشیماں کا مزاج

واعظو! موسمِ گل اہلِ جنوں سے پوچھو تم نے سمجھا ہی نہیں فصلِ بہاراں کا مزاج

عنبر عنبر ہوا جاتا ہے مشامِ ہستی کتنا برہم ہے تری زلفِ پریشاں کا مزاج

بے نیازی کا اُسی کی تو کرم ہے نصرت
آسماں پر ہے مرے چاکِ گریباں کا مزاج

ایک تم ہو کہ بنے بزمِ گلستاں کا چراغ
ایک مَیں ہوں کہ ہُوا گورِ غریباں کا چراغ

مرحبا شوقِ جنوں لاکھ حوادث آئے
آج تک گُل نہ ہُوا دیدۂ حیراں کا چراغ

تم نہ آئے تو یہ احساس ہے اپنا اپنا
صبح تک ساتھ جلا ہے شبِ ہجراں کا چراغ

پھر تصوّر میں ہے آرائشِ گیسوئے سیاہ
پھر جلا دل میں کوئی خواہشِ پنہاں کا چراغ

اِک تمنّا ہے سو وہ یوں ہے دلِ وحشی میں
صبح دم جیسے کوئی گورِ غریباں کا چراغ

دل پہ پھر چھائی ہے اِک تیرگیٔ نومیدی
پھر جلا بیٹھے ہیں ہم دیدۂ گریاں کا چراغ

تو نہ دے جائے کہیں دل کا سلگنا اے شوق
لوگ سمجھیں گے اِسے بزمِ چراغاں کا چراغ

یہ ہے تاریکیٔ تقدیر کا عالم نصرت
رات آئی تو بجھا روزنِ زنداں کا چراغ

غم اجازت دے تو رکھ دیں ہاتھ سے پیمانہ ہم
گو کہ کہلاتے ہیں اب سنگِ درِ میخانہ ہم

چھا گئیں قلب و نظر پہ کس قدر ویرانیاں
شہر میں رہتے ہیں اور ہیں شہر سے بیگانہ ہم

جب سے ہم کو آرزو ہے اُس کی بزمِ ناز کی
بے خبر دیوانے ہوتے ہیں لیے دلِ دیوانہ ہم

اُس کو اپنے حسن پر بھی تو نہیں ہے اعتماد
کیا تُلے بیٹھے ہیں دینے جان کا نذرانہ ہم

آتشِ غم میں سلگتے ہی رہے ہیں عمر بھر
کاش جل کر ختم ہوتے صورتِ پروانہ ہم

فصلِ گل پھر آئی ہے پھر دیکھیے کیا حشر ہو
برق کی زد پر بنا بیٹھے تو ہیں کاشانہ ہم

مر بھی جاتے ہیں بہت سُن کے ہی پیغامِ فراق
وہ تو یہ نا چیز تھا جو پی گیا جامِ فراق

اک ہجومِ نا اُمیدی رات کا پچھلا پہر
ہم تھے شمعِ دل فروزاں اور تھا جامِ فراق

پھر چمن کا پتّہ پتّہ لرزہ اندام ہے
پھر صبا گلشن میں لے کر آئی پیغامِ فراق

جاؤ لب بھی سی لیے ہم نے تمہارے ذکر سے
اب نہیں ہونٹوں پہ آئے گا کبھی نامِ فراق

تم ہی عاجز ہو گئے تنہا پسندی سے میری
تم نے ہی پینا سکھایا تھا مجھے جامِ فراق

پھر سکونِ دل کی باتیں پھر خیالِ زلفِ یار
پھر وہی دیوانگی ہے اور ایامِ فراق

اب یہ ہوتا ہے کہ پہروں گھومتے پھرتے ہیں چپ
جب کسی سے سن لیا ہم نے کبھی نامِ فراق

دل میں اک ہنگامہ ہے بے کیف سی ہے زندگی
آج تو رو لینے دے جی بھر کر کہ ہے شامِ فراق

لوگ سمجھیں گے کہ ہے بکھرا ہوا رنگِ شفق
"جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق"

کاش ہم سے پوچھتا نصرت کوئی رنگِ وفا
دل میں روشن ہے ابھی تک شمعِ انجامِ فراق

پھر وہی وحشتِ دلِ دشت و بیاباں کا خیال
دم نہ دے جائے کہیں فصلِ بہاراں کا خیال

پھر گُلِ لالہ پہ شبنم نے بکھیرے موتی
بھولتا ہی نہیں اس کے لب و دنداں کا خیال

مسکرائے تو کوئی پھول تو برسائے کوئی
کس کو آیا ہے میری تنگیٔ داماں کا خیال

ایک تصویر سی آنکھوں میں اُتر جاتی ہے
جب بھی آتا ہے کبھی جیب و گریباں کا خیال

لختِ دل لختِ جگر جمع کئے بیٹھے ہیں
دل سے جاتا ہی نہیں خاطرِ مژگاں کا خیال

آنکھوں میں برسات لئے پھرتا ہوں میں
اپنے احساسات لئے پھرتا ہوں میں

کہہ دوں تو پھر لوگوں کو چبھ جائے گی
وہ نازک سی بات لئے پھرتا ہوں میں

آج بھی ان کا ایک اشارہ کافی ہے
آج بھی وہ جذبات لئے پھرتا ہوں میں

سن لو گے تو دُور ہی رہنا چاہو گے
کچھ ایسے حالات لئے پھرتا ہوں میں

بیگانوں کے طرزِ عمل کا کیا شکوہ
اپنوں کے صدمات لئے پھرتا ہوں میں

ترکِ وفا پہ تیرے کوچے میں اب بھی
دل کے کچھ شبہات لئے پھرتا ہوں میں

سسک سسک کے توڑ چکے جو دم نصرت
لب پہ وہ نغمات لئے پھرتا ہوں میں

○

تارِ شب، طوفانِ برق و بادؤ وہ تنہا نہ ہو
رات بھر نزڑپا کہیں ایسا نہ ہو ایسا نہ ہو

دِل تو لو لیکن نظر نیچی رہے چرچا نہ ہو
صدقے ہو جاؤں تمہاری سادگی رسوا نہ ہو

ابر گھِر آیا ہے پھر لے بادہ خوارو! ہوش سے
"توڑ دے جامِ صبو ساقی کہیں ایسا نہ ہو"

کیا گلہ کرتے وہ مِل جاتا تو اتنا پوچھتے
دِل پہ کیا گزرے ہے حبیب اپنا کوئی اپنا نہ ہو

اب تو جی کرتا ہے باقی بیخودی میں کاٹ دیں
ہم ہوں، ساقی ہو، سبُو ہو، جام ہو، میخانہ ہو

ہم تو دے بیٹھے تمہیں جان و جگر کے واسطے
سوچ لو اس ضمن میں تم کو بھی کچھ کہنا نہ ہو

اب تو ہر نازک سے نقشِ پا پہ جھک جاتا ہے سر
تو نہ گذرا ہو کہیں تیرا ہی نقشِ پا نہ ہو

بھول جاؤ، پھینک دو، دے دو کسی کو پیار میں
دل تو دیتے ہیں تمہیں دیکھو کہیں ایسا نہ ہو

کیوں کہوں جا کر کسی سے اپنے دل کا ماجرا
رازداں میرا نہ ہو، پر آشنا اس کا نہ ہو

اس پہ بھی ظاہر کریں کیوں؟ دل تو چاہے گا کہ ہو
راز ہی وہ کیا جو اپنا ہو بھی تو اپنا نہ ہو

زندگی بے کیف ہے دردِ محبت کے بغیر
وہ بھی کیا جیتے ہیں جن کو عشق کا سودا نہ ہو

○

○

وہ خلوص وہ محبت وہ سلوکِ دوستانہ — جسے آپ ڈھونڈتے ہیں وہ گزر گیا زمانہ
تجھے علم ہے کہ کیا ہے تجھے چاہیئے بہانہ — بھلا کیوں بھلی لگے گی میری عرضِ عاجزانہ
تجھے کیا بتاؤں کیا تھی وہ نگاہِ ساحرانہ — مجھے راس آگئی تھی وہ تو کھا گیا زمانہ
سبھی دُور ہو گئے ہیں تری ایک بیرخی سے — وہ ہجوم دوستوں کے وہ شکایتِ زمانہ
تجھے کیا بھلا لگے گا یوں ہزار بار سن لے — کسی غیر کی زبانی کسی دوست کا فسانہ

سرِ عشق تھا وہ نصرتؔ سرِ دار آن پہنچا
کوئی آسماں نہیں تھا ترا سنگِ آستانہ

○

تم نہ دیکھو نظر ہزار آئے — پھر ذرا گُل کِھلے بہار آئے
بھول جائیں تو موت آ جائے — ایسے لمحات کچھ گذار آئے
ہر نظر خرمیِ نظارہ ہو — ہر نفس برقِ شعلہ بار آئے
یہ پری چہرہ لوگ باقی ہیں — ہم تو جیسی بھی تھی گذار آئے
برق گرنی ہے تو گرے یا رب — ہاں مگر ابرِ نو بہار آئے
چشم زادے، جگر کے پروردہ — سب ترے غم پہ آج وار آئے
اب کے دل ہی نکال پھینکیں گے — اب کے ایسی کبھی بہار آئے
دل میں اب رہ ہی کیا گیا ہوگا — کیوں نہ محرومیوں پہ پیار آئے

ہم سے چھوٹا چمن تو لے نصرتؔ
اب خزاں چھائے یا بہار آئے

○

○

لمحے مسرتوں کے تو ہوتے ہیں مختصر / غم بھی نکل گیا ترا پہلو کو چھان کر
یہ کشمکش حیات کا عنوان بن گئی / اک دوستی کی آرزو اک دوستی کا ڈر
تیرے کرم کی وسعتیں میری نظر میں تھیں / بیٹھا تھا رہگذر پہ تری جان بوجھ کر
بھرتے زمیں کی مانگ ستاروں سے بار بار / ملتا رہِ حیات میں گر کوئی ہمسفر
سجدہ نہ کر سکا ترے نقشِ قدم کو میں / سیماب کر گیا مری بے مائیگی کا ڈر
اک وقت تھا کہ ہم کو نہ تھی زندگی کی چاہ / اک دور تھا کہ ہم بھی چلے تھے اٹھا کے سر
اک لغزشِ سوالِ تمنا بنا رہا / وہ جذبۂ وفا جو رہا دل میں عمر بھر

نصرت ہمیں نگاہ کی وسعت پہ ناز ہے
وہ کیا کہ کائنات سمٹ آئی بام پر

○

پھر وہی غم ہے وہی رات کی تنہائی ہے / دل کو پھر اپنے تڑپنے کی ادا بھائی ہے
بادہ نوشوں کی نظر جام سے ٹکرائی ہے / پھر تری زلفِ سیاہ دوش پہ لہرائی ہے
پھر وہی دورِ خرابات کے متوالے ہیں / پھر بہاروں نے گلستاں کی قسم کھائی ہے
پھر کسی برق نے تاکا ہے نشیمن میرا / پھر اسی رنگ سے گلشن میں بہار آئی ہے
پھر درِ توبہ کھلا مے کے پیالے کھنکے / پھر سے میخانے پہ گھنگھور گھٹا چھائی ہے
دل کو پھر شوخیٔ حالات نے چھیڑا آ کر / دل کہ پھر محویتِ حسن کا شیدائی ہے
دو نفس اور کہ اب حسرتِ دیدار نہیں / اے مسیحا لبِ اعجاز پہ بات آئی ہے

دل نے پھر عہدِ وفا باندھ لیا ہے نصرت
سامنے پھر وہی اندیشۂ رسوائی ہے

○

تسنیم احمد خاں تسنیم

نام تسنیم احمد خان شیروانی۔ تخلص تسنیم۔ ۲ اپریل ۱۹۴۰ء کو شاہ آباد ضلع کرنال کے رئیس زمیندار خاندان میں پیدا ہوئے۔ اِن کے والد انوار احمد خان صاحب شیروانی مالیر کوٹلہ ریاست میں اعلیٰ عہدے پر فائز رہے۔

تعلیم سٹیٹ مڈل سکول مالیر کوٹلہ، سینٹ ہیٹرک ہائی سکول راولپنڈی اور گارڈن کالج راولپنڈی میں حاصل کی۔ ۱۹۶۲ء میں پنجاب یونیورسٹی سے اردو فاضل اور بی اے پاس کیا۔

اِس وقت نیشنل بینک آف پاکستان میں ملازم ہیں۔ ۱۹۶۳ء سے انجمن ترقیٔ ادب ماڈل ٹاؤن کے باقاعدہ ممبر ہیں اور اس کی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لیتے ہیں۔

مالیر کوٹلہ میں شیخ بشیر حسن صاحب بشیر کے دولت کدہ پر اعلیٰ سطح کا ماہوار مشاعرہ ہوا کرتا تھا۔ جس میں مقامی شعرا کے علاوہ دور دراز کے نامی گرامی شعرا بھی اپنا کلام سناتے۔ شعرا میں سے اختر شیرانی، جوش ملیسانی، نفیس خلیلی اور سامعین میں سے سر عبدالقادر جیسے بزرگوں کے نام انہیں اب تک یاد ہیں۔ یہ مشاعرہ قدیم روایتی انداز میں شمع کے ساتھ منعقد ہوا کرتا تھا۔ تسنیم صاحب کو شاعری کا شوق انہی مشاعروں سے پیدا ہوا اور وہ سات آٹھ سال کی عمر میں چھوٹی چھوٹی نظمیں کہنے لگے جنہیں ان مشاعروں میں خاص شوق سے سنا جاتا تھا اور شعرا انہیں پیار سے "آدھا شاعر" کہتے کیونکہ مشاعرہ میں سب سے کم عمر "پورا شاعر" پندرہ سولہ سال کا تھا۔ اپنے والد سے فیض تلمذ حاصل ہے اور غزل میں جدّت پسندی کے قائل ہیں۔

عجب مقام ہے اے دوستو مقامِ طلب　　خیالِ سود و زیاں ہے نہ کوئی غم نہ طرب

جہاں ہم آئے ہیں ہر سمت غم کے سائے ہیں　　کوئی بتائے کہاں چھوڑ آئے شہرِ طرب

تمہیں بتاؤ کہ اب کس پہ اعتبار آئے　　یہاں تو راہبر و راہزن ہیں ایک سے سب

جو تو نہیں تو کسی بات میں مزا ہی نہیں　　وہ انجمن ہو کہ محفل ہو یا ہو بزمِ طرب

کسی کرم میں نہیں اور کسی وفا میں نہیں　　وہ کیفیت جو ملی آپ کے ستم کے سبب

غمِ حیات کسی کو سنا کے کیا کرتے　　یہ بات ایسی تھی یارو کہ ہم نے سی لیے لب

وہ اضطرار کہ توبہ وہ اضطراب کہ بس　　یہ انتظار قیامت، یہ انتظار غضب

نگاہ ملتے ہی دنیا بدل گئی تسنیم
نگاہ ملنے پہ ہوتے ہیں حادثات عجیب

ہے مرے دل کا مکیں میرے جنوں کا باعث　　ہے وہی دشمنِ دیں میرے جنوں کا باعث

رہبرِ رہگذرِ عقل و خرد تھا کل تک　　آج ہے قلبِ حزیں میرے جنوں کا باعث

تیرے انکار کو اقرار سمجھتا ہوں میں　　ہو گیا میرا یقیں میرے جنوں کا باعث

جذبۂ شوق کا مقصود مسلسل سجدے　　اور یہ شوقِ حسیں میرے جنوں کا باعث

اُن کی ہر بات ہے تسنیم دل و دیں کا زیاں
اور زیانِ دل و دیں میرے جنوں کا باعث

○

بس اِک نگاہِ لطف سے غم کا ہُوا علاج
خود ہی کماں سے تیر چلا کر گیا علاج

تشخیص اس مرض کی کہاں ہو سکی کبھی
بیماریٔ فراق کا کب ہو سکا علاج

زخموں کا جب بہار مداوا نہ کر سکی
ہم نے قفس میں جا کے کیا بار ہا علاج

وہ آئے اور حشر بپا کر کے چل دیئے
اب چارہ گر کرے گا بھلا کیا مرا علاج

الفاظ ڈھونڈتا ہوں ترے شکریے کے لیئے
درد اِس قدر دیا کہ خود اپنا ہُوا علاج

میں اُس نگاہِ ناز کا بسمل ہوں دوستو
شاید ہی کر سکیں گے مسیحا مرا علاج

مانوس تجھ سے ہے دلِ تسنیمؔ اس قدر
آواز کا طلسم بھی اکثر ہُوا علاج

○

گل کی، نہ گلستاں کی، نہ آئی صبا کی یاد
بے شک تمہاری یاد بھی تھی کس بلا کی یاد

دنیا کے بن سکے، نہ سنواری ہے عاقبت
برباد کر گئی ہمیں اِک دل رُبا کی یاد

اک سیلِ رنگ و نور میں گم ہو گئی حیات
تنہائیوں میں آئی یہ کس دلِ رُبا کی یاد

ساحل پہ جا لگے کہ تلاطم تھا ہم رکاب
دِل سے نہ جائے گی کبھی اِس ناخدا کی یاد

آنکھوں میں بس چکی ہے وطن کی گلی گلی
آئے گی عمر بھر اُسی شہرِ وفا کی یاد

حق الیقیں ملا ہے شکستِ فریب سے
دھوکہ دیا بتوں نے تو آئی خدا کی یاد

تسنیمؔ آگہی نے مرے لب تو سی دیئے
دِل پر لکھی ہوئی ہے مگر ہر جفا کی یاد

○

○

وہ کیف، وہ مستی، وہ جنوں خیز نظر ڈھونڈ
وہ شخص پری چہرہ گیا ہائے کدھر ڈھونڈ

سرمایۂ آشفتہ سراں دار و رسن ہے
آ، کوچۂ جاناں کی کوئی راہگذر ڈھونڈ

ہو ذوقِ جبیں سائی جہاں عشرتِ ہر گام
آشفتگیٔ عشق کوئی ایسا بھی در ڈھونڈ

اک ایسی خزاں آئی اڑا لے گئی سب کچھ
نووارِدِ گلشن نہ یہاں برگ و ثمر ڈھونڈ

بے تاب تھا جب نیرِ جنوں آنکھ جھکا لی
اب جلوۂ جانانہ کو تا حدِّ نظر ڈھونڈ

احساس کی قندیل جلا اپنے لہو سے
تاریکیٔ شبِ قسمت میں کوئی خفتہ سحر ڈھونڈ

پھر گھاؤ مرے دل کے ہرے جاتے ہیں تسنیم
پھر ان کی دوا سوچ، کوئی نیرِ نظر ڈھونڈ

○

ہوتی ہے جواں کار گہہِ رنج و الم شاذ
ہوتا ہے مرے حال پہ اُس بت کا کرم شاذ

محتاجِ دوا ہوتے ہیں رندانِ حرم شاذ
میخانوں میں کھلتا ہے مسیحا کا بھرم شاذ

باقی ہے جلا حسرتِ ناکام بھی گا ہے
ہوتی ہے ترے غم میں مری آنکھ بھی نم شاذ

کچھ ایسے رواں رہتے ہیں ہم اپنی ہی دُھن میں
خوشبو بھی تری آئے تو رُکتے ہیں قدم شاذ

تُو ہے کہ نہیں یاد تجھے نام بھی اُس کا
تسنیم، کہ بھولے ہیں جیسے تیرے کرم شاذ

○

○

بازار سرد ہے نہ لگاؤ دکاں ہنوز — دل میں چھپا کے رکھو یہ سوزِ نہاں ہنوز

ہم انتہائے شوق کی حد سے گزر چکے — پھر کیوں ہے دور ہم سے ترا آستاں ہنوز

اِن ساحلوں سے دور چلے جائیے کہیں — اِن ساحلوں کی ریت میں ہیں کشتیاں ہنوز

ایجاد ہو رہے ہیں ابھی تو یہ نو ستم — ہے مجھ پہ مہرباں مرا مہرباں ہنوز

تنکے ہیں چند شاخ پہ اب بھی بچے ہوئے — "زد میں ہے بجلیوں کی مرا آشیاں ہنوز"

شمعیں جلا سکو تو جلا لو کہ وقت ہے — "زد میں ہے بجلیوں کی مرا آشیاں ہنوز"

اے آنکھ ضبط کر، کہ فسانے نہ بن سکیں — بیٹھے ہوئے ہیں چند مرے رازداں ہنوز

بس میں ہو گر حیات، اِسے پھینک دوں کہیں
راہِ طلب میں ساتھ ہے بارِ گراں ہنوز

○

شمع محفل میں جل بجھی خاموش — کشتۂ عشق ہو گئی خاموش

تیرے در پر جبیں جھکی ہے کاش — ختم ہو جائے زندگی خاموش

تم زمیں بن کے چاند کو چاہو — اتر آئے گی چاندنی خاموش

زندگی ایک جوئے تند و تیز — موت، اک سست رو ندی خاموش

ڈھونڈتے ہیں تجھے ترے پاگل — پھر رہے ہیں گلی گلی خاموش

مت کرو مجھ سے وصل کے وعدے — بیت جانے دو زندگی خاموش

پرسشِ غم پہ میری آنکھوں میں — دل سے اک بوند آ گئی خاموش

کون سا مرحلہ ہے یہ تسنیم
ہو گیا شوقِ آگہی خاموش

○

کتنا نظر فریب ہے سودائے سر کا فیض — جس کے طفیل ہم کو ملا اُس نظر کا بھید

اپنے ہی نقشِ پا تھے وہ بھولے ہوئے جہاں — ہوں سجدہ ریز ہے یہ تری رہگذر کا فیض

اب تو یہ دور ہے کہ غرض کے ہیں سب غلام — کیسا خلوص، مہر و وفا کیا، کدھر کا فیض

زلفیں بکھر گئیں تو شبِ تار چھا گئی — اور ہو گئی سحر جو ملا اُس نظر کا فیض

ہو آؤں عرش پر تو تعجب نہیں مجھے — ہاں شرط ہے مگر کہ ملے تیرے در کا فیض

پوچھا کہ عشق کیا ہے محبت ہے کس کا نام — بولے کہیں جیسے کسی بیداد گر کا فیض

تنہائی پہ ہو انجمن آرائی کا گماں
تسنیم یہ بھی ہے دلِ آشفتہ سر کا فیض

○

اُس دشمنِ وفا کا ہے یاروں سے ربط ضبط — گویا خزاں کا تشوخ بہاروں سے ربط ضبط

ہر بار دل کے زخم جلا کر جو لوٹ جائیں — ہم کو نہیں ہے ایسی بہاروں سے ربط ضبط

شاید حصولِ منزلِ عرفاں کے واسطے — رکھتے ہیں شیخ بادہ گساروں سے ربط ضبط

ہر اشک رشکِ شمس و قمر بن کے رہ گیا — گویا ہے چشمِ نم کو ستاروں سے ربط ضبط

طوفاں سے خوف کھاؤ گے تو ڈوب جاؤ گے — اور پھر کبھی نہ ہو گا کناروں سے ربط ضبط

ہر منزلِ مراد کے وہ لوگ ہیں خضر — جن کا ہے تیری راہ گذاروں سے ربط ضبط

جب بھی گرے تو تھام کے دامن اٹھا دیا
تسنیم گلستاں میں تھا خاروں سے ربط ضبط

○

○

دردِ شبِ فراق کی ہے غمگسار شمع
میں اس کا رازدار، مری رازدار شمع

پروانے آئیں گے جو کرے انتظار شمع
دیوانہ وار جلتی رہے دل فگار شمع

شامِ الم سے صبحِ ستم تک ہمارے ساتھ
تجھ سے بچھڑ کے روئی ہے بے اختیار شمع

جو دل جلوں کے سوگ میں جل جل کے بجھ گئی
تجھ سے ہزار بار بھلی اے بہار شمع

ہے ابتدا سے اور نہ غرض انتہا سے کچھ
منزل کی سمت جاتی ہے دیوانہ وار شمع

رہتی ہے اپنی آگ میں سوزاں، مگر خموش
کرتی ہے رازِ عشق و طلب آشکار شمع

تسنیم اسی کا نام ہے شاید شرارِ عشق
جل کے بجھی ہے بجھ کے جلی بار بار شمع

○

ہے شبِ تار میں روشن دلِ سوزاں کا چراغ
ظلمتِ کفر میں ضوبار ہے ایماں کا چراغ

روشنی، روشنی اے منبعِ نور و نکہت
دیکھ پھر بجھنے لگا ہے مرے زنداں کا چراغ

ہاں غمِ سوختہ سامانی نہیں بارِ گراں
برق ہے جیب سے مری محفلِ حرماں کا چراغ

رات بھر ہوتی رہی کشمکشِ عشق و خودی
رات بھر جلتا رہا کوچۂ جاناں کا چراغ

رستخیزی ہے کسی ناوکِ پرافشاں کی
پھر سے لو دینے لگا ہے دلِ ویراں کا چراغ

مخزنِ آرزوئے عشق مرا ہر سجدہ
اور ہر نقشِ قدم منزلِ جاناں کا چراغ

غم کی تصویر میں بھر رنگِ وفا اے تسنیم!
دل سے خوں لے کے جلا شامِ غریباں کا چراغ

○

کبھی نظر جو اُٹھی اپنے آشیاں کی طرف
پلٹ کے دیکھ لیا ہم نے آسماں کی طرف

مَیں اپنی دھن میں نہ جانے کہاں نکل آیا
چلا تھا ورنہ تمہارے ہی آستاں کی طرف

نویدِ جشنِ خزاں ہے یہ اے قفس والو
رُخِ بہار نہیں صحنِ گلستاں کی طرف

اسی کا نام قیامت ہے دوستو شاید
ہر اِک نگاہ جو اُٹھی ہے آسماں کی طرف

وہیں قریب کہیں محفلِ طرب ہو گی
چلو بڑھاؤ قدم اُس کے آستاں کی طرف

سُراغِ منزلِ گم گشتہ مجھ کو کیا ملتا
میں دیکھتا ہی رہا میرِ کارواں کی طرف

سکون و صبر و مسرت سے بھر گیا دامن
جھکی جبیں جو ترے سنگِ آستاں کی طرف

مت چارہ گروں سے تو غمِ دل کی دوا مانگ
ہو درد فزوں اور خدا سے یہ دعا مانگ

غنچوں کے لئے خونِ جگر دیتا ہوں تجھ کو
کچھ جاں کی ضرورت ہو تو اے بادِ صبا مانگ

احساس کی دولت ہے لئے بیٹھا ہوں جس کو
سب کچھ تو مرا راہنماؤں نے لیا مانگ

جینا ہے تو کچھ درد و الم کے بھی مزے لے
خوشیوں کے خزانے ہی خدا سے نہ سدا مانگ

جو دِل میں اِدھر حشر بپا کرتی ہے دن رات
یہ آنچ اُدھر بھی ہو خدا سے یہ دعا مانگ

اے رات تجھے علم ہے وہ آئیں گے ملنے
دلہن کی طرح آج تو افشاں سے سجا مانگ

جس چیز کی ہو تجھ کو طلب مانگ خدا سے
لیکن نہ کبھی وسعتِ دامن سے سوا مانگ

○

زینتِ دار و رسن ہم، جرأتِ رندانہ ہم
کم نظر دنیا نے سمجھا ہو گئے دیوانہ ہم

اضطرابِ شوق میں یوں بن گئے دیوانہ ہم
ہر کسی سے حالِ دل کہتے ہیں بیتابانہ ہم

جانے کس کی جستجو میں ٹھوکریں کھاتے رہے
قافلہ در قافلہ ویرانہ در ویرانہ ہم

اِس طرح بھی زندگی گزرے گی کیا معلوم تھا
آپ بیگانے ہیں ہم سے آپ سے بیگانہ ہم

اب یہ جانا زندگی کی دلکشی دل ہی سے تھی
دل جسے سمجھے ہوئے تھے آج تک دیوانہ ہم

مدعائے کج ادائی اب تو پورا ہو گیا
اب تو خوش ہو جاؤ اب تو بن گئے دیوانہ ہم

اب ہمارا تذکرہ تسنیم ہر اک لب پہ ہے
آپ کی محفل میں آ کر بن گئے افسانہ ہم

○

نگاہِ لطف تو ڈالو بہت اُداس ہوں مَیں
مجھے ذرا تو سنبھالو بہت اُداس ہوں مَیں

یہ تلخیاں، یہ مصائب، یہ حادثے، یہ ستم
مجھے تم ان سے بچا لو بہت اُداس ہوں مَیں

گھنیری زلفوں کے سائے میں دو گھڑی کیلئے
مرے غموں کو چھپا لو بہت اداس ہوں مَیں

نظر فریب ہیں کتنی فرار کی راہیں
شراب شیشے میں ڈالو بہت اداس ہوں مَیں

اُداس رات کے پچھلے پہر تو سونے دو
چلے بھی جاؤ، حیا لو، بہت اداس ہوں مَیں

انہیں چھپاؤ کہ ہیں دل کے ٹوٹنے کی صدا
یہ قہقہے نہ اچھالو بہت اداس ہوں مَیں

یہ شوخیاں، یہ تبسم، یہ حُسنِ زہد شکن
اُداسیوں میں چھپا لو، بہت اداس ہوں مَیں

○

کبھی تنہائی ہے سر انجمن آرائی بھی — اور کبھی انجمن آرائی ہے تنہائی بھی

تنگ دامانی حالات مرا جرم نہیں — دیکھئے آپ مرا ذوق جبیں سائی بھی

کس طرح مان لیں آئے گی وہاں فصلِ بہار — جس چمن سے کبھی گزری نہ ہو پروائی بھی

میں نے یوں تیرے تصور سے سجائی محفل — نہ رہی یاد مجھے اب میری تنہائی بھی

دیکھئے کون اب آسودۂ منزل ہوگا — راہ گم کردہ ہیں ذی ہوش بھی سودائی بھی

ہوگئے غیر کہ جو میرے تھے میں جن کا تھا — بن گئے اپنے نہ تھی جن سے شناسائی بھی

کس طرح کوئی جیئے تم ہی بتاؤ تسنیم
محرمِ راز نہ ہو جب دلِ سودائی بھی

آپ آئیں تو کچھ قرار آئے — موت کو زندگی پہ پیار آئے

راہزن کو بنا لیا رہبر! — مرحلے ایسے بار بار آئے

ہر کوئی خیر خواہ بنتا ہے — دل کو کس کس کا اعتبار آئے

کیا خبر تھی کہ تو تھا دل میں مکیں — ہم تجھے ہر کہیں پکار آئے

بس متاعِ حیات وہ لمحے! — جو ترے ساتھ ہم گزار آئے

خیر ہو قافلے کی اے یارو — نئے رہبر نئے دیار آئے

آئے تھے اور وہ چلے بھی گئے — کیا نگاہوں پہ اعتبار آئے

جانے کیوں آج وہ تصور میں — بار بار آئے بار بار آئے

آج تسنیم اُن کی محفل سے
میں نہیں سب ہی بے قرار آئے

پیغام

ہائے کس عالمِ وحشت میں مَیں سر دُھنتا ہوں
خواب اُف خوابِ پریشاں کہ جو مَیں بُنتا ہوں
ہر گھڑی ذہن کے پردوں پہ لرزتی موہوم
بھولنے والوں کی مانوس صدا سنتا ہوں

اور کئی چہرے مرے سامنے آ جاتے ہیں
اور مری سسکی اُبھرتی ہے مرے کمرے میں
اور مرے سامنے تقدیر بآوازِ بلند
قہقہے مارتی پھرتی ہے مرے کمرے میں

روتی ہنستی ہوئی سنجیدہ کئی تصویریں
آنکھ کے سامنے لہراتی ہیں بل کھاتی ہیں
میرے احساس کو ٹھکراتی ہوئی رقصندہ
دُور اُن دُور خلاؤں میں چھپی جاتی ہیں

وقت نے مجھ کو تو زخمِ دل و جاں ہی بخشے
وقت وہ جس کو ہر اک غم کی دوا کہتے ہیں
مجھ کو تو ہائے ہر اک شخص جفا جُو ہی ملا
جانے کیا شئے ہے جسے مہر و وفا کہتے ہیں

کس کو معلوم تھا تبدیلیٔ حالات کے ساتھ
وہ سبھی لوگ وہ محبوب بدل جائیں گے
ہر نفس جن کو دل و جان سے افضل سمجھا
صورتِ غیر وہ سب آنکھ چرا جائیں گے

میں نے جن کو کبھی چاہا تھا کبھی پوجا تھا
آج وہ میرے نہیں مجھ کو کوئی غم تو نہیں
میں تو اب بھی اُنہیں پہلے کی طرح چاہوں گا
میرا دل تنگ نہیں آرزوئیں سم تو نہیں

میں سمجھتا ہوں محبت وہ حسیں جذبہ ہے
جو کہ حالات کے دھارے میں نہیں بہہ سکتا
جو کہ لافانی ہے پاکیزہ بقا آتا ہے
جو کہ محدود شرائط میں نہیں رہ سکتا

میں نے اب اپنی محبت کو لگا رکھا ہے
اپنے سینے سے کہ کوئی نہ اسے جان سکے
اُن کو میری صفِ اغیار میں اعزاز ملے
اور دل زہرِ تغافل کو تو پہچان سکے

ہاں مگر اُن کو یہ کہہ دو کہ اگر بھولے سے
اُن کے ذہنوں میں مری یاد ابھر آئے کبھی
خود ہی تجویز کریں جرمِ محبت کی سزا
لاشعور اُن کا اگر ہوش میں آ جائے کبھی

○
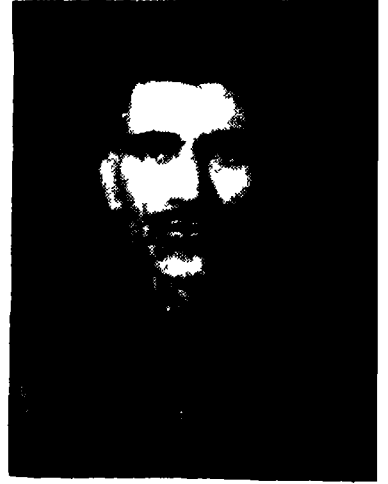
عبدالرحمٰن خاں شیدا

نام عبدالرحمٰن خان ۔ تخلص شیدا ۔ آپ کا اصل وطن ریواڑی ضلع گوڑ گاؤں ہے ۔ آپ بمقام ریواڑی
ہ میں پیدا ہوئے ۔ گھر کا ماحول مذہبی تھا اس لئے آپ نے بڑی پاکیزہ فضا میں آنکھ کھولی ۔ آپ
بتدائی تعلیم اسلامیہ ہائی سکول میں پائی ۔ پھر آپ کے والدِ محترم خان عبداللہ خان صاحب نے آپ
یم کا انتظام بعض وجوہ کی بنا پر گھر ہی میں کر دیا ۔ والدِ مرحوم کا زیادہ ذہنی رجحان مذہب کی طرف
اس لئے شیدا صاحب کو بھی ہمیشہ مذہبی اور دینی علوم ہی سے رغبت رہی ہے ۔

دہلی سے آپ کا خاندانی تعلق تھا ۔ کچھ سازگار اور کچھ نامساعد حالات کے تحت آپ نے آغازِ جوانی
ب ریواڑی کو خیرباد کہا اور اپنی رہائش دہلی منتقل کر لی ۔ ذریعۂ معاش ٹھیکیداری ٹھہرا جو پاکستان
ہی کئی سال جاری رہا ۔ اب آپ اکاؤنٹنٹ ہیں ۔

بچپن ہی سے طبیعت ادب و شعر کی طرف مائل تھی ۔ چنانچہ آپ نے دہلی میں بچوں کے لئے کچھ
آموز کہانیاں لکھیں جو بہت مقبول ہوئیں ۔ قیامِ پاکستان تک اِن کہانیوں کے دو ایڈیشن اردو
ور ایک ایڈیشن ہندی میں چھپ چکا تھا ۔ قیامِ دہلی ہی کے زمانے میں آپ نے ایک ڈرامہ
سلام" ایک ناول "جلالِ عثمانیہ" اور ایک مزاحیہ کتاب "چھیڑ خانیاں" تصنیف کیں ۔ آپ نے
ِ عثمانیہ" کی اصلاح اور نوک پلک سنوارنے کے لئے اردو کے ممتاز ادیب خواجہ محمد شفیع صاحب
ی سے رجوع کیا ۔ اس بہانے خواجہ صاحب سے ملاقات ہوئی تو خواجہ صاحب کے بے پایاں
، شگفتگیٔ مزاج، حسنِ ذوق اور علم کی گیرائی اور گہرائی سے شیدا صاحب بہت متاثر ہوئے
نیازمندی کا سلسلہ مستقل ہو گیا ۔

شیدا صاحب انجمن ترقی ادب ماڈل ٹاؤن کے سرگرم رکن ہیں ۔ اور اس کے مشاعروں کے لئے باقاعدگی سے شعر کہتے ہیں ۔ آپ کے کلام میں مذہبی اور دینی رنگ زیادہ غالب ہوتا ہے ۔ معاشرے کی اصلاح اور اسلامی اقدار کی ترویج آپ کی زندگی کا مقصد ہے اِن مقاصد کے حصول کا ذریعہ انہوں نے اپنی شاعری کو بنایا ہے ۔ طنز کے نشتر اور رجزیہ تفاخر کے پَر دونوں ہی آپ کے پاس فراواں ہیں ۔

انجمن میں آپ پروفیسر منظور احسن صاحب عباسی کے افکار و نگارشات سے زیادہ متاثر ہیں ۔

○

سلام بحضورِ سرورِ کونینؐ

السلام اے وجہِ تخلیقِ جہاں — السلام اے رازدارِ کن فکاں
السلام اے بے نیازِ این و آں — السلام اے سرِّ حق کے ترجماں
اے کلیدِ رازِ عالم السلام

السلام اے کہکشاں کے شہ سوار — السلام اے سروروں کے تاجدار
السلام اے رحمتوں کے آبشار — السلام اے غمزدوں کے غمگسار
جانِ جاں محبوبِ عالم السلام

السلام اے کاشفِ رازِ حیات — السلام اے واقفِ اسرارِ ذات
السلام اے عارفِ والاصفات — السلام اے حاصلِ کُل کائنات
تاجدارِ ہر دو عالم السلام

السلام اے روشنیٔ اوّلیں — السلام اے رونقِ دنیا و دیں
السلام اے نورِ حق نورِ مبیں — السلام اے رحمت اللعالمیں
منبعِ انوارِ عالم السلام

اے قلوبِ زنگ خوردہ کے حکیم — گلشنِ دیں کے لئے بادِ نسیم
اے کہ تُو ہے دشمنوں پر بھی رحیم — اے کریم و صاحبِ خلقِ کریم
اے مجسّم شرفِ عالم السلام

کاش اتنا جان سکتا یہ غلام — سُن لیا ہے آپ نے اس کا سلام
آرزو ہے یا شہِ خیرالانام — ہو غلاموں میں ترے شیدا کا نام
السلام آقائے عالم السلام

کشمیر جل رہا ہے

سنئے شہِ مدینہ ! کشمیر جل رہا ہے   قدرت کا وہ خزینہ، کشمیر جل رہا ہے

سنئے شہِ مدینہ ! کشمیر جل رہا ہے

گُل پوش وادیوں نے جس کو بنایا دُلہن   وہ حُسن کا سفینہ، کشمیر جل رہا ہے

سنئے شہِ مدینہ ! کشمیر جل رہا ہے

کب ہو گی غمزدوں پر لطف و کرم کی بارش   مانندِ سوزِ سینہ، کشمیر جل رہا ہے

سنئے شہِ مدینہ ! کشمیر جل رہا ہے

پنجاب کی زمیں کو دی آب و تاب جس نے   وہ شہرِ آبگینہ، کشمیر جل رہا ہے

سنئے شہِ مدینہ ! کشمیر جل رہا ہے

اُبھرا ہے جس زمیں سے عزمِ بلندِ غازی   بامِ شرف کا زینہ، کشمیر جل رہا ہے

سنئے شہِ مدینہ ! کشمیر جل رہا ہے

جس نے مجاہدوں کو دی خاتمِ سلیماں   وہ ضَو فشاں نگینہ، کشمیر جل رہا ہے

سنئے شہِ مدینہ ! کشمیر جل رہا ہے

ظلم و ستم کی آتش ٹھنڈی ہوئی نہ شیدا   سردی کا ہے مہینہ، کشمیر جل رہا ہے

سنئے شہِ مدینہ ! کشمیر جل رہا ہے

○

مجاہد سے

متاعِ قوم، فدائی، مجاہد و غازی — مرے جوان یہ بے شبہ نام تیرے ہیں
جہاں جہاں بھی نشاناتِ فتح ملتے ہیں — قسم ہے چھوڑے ہوئے وہ تمام تیرے ہیں

نظر جو آتے ہیں دیوارِ کفر میں رخنے — شگاف ڈالے ہوئے لا کلام تیرے ہیں
پہونچ کے منزلِ مقصود پر ہی دم لیں گے — رواں جہاد کی جانب جو گام تیرے ہیں

مثالِ مردِ جزائر نکال غاصب کو — دبائے بیٹھا ہے جو، وہ مقام تیرے ہیں
مٹا دے صفحۂ ہستی سے تو نمود اُن کی — بنے ہوئے ہیں جو آقا، غلام تیرے ہیں

یقین رکھ، کہ اکیلا نہیں ہے تو اے دوست — خدا گواہ خواص و عوام تیرے ہیں

تری شجاعت و ہمت پہ ہے جہاں شیدا
یہ ماہ و سال ترے، صبح و شام تیرے ہیں

قطعات

یہ مانا کہ تُو شاعرِ بے بدل ہے — زباں میں تری زندگی ہے اجل ہے
اگر قومِ خفتہ کو بیدار کر دے — تو پھر قابلِ قدر تیری غزل ہے

○

جو ہو جذبۂ خدمتِ ملک و ملّت — ہو منزل ترے فکر کی بامِ رفعت
پھر اس پہ ہو جوشِ بلندیِ مذہب — تو وہ شاعری ہے تری وقفِ عظمت

○

میری تاریخ مجھ سے کہتی ہے — استقامت پیامِ نصرت ہے
کامیابی ہے ہمرکاب اُس کی — جس کو حاصل عنانِ جرأت ہے

○

مسلم ترے کردار پہ نازاں تھے جو ایام — ماضی کے دھندلکوں سے وہی شام و سحر ڈھونڈ
تھے جتنے منوّر ترے تاریک شب و روز — پھر مطلعِ آفاق پہ وہ شمس و قمر ڈھونڈ

○

ہے سارا جہاں شرق سے تا غرب ہمارا — مسلم کا زمانہ میں وطن کوئی نہیں خاص
ظلمت بھری دنیا میں چمکنا نہیں آساں — سو ضرب سہے تب کہیں بنتا ہے نگیں خاص

○

اکبر نے سچ کہا تھا جوانانِ قوم سے — رکھے نہ شرم سوز نگاروں سے ربط ضبط
ماتم کروگے غیرتِ مشرق کا ایک دن — سائے بڑھا رہے ہیں غزالوں سے ربط ضبط

○

آ بتاؤں جہاد کے معنی ! — حق کی خاطر مجادلہ کرنا
سرفروشی کا اقتضا یہ ہے — مرتے دم تک مقابلہ کرنا
جان دے کر شہید نے سیکھا — اپنے رب سے معاملہ کرنا

○

کارگر ہونے لگی ہے فکرِ شیطاں آج کل — طفلِ آوارہ بنے ہیں مردِ میداں آج کل
اِک ذرا سی بات پر ہوتے ہیں خنجر بے نیام — کتنا ارزاں ہو گیا ہے خونِ انساں آج کل

○

غیرتِ دیں کی ہے شیدا چشمِ گریاں آج کل — بنتِ حوا ہو رہی ہے نیم عریاں آج کل
چاہتی ہے یہ لباسِ مختصر بھی ختم ہو — شوقِ آزادی میں آکر روحِ نسواں آج کل

○

نپٹنے کا دشمن سے وقت آ گیا ہے — یہ کہہ دو ہر اک منچلے نوجواں سے
یہ ہے فرضِ مادر کہ خود اپنے ہاتھوں — سجائیں سپوتوں کو تیغ و سناں سے

نڈر ہو کے چڑھ جاؤ فوجِ عدو پر — مخالف ہے لرزاں ہماری اذاں سے
سوال آ پڑا موت یا زندگی کا — جواب اِس کا میدان میں دیجیے سناں سے

○

مسلکِ امن و تعاون پہ ابھی مائل ہوں مَیں — اِن روایاتِ سلف پر آج بھی عامل ہوں میں
ہاں اگر ملکی تحفظ کے لیے لڑنا پڑے — پھر فقط جلاد ہوں، چنگیز ہوں، قاتل ہوں میں

○

جو کل تھے وہی آج بھی ہیں ارض و سمٰوات — لیکن ہمیں حاصل نہ رہی پہلی سی وہ بات

وہ تاج جو مسلم کو وراثت میں ملا تھا — پامال کیا آپ ہی ہم نے اُسے ہیہات

افسوس کہ ہیں مسجدیں ویران ہماری — آباد ہوئے جس سبب سے زمانہ کے خرابات

مایوس معابد ہمیں تکتے ہیں شب و روز — ہم ہیں کہ لبالب ہوئے دل میں ہیں خرابات

اقوام جن اسباب سے ناپید ہوئی تھیں — آج اُن کی سبھی ہم میں ہیں موجود علامات

صد حیف کہ مرغوب ہیں آج اپنی نظر میں — مغرب سے جو نازل ہوئیں آفات و بلیّات

غیروں کے تمدن سے جو اطوار لئے ہیں — واللہ وہی تو ہیں تباہی کی علامات

ہم جیسوں پہ ہوں کس لئے انوارِ الٰہی — تپتے ہوئے صحراؤں میں ہوتے نہیں باغات

کس طرح ہمیں نورِ ہدایت نظر آئے — جب تک نہ ہٹیں ظلمتِ عصیاں کے حجابات

باطل نہ کبھی ٹھیر سکا سامنے حق کے — حق پر نہیں ہوتیں کبھی باطل کو فتوحات

کیا چیز ہیں تعلیم محمدؐ کے مقابل — دانائیِ سقراط، ارسطو کے مقالات

اِن میں سے ہر اک خالقِ اکبر کا ہے مظہر — انساں ہو کہ حیوان، نباتات و جمادات

کیوں طاقتِ دشمن سے پریشاں ہو مسلم — مومن تو کیا کرتے ہیں بے تیغ فتوحات

شیداؔ تمہیں توبہ کی جو توفیق عطا ہو
ہو جائیں یہاں کے یہیں سب چکتا حسابات

○

اشعارِ چمن کے لایا ہوں مَیں کہکشاں سے آج
فکرِ بلند پایہ ہے کچھ آسماں سے آج

جس کا نشہ اُتر نہ سکے پڑھ کے ایک بار
وہ جام پی کے آیا ہُوں پیرِ مغاں سے آج

بڑھنے لگا ہے مرکزِ الحاد کی طرف
لاوا نکل کے شاعرِ آتش فشاں سے آج

واضح رہے کہ غیرتِ ایماں مری نہیں
کچھ اور جان پڑ گئی میرے بیاں سے آج

کر کے رہے گا خاک جلا کر رقیب کو
بچ کر نہ جا سکے گا یہ رحمان خاں سے آج

ہے باغِ دہر میں گل و بُلبل کی آرزو
کانٹا نکال پھینکئے اِس گلستاں سے آج

ایمان ہنس رہا ہے تو باطل نڈھال ہے
دنیا پہ پھول برسیں نہ کیوں آسماں سے آج

دیکھو وہ گھورنے لگے مجلس میں سب اُسے
شیدا نے ہے جگا دیا خوابِ گراں سے آج

ناچ اے ضمیرِ قوم تو اپنی لگن کا ناچ
دنیا کو ناچنے دے نغز کتنے بدن کا ناچ

اے قوم ہوشیار کہ دشمن ہے دلفریب
تجھ کو لبھا رہا ہے ترے راہزن کا ناچ

صدیوں سے ہم تماشہ بنے ہیں جہان میں
دیکھا کیا زمانہ ہمارے وطن کا ناچ

کتنے ہی ناچ یوں تو نچائے گئے ہمیں
لیکن کبھی نہ بھولے گا وہ مکر و فن کا ناچ

اب تک ہے یادگار وہ ٹیپو کے عہد میں
سازِ فرنگ پر جو تھا اہلِ دکن کا ناچ

در پردہ اس میں بھی تھی کسی گورکن کی شہ
تقسیمِ ہند پر جو تھا اہلِ وطن کا ناچ

تہذیبِ نو کا صدقہ کہ فخر و غرور سے
بھائی بھی دیکھتا ہے کلب میں بہن کا ناچ

اب تو خدا کے واسطے شیدا سنبھل کے چل
دنیا نے نام رکھ دیا تیرے چلن کا ناچ

اے ستمگر جفا کی راہ سے بچ — زخم خوردہ دلوں کی آہ سے بچ
خونِ مظلوم جس کی قیمت ہو — اے طلب گار ایسی جاہ سے بچ
ناروا ظلم تا بکے صیاد — بلبلِ بے خطا کی آہ سے بچ
دوست سمجھا ہے تُو نے شیطاں کو — اِس کھلے دشمنِ اِلٰہ سے بچ
یہ مقامِ خودی نہ چھن جائے — انقلاب آزما نگاہ سے بچ
دلِ شکستہ سے جو نکلتی ہے — اے جفا کیش اُس کراہ سے بچ
جس کی منزل ہو نکبت و ذلت — دیدہ ور ہے تو ایسی راہ سے بچ
تجھ میں گر ہے ذرا بھی دانائی — میرے جذبات کی سپاہ سے بچ
دوستی ہے یہ دشمنی تو نہیں — کہہ رہا ہوں کہ بچ گناہ سے بچ
یاں ہیں فتنے ہزار پوشیدہ — نفس کی تو کمین گاہ سے بچ

قہر بن جاتی ہے کبھی یہ بھی
دیکھ شیدا کی اس نگاہ سے بچ

○

مسلم تری زباں تھی کبھی تیر کی طرح — تیری نگاہِ غیض تھی شمشیر کی طرح

تیری زباں سے نکلا ہوا ایک لفظ بھی — عالم میں تھا نوشتۂ تقدیر کی طرح

لیکن وہ شان آج تنزّل پذیر ہے — مغلوب حاکموں کے دساتیر کی طرح

نقشہ گذشتہ ایک صدی ہی کا دیکھ لے — ہے ہر طرف تُو پیکرِ تحقیر کی طرح

تُو نے ہی قدر کی نہ خلافت کے تاج کی — ورنہ تھی سب زمیں تری جاگیر کی طرح

اب بھی اگر تُو چاہے، ملے پھر وہی عروج — لازم ہے عزم ہو ترا شبّیر کی طرح

کشمیر چاہتا ہے تو بھارت کے سامنے — سینہ سپر ہو ضیغمِ کشمیر کی طرح

شیدا کی ہے غزل وہی اے دوست کامیاب
چبھ جائے جو جگر میں ترے، تیر کی طرح

○

ہو تابناک پھر شبِ تاریک تر کا رُخ — ماضی سے موڑ لائیں جو زرّیں سحر کا رُخ

ہیں معرکے گواہ صلیب و ہلال کے — تھا اہلِ دیں کی سمت ہی فتح و ظفر کا رُخ

اِک آن میں اُدھر صفِ باطل اُلٹ گئی — حق نے جدھر بھی کر دیا تیغ و تبر کا رُخ

تدبیرِ کفر کی ہوئی زیر و زبر تمام — اسلام نے کیا سرِ میداں جدھر کا رُخ

بھاگا جدھر سے لشکرِ طوفان و سرکشی — ہمت نہ تھی کہ پھر کبھی کرتا اُدھر کا رُخ

سَو سال قبل حاصلِ گریہ ہمیں تو تھے — اِس دَور کی طرف تھا کلامِ ظفر کا رُخ

کیا جانے کیا ہو قافلۂ اہلِ دیں کا حشر — منزل جدھر نہیں ہے اُدھر راہبر کا رُخ

احباب کی نگاہ بھی بدلی ہوئی سی ہے
شیدا بدل رہا ہے جو فکر و نظر کا رُخ

○

راہِ عمل پہ دوڑتے رہنا ہی شان ہے — ٹوٹیں ہزار تجھ پہ مصائب کے گو پہاڑ
حرص و ہوس نے ڈیرے جو دل میں جمائے ہیں — ہمت سے کام لے کے انہیں جڑ سے دے اکھاڑ
مردانِ الجزائر و تیونس کو مرحبا — آتش فشاں فرانس کا حلیہ دیا بگاڑ
تاریخ میں یہ جنگ بھی کتنی عجیب ہے — بکری نے شیر کو سرِ میداں دیا پچھاڑ
ہو کیوں نہ کامیاب بہ ہر عرصۂ حیات — عفریتِ نفس کو اگر انساں دے پچھاڑ
دشمن اگر ضعیف ہے نرمی سے کام لے — لیکن اگر قوی ہے تو مثلِ ببر دہاڑ
واللہ یہ وجودِ دلِ بشر ہے دلیلِ حق — سچ ہے کہا کسی نے کہ تل اوٹ ہے پہاڑ

شیدا ترے کلام سے بڑھتی ہی جائے گی
ایوانِ کفر میں تری ڈالی ہوئی دراڑ

جب بگڑتا ہی گیا فکرِ جہاں کا انداز — تلخ تر ہوتا گیا میرے بیاں کا انداز
ہیں جو شیدائے تہذیبِ فرنگی کا شکار — شاق گزرے گا انہیں میری زباں کا انداز
اب کرے مجھ پہ ستم جتنا بھی چاہے جلاد — درد نے سیکھ لیا ضبطِ فغاں کا انداز
قدر ہوتی ہے بہاروں کی اسی کے دم سے — روح پرور ہو نہ کیوں بادِ خزاں کا انداز
تو نہ لُٹ جائے کہیں اے دلِ ناداں ہشیار — دیکھ غارت گریٔ حسنِ بتاں کا انداز
کر چکی پہلے ہی اپنا نگۂ شاہِ زمن — مجھ کو اپنائے گا کیا نازِ بتاں کا انداز
ہائے وہ وقت کہ بت لرزہ براندام تھے سب — جبکہ تھا کفر شکن میری اذاں کا انداز

رنگ لایا ہے ترا طرزِ سخن اے شیدا
کچھ بدلنے تو لگا پیر و جواں کا انداز

○

لادینیت کو آج ہے ادیان کی تلاش — ادیان کو ہے دامنِ قرآن کی تلاش

مشکل ہے کچھ نفوس ملیں گے جہان میں — اِس دور میں جو کیجئے انسان کی تلاش

تھے ہم کبھی مجاہدِ میدانِ کارزار — اب ہے ہر ایک گام پہ رومان کی تلاش

اپنا تو کچھ طریقِ تجسس ہی اور ہے — ہم بتکدے میں کرتے ہیں ایمان کی تلاش

بینشِ نظر ہو صاحبِ قرآں کی زندگی — تم کو اگر ہے معنیٔ قرآن کی تلاش

جب سے نیا لباس لیا ٹیڈی گرل نے — وقتِ طلب نہیں رہی شیطان کی تلاش

مغرب زدوں میں شرم و حیا؟ ایسی بات ہے — یورپ میں جیسے کوئی کرے پان کی تلاش

اصلاحِ حالِ قوم کی شیدا کو فکر ہے
رہتی ہے اِس کو ایک ہی عنوان کی تلاش

○

کرنا ہے اُن کے سامنے مجھ کو بیانِ شوق — ہاں لڑکھڑا نہ جائے کہیں پھر زبانِ شوق

بے وجہ کر کے ذکرِ ستم ہائے روزگار — کرنے لگے ہیں دوست مرا امتحانِ شوق

کیا دلفریب ہے چمنستانِ آرزو — کیا گل کھلا رہا ہے مرا باغبانِ شوق

یورپ کی لغویتیں جو ہمیں تحفۃً ملیں — تکمیل پا رہا ہے انہیں سے جہانِ شوق

ٹیڈیز کے لباس کی رونق تو دیکھئے — سامانِ عیش سے ہے مزین دکانِ شوق

تیری غزل سے کھلتے ہیں اسرارِ معرفت
شیدا نہ چھوٹ جائے کہیں یہ عنانِ شوق

○

جن کی نظروں میں تھے کل تک عاقل و فرزانہ ہم
آج ان کے سامنے ہیں عقل سے بیگانہ ہم

روشنی پھیلا رہا تھا اپنی پیشانی کا نور
شمعِ دیں پر تھے فدا حبیب صورتِ پروانہ ہم

ہے وجودِ ملکِ پاکستان خود اس کی دلیل
اب بھی رکھتے ہیں دلوں میں عزم بیباکانہ ہم

دشمنوں کی دور ہو جائیں گی سب خرمستیاں
جب دکھائیں گے انہیں اک جرأتِ رندانہ ہم

قصرِ ملت کو تباہی سے بچا سکتے نہیں
رخنہ پردازوں کو رکھ کر اندرونِ خانہ ہم

ہم سے اقرارِ وفا غیروں پہ الطافِ کرم
کیسے کیسے دوستوں سے رکھتے ہیں یارانہ ہم

مانگتے ہیں آج کم ظرفوں سے ہم تلچھٹ کی بھیک
بزمِ عالم میں کبھی تھے صاحبِ میخانہ ہم

ظلمتِ حاضر کے پردے چاک ہو جائیں تمام
شمعِ دیں لے کر اٹھیں شیدا اگر مردانہ ہم

وہ دلوں پہ حکمرانی، وہ عروجِ خسروانہ
یہ حقیقتِ مسلماں ہوئی آج اک فسانہ

رہِ پُرخطر کے راہی! ابھی وقت ہے پلٹ آ
تجھے پیس کر نہ رکھ دے کہیں گردشِ زمانہ

تری لاابالیوں نے تجھے کھو دیا جہاں سے
ذرا سوچ تو کہاں تک ترا ساتھ دے زمانہ

تجھے برتری جہاں میں جو نصیب ہو تو کیونکر
نہ سبیلِ حق نوازی، نہ طریقِ منصفانہ

تجھے کیا خبر ہے ناداں کہ ہے بجلیوں کی زد میں
بڑی حسرتوں سے تُو نے جو بنایا آشیانہ

بھلا کس طرح نبھے گی کسی بُت سے تیری شیدا
تری خُو خدا پرستی، وہ ادائے کافرانہ
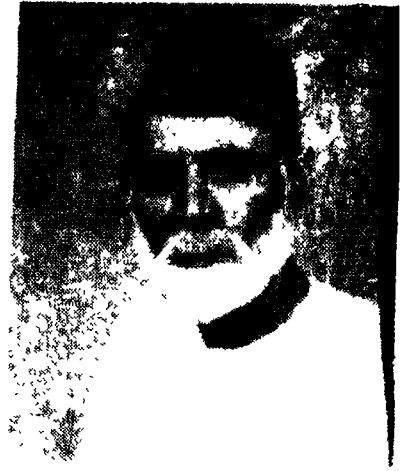
مولانا افسر صدیقی امروہوی

نام منظور احمد، تخلص افسر، ۹ دسمبر ۱۸۹۶ء کو بمقام امروہہ پیدا ہوئے جہاں فرخ سیر بہادر کے عہد میں آپ کے جدِ امجد شیخ نیاز علی صدیقی المعروف بہ نیازی، دہلی سے ترکِ وطن کر کے مستقل طور پر سکونت پذیر ہو گئے تھے۔

آپ کے والد شیخ شمس الدین نے آپ کا نام منظور احمد تجویز کیا اور آپ کے جدِ محترم مولوی رحیم بخش صاحب نے آپ کا تاریخی نام منظور حسن تجویز کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ نومولود اپنی خداداد علمیت و قابلیت سے فخرِ خاندان ثابت ہوگا اور اپنے آباؤ اجداد کے زریں کارناموں کو اور بھی روشن کرے گا۔

آپ نے کم عمری ہی میں قرآن مجید کی تعلیم کے بعد اردو فارسی میں اتنی دسترس حاصل کر لی تھی کہ خط و کتابت آسانی سے کر سکتے تھے۔ ۱۹۱۵ء میں سایۂ پدری سر سے اٹھ جانے پر آپ کو گوناگوں مصائب و آلام سے دوچار ہونا پڑا اور اس کا اثر آپ کے تعلیمی مستقبل پر بھی پڑا۔ تاہم آپ مقامی سکول سے اردو فاضل کا امتحان پاس کر کے امروہہ ہی میں بعہدۂ مدرس مامور ہو گئے۔ ساتھ ہی اردو اور فارسی کا مطالعہ جاری رکھا اور خداداد ذہانت سے دونوں زبانوں میں مہارتِ کامل حاصل کر لی۔ آپ کو شعر و سخن کا ذوق بچپن ہی سے تھا۔ پہلی غزل ۱۹۱۴ء میں رسالہ "طالبِ دیدار" میرٹھ میں شائع ہوئی جس کے ساتھ رسالہ کے ایڈیٹر نے تحسین آمیز اور حوصلہ افزا نوٹ بھی لکھا۔ اس تعریف نے سمندِ شوق پہ تازیانہ کا کام کیا۔ اسی دوران آپ نے حضرت مضطر خیرآبادی سے شرفِ تلمذ حاصل کیا لیکن یہ سلسلہ صرف ڈیڑھ سال تک جاری رہ سکا۔ حضرت مضطر کسی بنا پر ناخوش ہو گئے اور جب اُن کی ناگواریٔ خاطر کا ازالہ نہ ہو سکا تو ۱۹۲۴ء میں آپ شوق قدوائی لکھنوی کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہو گئے۔ انہوں نے نہایت خلوص و محبت سے اصلاحِ سخن فرما کر مولانا افسر کو اپنے بہترین رنگِ شاعری سے بہرہ یاب کیا۔ آپ نے استاد کی اس عنایت کا اعتراف اپنے

ایک مقطع میں اس طرح کیا ہے ؎

سخن گوئی نہ کیوں ہو سہل آنسر عنایت شوق کی ہے اور میں ہوں

جلد ہی آپ کی نغز گفتاری کی شہرت دور دور پھیل گئی اور ممتاز ادبی انجمنوں نے آپ کو فصیح البیان، بلیغ الکلام اور افسر الشعرا جیسے خطابات دیئے ۔ ۱۹۲۶ء میں آپ امروہہ سے کراچی چلے آئے اور ایک مدت تک کراچی میونسپل اردو سکول میں بعہدہ مدرس متعین رہے ۔

۱۹۳۴ء میں کراچی سے ماہنامہ "تنویر" جاری کیا ۔ ۱۹۳۹ء میں صوبائی انجمن ترقی اردو کراچی کے سیکرٹری منتخب ہوئے ۔ کراچی کے علاوہ کوئٹہ میں بھی انجمن کی شاخ کا قیام آپ ہی کی تحریک پر عمل میں آیا ۔

آج کل مرکزی انجمن ترقی اردو کراچی کے مخطوطات کی توضیحی فہرست مرتب کر رہے ہیں ۔ جس کی ایک جلد شائع ہو چکی ہے ۔ اس کے علاوہ "تذکرۂ فروغ وطن" اور "شعرائے سلسلہ مصحفی" کی ترتیب و تدوین میں عمرِ گرانمایہ کا ایک طویل حصہ صرف کر چکے ہیں ۔

آپ کے کلام کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں ۔ (۱) برقِ تخیل ۔ اس مجموعہ میں ابتدائی کلام شامل ہے جس کی اصلاح حضرت مضطر نے کی تھی ۔ (۲) تابشِ خیال جس میں ۱۹۲۸ء تک کا کلام شامل ہے ۔ (۳) شہابِ تخیل (۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۹ء تک کا کلام) اس کے بعد کا کلام ترتیب و اشاعت کا منتظر ہے ۔

مولانا کا حلقۂ تلامذہ بے حد وسیع ہے اور آپ کے کئی شاگرد خود صاحبِ تلامذہ ہیں گزشتہ چودہ برس سے آپ فکرِ سخن ترک کر کے محض تحقیقی کام میں منہمک ہیں ۔

دم اکھڑے تو علاجِ گریۂ پیہم نہیں ہوتا
ہوا الٹی چلے تو جوشِ دریا کم نہیں ہوتا

مٹا تاریکیٔ اعمال کو روشن دماغی سے
چمکنے ہی کی خاطر نیرِ اعظم نہیں ہوتا

کچھ ایسا راز مجھ سے کہہ دیا ہے نکہتِ گل نے
کہ اب اپنی پریشاں خاطری کا غم نہیں ہوتا

بہارِ بے بہا روتی ہے اپنے رنگِ ہستی پر
چمن میں برگِ گل آلودۂ شبنم نہیں ہوتا

مآلِ عشق سے واقف ہوں میں اے ناصحِ مشفق
مگر کیا کیجیے جوشِ محبت کم نہیں ہوتا

طریقہ زندگی کا سبزۂ پامال سے سیکھو
کہ سر اس کا نہ اٹھنے کے سبب سے خم نہیں ہوتا

عبورِ قلزمِ آتش کو اک بازی سمجھتا ہے
وہ پروانہ کہ جس کو جاں دہی کا غم نہیں ہوتا

فروغِ بے ثباتِ غیر پر کیوں دھیان دوں افسر
مہِ نو بدر ہو کر نیرِ اعظم نہیں ہوتا

ظرفِ ظاہر نہ حریفِ غمِ پنہاں نکلا
سانس جو سینہ سے نکلا وہ پریشاں نکلا

کھو دیا جلوۂ یک رنگ نے جیبِ فرقِ نمود
جس بیاباں پہ نظر کی وہ گلستاں نکلا

مل گیا خاک میں سب حوصلۂ جوشِ جنوں
چند ذرات کا مجموعہ بیاباں نکلا

حسن کو بھی نہیں افکارِ محبت سے نجات
گل بھی اک دفترِ اوراقِ پریشاں نکلا

دیدۂ شوق سے امیدِ وفا تھی مجھ کو
یہ بھی ہم صورتِ آئینۂ حیراں نکلا

دامنِ حشر بہ اندازۂ وحشت نہ سہی
پھر غنیمت ہے کہ اک اور بیاباں نکلا

رہ گئی حسرتِ گلچینیٔ گلزارِ جمال
ناتمام اس کے لیے دامنِ امکاں نکلا

مرگِ ناکام پہ روؤں کہ ہنسوں اے افسر
میری میت کی طرف سے کوئی خنداں نکلا

○

پردہ داری یہ کہ اب تک روکشِ دنیا نہیں   جلوہ باری یہ کہ جیسے کوئی بھی پردا نہیں
ہائے وہ بیتابیٔ الفت کا ہنگامِ شباب   ہیں سکونِ زندگی میں بھی جسے بھولا نہیں
اس کو کہتے ہیں فریب کامیابِ زندگی   رشتۂ امید تا حدِ نفس ٹوٹا نہیں
دل کی استعداد کافی ہے برائے انبساط   بادۂ الفت ہیں قیدِ ساقی و مینا نہیں
اک طلسمِ وہم ہے ہنگامۂ دورِ حیات   اک فریبِ آرزو ہے محفلِ دنیا نہیں
کائناتِ دل میں ہیجانِ تمنّا الاماں   باوجود اس کے کہ محکم وعدۂ فردا نہیں
شعر گوئی بر بنائے خدمتِ احباب ہے
افسرِ خوش گو کو علم و فضل کا دعویٰ نہیں

○

دور تک کوئی نشانِ قربتِ منزل نہیں   اب ہوا ثابت کہ جوشِ رہبری کامل نہیں
بار اٹھائے عشق کا اتنی مجالِ دل نہیں   مہربانی ہے تمہاری میں کسی قابل نہیں
ضبطِ غم کا پاس غالب ہے خیالِ مرگ پر   جی رہا ہوں گو کہ لطفِ زندگی حاصل نہیں
رنگ بھر نا رہ گیا ہے حسرتوں کے خون سے   میں وہ تصویرِ وفا ہوں جو ابھی کامل نہیں
اڑ رہی ہے رہبرِ راہِ طلب سے دور دور   گردِ منزل بھی شریکِ زحمتِ منزل نہیں
کشتیٔ دل کا خدا حافظ ہے بحرِ عشق میں   جا رہی ہے اس طرف کو جس طرف ساحل نہیں
رات بھر آتی ہے کانوں میں نوائے جانفزا   شکر ہے اللہ کا خاموش سازِ دل نہیں
رات کی خاموش تاریکی میں افسر غور کر
چودھویں منزل سے پہلے ماہ کیوں کامل نہیں

○

○

نہیں مرغوبِ خاطر گلشنِ ہستی کی بُو مجھ کو
وہ شبنم ہوں کہ قربِ مہر کی ہے آرزو مجھ کو

الٰہی اب تری مرضی اگر محروم رہ جاؤں
سرِ منزل تو لے آئے ہیں پائے جستجو مجھ کو

عطا ہوں اے غمِ انجام کچھ اشکِ ندامت بھی
عبادت کے لیے کافی نہیں آبِ وضو مجھ کو

بہ ترکِ مدعا تو کیا ہوا اک مدعا ٹھہرا
خدا نا کردہ کیوں ہو بیخودی کی آرزو مجھ کو

ذرا دیکھوں یہ خاکے تو نہیں میرے تصور کے
نظر آتی ہیں کیوں شکلیں بہت سی چار سُو مجھ کو

طریقِ عشق میں کچھ منزلیں ایسی بھی آتی ہیں
جہاں باقی نہیں رہتی مجالِ گفتگو مجھ کو

ہوائیں اتنی یاس انگیز تھیں راہِ محبت کی
بجھانا ہی پڑا آخر چراغِ آرزو مجھ کو

جوابِ سخت گویاں ہے سکوتِ برمحل اخگر
سکھائی ہے یہی فطرت نے طرزِ گفتگو مجھ کو

○

رنگینیٔ جمال کا سرمایہ دار ہے
وہ عہدِ التفات کہ نا استوار ہے

افسردگی کو موجبِ تفریحِ دل سمجھ
غنچوں کی بستگی میں فروغِ بہار ہے

کیا اُس گناہگار کے عصیاں کا پوچھنا
جس کی مدد پہ رحمتِ پروردگار ہے

تاکیدِ ضبطِ غم سے دہن بے فغاں سہی
اس کا علاج کیا ہے کہ دل بیقرار ہے

مانا کہ آپ ہوں گے کبھی شاملِ حیات
اپنی حیات کا مجھے کب اعتبار ہے

ہوگا کسی کے واسطے شام و سحر کا لطف
میرے لئے تو گردشِ لیل و نہار ہے

اللہ عشق دے کہ بکھیڑے ہوں سب تمام
اخگر یہی دوائے غمِ روزگار ہے

○

میری بیخودی نے بچا لیا مجھے ہر تصورِ خام سے
تری زلف و رُخ کے خیال میں نہ سحر سے کام نہ شام سے

مجھے کیا اُمیدِ فلاح ہو سرِ طوُر جلوۂ عام سے
کوئی غش ہوا کوئی جل گیا اثرِ فروغِ کلام سے

یہ ہے آفتاب سے بھی سوا وہ ہے ایک ذرّۂ بے بقا
نہیں کوئی دُور کا واسطہ ترے رُخ کو ماہِ تمام سے

نہ بقا میں فکرِ فنا ملی نہ فنا میں فکرِ بقا ملی
غمِ زندگی کی دوا ملی مجھے دردِ عشق کے نام سے

ابھی ایک اور بھی ہے سفر تہِ قبر ہی نہیں مستقر
یہ ملا ہے وقفۂ مختصر کہ قدم ہوں تیز قیام سے

یہ ہے مشقِ آپ کے نام کی، یہی ایک بات ہے کام کی
نہ طلب ہے عیشِ دوام کی، نہ غرض ہے لطفِ مدام سے

طلبِ وفا پہ ستم سہی مرے ظرفِ شوق سے کم سہی
نہ سہی سرور، الم سہی، ملے کچھ تو مرجعِ عام سے

نہ خیالِ طرزِ خرام ہے نہ ملالِ فتنۂ عام ہے
جسے اپنے کام سے کام ہے اُسے کام کیا مرے کام سے

میں وہی ہوں آفتِ مبتلا جو ہوا نہ دُور کشِ مدعا
مگر اس پہ بھی یہ قلق رہا کہ خفا ہیں آپ غلام سے

پروفیسر سیّدہ منیرہ بخاری

آپ کا وطن چک ۲۰۳ ج ب ضلع لائل پور ہے۔ ۱۹۳۶ء میں آپ وہاں ایک علمی گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ آپ کے والدِ محترم سیّد عنایت حسین شاہ عربی، فارسی، اردو ادبیات پر عبور کامل رکھتے ہیں وہ ایک صاحبِ ذوق اور متدّین بزرگ ہیں۔ اس لئے سیّدہ منیرہ بخاری کو بچپن ہی سے جہاں ایک طرف ادبی و شعری ماحول میسّر آگیا وہاں دوسری طرف دینی تعلیم کا اہتمام بھی گھر ہی میں ہوگیا۔ چنانچہ آپ نے شعر و سخن کا آغاز صغر سنی میں اسی ماحول کے تحت کیا اور عربی، فارسی کی تعلیم حاصل کرنے لگیں۔ عربی فاضل اور فارسی فاضل کے امتحانات پاس کرنے کے بعد اُس ماحول میں گنجائش نہ رہی کہ آپ علم کی مزید اعلیٰ منازل طے کر سکیں اس لئے ۱۹۶۱ء میں لاہور آگئیں۔

لاہور کی علمی اور ادبی فضا نے آپ کے دل و دماغ پر بڑا خوش گوار اثر ڈالا۔ یہاں اعلیٰ امتحانوں کی تیاری کے ساتھ ساتھ ادبی و شعری تخلیقات بھی ہونے لگیں۔ دو سال آپ مجلسِ فکر و نظر میں شریک ہوتی اور اس کی سرگرمیوں میں حصّہ لیتی رہیں۔ اس کے بعد ۱۹۶۳ء سے انجمن ترقیٔ ادب ماڈل ٹاؤن سے وابستہ ہو کر اس کے طرحی مشاعروں میں حصّہ لینے لگیں اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ آپ نے اس انجمن کی چند ادبی صحبتوں میں شریک ہو کر محسوس کیا کہ اس کی پُر خلوص، سنجیدہ مگر زندگی سے بھرپور فضا، فطری ذوق کو جلا بخشنے کے لئے بہت ہی سازگار ہے۔ چنانچہ آپ باقاعدہ سے طرحی غزلیں لکھتے اور انجمن کی سرگرمیوں میں بڑی دلچسپی لینے لگیں۔ آپ اس انجمن کی مجلسِ انتظامیہ کی ممبر بھی ہیں۔ اِن دنوں لاہور کے ایک زنانہ کالج میں پروفیسر ہیں۔

سیّدہ منیرہ بخاری کو اسلامی فلسفہ سے گہرا لگاؤ ہے۔ اس میں آپ کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ اسلامی فلسفہ پہ آپ نے کئی مقالات لکھے ہیں جس میں سے بعض رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ افسانے بھی لکھتی ہیں۔ عربی، فارسی، انگریزی، ادبیات پر پورا عبور حاصل ہے۔ زبان سادہ، بندشِ الفاظ چُست اور شعر پُرسوز ہوتا ہے۔

○

تربیت عشق سے ہی پاتا ہے انساں کا مزاج
لے کے آیا ہے ازل ہی سے یہ طوفاں کا مزاج

دامنِ دشت میں لب کھولنے والی کلیو!
کون پوچھے گا بیاباں میں بہاراں کا مزاج

آگئی گر کہیں پیمانے کی زد پر ساقی
ہم بھی پوچھیں گے کبھی گردشِ دوراں کا مزاج

بلبلِ زار نہ سمجھی گلِ خنداں کا مزاج
بے رُخی اُس کی ہے تلقینِ خموشی لیکن

دل میں بستا ہے مگر آنکھ سے پوشیدہ ہے
کس قدر شوخ و طرحدار ہے یزداں کا مزاج

میر کے واسطے آؤ نہ چمن میں لوگو
آج ناساز سا ہے نرگسِ حیراں کا مزاج

جل کے گرتے ہوئے پروانے نے شعلے سے کہا
آج معلوم ہوا شمعِ فروزاں کا مزاج

میرے مرنے پہ منیرہ کہا رو کر اُس نے
کون سمجھے گا ترے بعد گلستاں کا مزاج

○

وہ خاک کریں صورتِ حالات کی اصلاح
جو کرتے نہیں اپنی ہی عادات کی اصلاح

پھر شام و سحر کو تو نیا رنگ عطا کر
آ ہوش میں کر معرفتِ اوقات کی اصلاح

ہے تیرا عمل تیرے خیالات کی تصویر
لازم ہے تجھے اپنے خیالات کی اصلاح

انساں کو خلافت کا امیں جب کے خدا نے
کی اُس کے لئے ارض و سماوات کی اصلاح

یہ گردشِ دوراں ہے کہ یاں ایک کے بعد ایک
کرتا ہے سدا پہلے نظریات کی اصلاح

تُو واقفِ اسرار ہے، تُو صاحبِ افکار
رکھ پیشِ نظر صورتِ حالات کی اصلاح

ہے چال بلا، تیر نظر، قد ہے قیامت
کس طرح ہو اُس حملۂ آفات کی اصلاح

ہم اُن سے گریزاں ہیں منیرہ کہ ہمارا
مقصد ہے دلِ شوخ کے جذبات کی اصلاح

○

اسیرِ غم تھا یہ دل یوں تو ہوتا کیا گستاخ
کسی کی چشمِ عنایت نے کر دیا گستاخ

گرفت عشق کی پھر بات بات پر کیوں ہو
ہے جبکہ حسن کی اپنی بھی ہر ادا گستاخ

اٹھا اٹھا کے ستم تیرے، ہو گئی آخر
مری وفا بھی تری طرح بے وفا گستاخ

چمن میں کیسے کلی مسکرا کے لب کھولے
اِدھر ہے تاک میں گلچیں اُدھر قضا گستاخ

وہ آ ہی جاتا کبھی راہ پر عبث یہ دل
تڑپ تڑپ کے یونہی خون ہو گیا گستاخ

یہ ڈر ہے بار نہ ہو اُن کی طبع نازک پر
اُدھر بہار کا موسم اِدھر صبا گستاخ

جھجک کے سر کو چڑھا کر کمانِ ابرو کو
عجب ادا سے انہوں نے مجھے کہا گستاخ

حضورِ شمع گرا جب منیرہ! پروانہ
بھڑک کے شعلے نے فانوس میں کہا گستاخ

نہ ہوا یہ کسی طرح آباد
دل کہ ناشاد تھا رہا ناشاد

جب بھی آتی ہے بن گئی ہے غزل
کتنی بے ساختہ ہے تیری یاد

باغباں مل گیا ہے گلچیں سے
کون سنتا ہے پھول کی فریاد

جل گیا تھا بہار میں سب کچھ
اتنی ہی داستاں ہے اپنی یاد

ہم سے کہہ کہہ کے داستانِ بہار
دل نہ اب اس طرح جلا صیاد

دل پہ جینا حرام ہو جائے
ہو اگر دامِ زلف سے آزاد

دیکھ لے گر کہیں ترے قد کو
سر اٹھائے نہ شرم سے شمشاد

وہ منیرہ سے ہو کے بیگانہ
رہ سکیں گے نہ ایک دن بھی شاد

○

کشتی ہوئی تھی غرق یوں ساحل پہ آن کر — ٹکرا گئے تھے موج سے اُٹھتے ہوئے بھنور
یادِ بہار، یادِ چمن، یادِ آشیاں — یادوں کا شہر ہے یہ مرا سوختہ جگر
بجھنے لگی ہے شمعِ شبستانِ آرزو — "دیکھیں شبِ فراق کی ہوتی ہے کب سحر"
دل مٹ گیا تو نخلِ تمنا ہرا ہوا — طوفاں سے گزر کے یہ قطرہ ہوا گہر
یہ جانِ مضطرب ہے تری دید کے لئے — یہ دل ہے آج تک تری یادوں کی رہگذر
میرے ہی درد کا یہ فسانہ ہے چار سُو — میری ہی داستاں کے عناصر ہیں بکھرے پر
اب میری آنکھ میں کوئی آنسو نہیں رہا — اب میری آہ میں کوئی باقی نہیں اثر

کل کہہ رہا تھا کوئی منیرہؔ سے کر نہ غم
شاید وہ رفتہ رفتہ یوں ہی آئے راہ پر

○

یا الٰہی کیا کروں میرا مہِ کامل ہے دور — میری بزمِ شوق سے وہ رونقِ محفل ہے دور
عرش سے بھی کچھ پرے آواز دیتا ہے کوئی — دشتِ ایمن سامنے لیکن مری منزل ہے دور
میری تنہائی کا عالم دیکھنے کی چیز ہے — آنکھ میں تصویر ہے ساقی کی اور محفل ہے دور
دل کو مٹنے کی تمنا، سر کو کٹنے کا جنوں — وائے قسمت کس طرح پورا ہو وہ قاتل ہے دور
سامنے ہیں، روبرو ہیں، پاس ہیں، نزدیک ہیں — ایسی قربت سے بھلا کیا فائدہ جب دل ہے دور
رات کو اختر شماری، دن کو سوزِ آرزو — مدتیں گزریں مرے دل سے سکونِ دل ہے دور
ناتوانی کہتی ہے دم بھر ٹھہر جا، سانس لے — شوق کہتا ہے ابھی تو لیلیٰ محمل ہے دور

ہم نے سیکھا ہے منیرہؔ کھیلنا طوفان سے
ڈر نہیں اس کا سفینے سے اگر ساحل ہے دور

○

○

مجھ پہ ہے مہرباں بہت آسماں ہنوز
زد میں ہے بجلیوں کی مرا آشیاں ہنوز

اے دوستو ابھی سے اُٹھے جا رہے ہو کیوں
پوری کہاں ہوئی ہے مری داستاں ہنوز

ہم مٹتے مٹتے مٹ گئے تیرے جہان سے
حد ہو گئی ہے گردشِ دوراں جواں ہنوز

باقی جو چند تنکے ہیں اِن کو بھی پھونک دے
صیاد مطمئن نہیں برقِ تپاں ہنوز

واعظ اسی لئے تو تو بچ کر نکل گیا
پہچانتا نہیں ہے تجھے پاسباں ہنوز

ظالم! مرے مزار سے دامن بچا کے چل
آسودہ میری خاک میں ہیں بجلیاں ہنوز

تُو جانتا نہیں ابھی آدابِ بزمِ حُسن
اچھی ہیں تیرے واسطے یہ دُوریاں ہنوز

فکرِ معاش، فکرِ جہاں، فکرِ روزگار
آرامِ جاں یہاں ہے میسر کہاں ہنوز

ہاں اے فدائے راہِ وفا اے شہیدِ عشق
رودِ فرات ہے تری افسانہ خواں ہنوز

تو آسماں بسانے چلا ہے مگر یہ سوچ
ویران ہیں زمیں پہ کئی بستیاں ہنوز

کوئے بتاں کی بات مَنیرہ کچھ اور ہے
آباد اِس قدر نہیں باغِ جناں ہنوز

○

ویران گھر ہے، میکدہ سونا، نگر اُداس
آنکھوں میں بس گئی ہے کسی اجنبی کی آس

اپنے نصیب میں ہی نہ تھا اُن کا التفات
"میرا تو کچھ قصور نہیں اے نگاہِ یاس"

جھپکی گئی ہے جب بھی نقاہت سے میری آنکھ
محسوس یوں ہوا ہے کھڑے ہیں وہ میرے پاس

یارب ترے جہان میں کوئی بھی خوش نہیں
صد چاک ہیں گلوں کے گریباں کلی اداس

طوفاں ہے موج ہے، تو کنارا ہے بحر ہے
یہ راہ بھی نہ آئے گی شاہین تجھ کو راس

شاید اُسے بھی جرم کا احساس ہو گیا
صیاد کتنے روز سے پھرتا ہے بدحواس

چاہو تو اپنے ہونٹ بھی سی لوں پئے روزِ حشر
دامن سے تیرے آئے گی خود میرے خوں کی باس

جیتے ہیں بس یہ ہم سے منیرہ ستم نصیب
اِک بے وفا کا عہد ہے اور اِک حسین آس

ربط پھولوں سے ہے نہ خار کا ہوش
اب خزاں کا نہ ہے بہار کا ہوش

محملِ شوق ہے نظر میں بس
جستجو میں کِسے غبار کا ہوش

مجھ کو مستِ خمار رہنے دے
ہوش کھوتا ہے بار بار کا ہوش

آخری سانس تک رہا قائم
کب گیا تیرے جاں نثار کا ہوش

پوچھتے ہو مرے گنہ کا حساب
بے خودی میں تھا کب شمار کا ہوش

تجھ کو کھو کر یہ اپنی حالت ہے
جیت کی آرزو نہ ہار کا ہوش

داستانِ فراق سن کے مری
اُڑ گیا میرے غمگسار کا ہوش

وہ بلائیں اگر منیرہ کو
آن کیسی، کِسے وقار کا ہوش

○

عاقل کو ہر گھڑی ہے دل و جاں کی احتیاط
دامن کا خوف ہے تو گریباں کی احتیاط

گل کی ہنسی ہی بن گئی وجہِ قضائے گل
کی باغباں نے لاکھ گلستاں کی احتیاط

غنچے سے کہہ رہی تھی صبا مسکرا کے یوں
کب تک کرو گے جیب و گریباں کی احتیاط

ڈرتا ہے دل نہ تم کو کسی کی نظر لگے
رکھا کرو ذرا رُخِ تاباں کی احتیاط

پنہاں ہے پھول پھول میں ذرّوں میں آشکار
کیا ہم کریں گے، دیدۂ حیراں کی احتیاط

پھر لے اُڑی ہے بادِ صبا مشکِ عنبریں
کرتے رہے وہ زلفِ پریشاں کی احتیاط

ہے عاشقوں کا قتل بھی ان کی نظر میں کھیل
وہ کیوں کریں گے دشنۂ مژگاں کی احتیاط

دل راہبر ہے تیرا منیرہ ترے لیے
لازم ہے اِس چراغِ فروزاں کی احتیاط

○

یوں جلا صلح و آشتی کا چراغ
بجھ کے رہ جائے بت گری کا چراغ

بندگی شرطِ آدمیت ہے
رکھ فروزاں یہ بندگی کا چراغ

دردِ دل کے طفیل زندہ ہیں
"غم سے روشن ہے زندگی کا چراغ"

مَیں تو زندہ ہوں ہمدمو! جب تک
ہے فروزاں یہ بے خودی کا چراغ

کس کے رُخ سے نقاب اٹھی ہے
گُل ہوا پھول کی ہنسی کا چراغ

بجلیوں نے جلا دیا گھر کو
آندھیاں لے اُڑیں خوشی کا چراغ

شاعروں ہی کے دم سے روشن ہے
دہر میں رسمِ عاشقی کا چراغ

دل کو ایمان سے منوّر رکھ
دل منیرہ ہے راستی کا چراغ

○

○

دو رُخی چالوں کا ڈر ہے چور دروازوں کا خوف
بزدلوں پر کس قدر طاری ہے جاں بازوں کا خوف

تیغ اور تلوار کی جھنکار گونجے اس طرح
دشمنوں کے دل ہلا دے تیرے اِن سازوں کا خوف

تُو تو شاہیں ہے تجھے قیدِ مکاں سے کیا غرض
کیا ڈرائے گا تجھے اِن آشیاں سازوں کا خوف

مدتوں تک تھرتھرائے گا فضاؤں کا جگر
میری ارضِ پاک کے جیالے ہوا بازوں کا خوف

اے مجاہد اُٹھ کہ تیرے پاؤں میں ہے کائنات
تجھ کو کیا توپوں کا ڈر کیا تیر اندازوں کا خوف

تیرے ڈر سے آشیانوں میں ممولے جا چھپے
رُوح کھینچے جا رہا ہے تیری پروازوں کا خوف

موت ہو سر پر منیرہ لب پہ وردِ لا اِلٰہ
مطلقاً دل میں نہ رکھنا ان ستم سازوں کا خوف

○

دلوں کے داغ روشن ہیں لبوں پہ جان آنے تک
بہارِ باغ قائم ہے گلوں کے مُسکرانے تک

مہ و انجم بھی ڈوبے شمع تھک کر سو گئی کب سے
یہ چشمِ منتظر جاگی سحر کے لوٹ آنے تک

مرے خونِ جگر کا رنگ ہے پھولوں کے ہونٹوں پر
نگہ سے بڑھتے بڑھتے داستاں پہنچی فسانے تک

فلک گردش میں ہے جب تک کہ اہلِ شوق جیتے ہیں
تڑپ بجلی کی قائم ہے ہمارے آشیانے تک

جبینِ شوق نے ہر گام پر سجدے کیے برسوں
غبارِ راہ بن کے آ گئی تیرے آستانے تک

بہر صورت ہمیں پینا پڑے گا جامِ زہرِ غم
منیرہ شمع روشن ہے ستارے ڈوب جانے تک

○

O

بتکدے ویران کر دے گی یہ بُرہاں کی چمک
معجزے دکھلائے گی یوں میرے قرآں کی چمک

دل کے آئینے میں جلوہ ریز ہے کس کا جمال
"چشمِ بینا میں ہے کس کے رُوئے تاباں کی چمک"

جس طرح خورشید کی آمد سے شبنم کا وجود
لے اُڑی یوں ہوش چشمِ فتنہ ساماں کی چمک

ظلمتِ باطل سے گھبرانا نہ میرے غازیو!
راستہ دکھلائے گی خود نورِ ایماں کی چمک

آج تک ہے طُور کی وادی سراپا انتظار
دیکھ لی تھی اُس نے اِک دن رُوئے جاناں کی چمک

کر نہیں سکتی ہراساں میرے شیروں کو کبھی
کافروں کے جگمگاتے ساز و ساماں کی چمک

یہ سحر تیرے تبسم کی ہے اِک ادنیٰ جھلک
شب کی دُلہن نے چرالی تیری افشاں کی چمک

وقتِ رخصت جو سرِ مژگاں اٹک کر رہ گیا
آج تک ہے خونگن اُس اشکِ تاباں کی چمک

ہے پتنگے کے دلی جذبات کی آئینہ دار
کانپتی، جلتی، تڑپتی شمعِ سوزاں کی چمک

دیکھ کر مجھ کو غیرِ قید خانے میں اسیر
منہ چڑاتی ہے مرا صبح بہاراں کی چمک

O

○

جذبات مختلف ہیں تو ہیں دل الگ الگ ۔۔۔ اعمال ہیں جُدا جُدا حاصل الگ الگ

ارضِ حجاز میں ہو کہ ہو ارضِ ہند میں ۔۔۔ مقتول ایک اور ہیں قاتل الگ الگ

خورشید میں، قمر میں، ستاروں کے حسن میں ۔۔۔ جلوہ نما ہے اِک مہِ کامل الگ الگ

اُن کی نگاہِ ناز کی شوخی تو دیکھئے ۔۔۔ کرتی ہے ایک وار ہیں بسمل الگ الگ

دنیا میں زندگانی بسر کر کچھ اس طرح ۔۔۔ رہتا ہے جیسے موج سے ساحل الگ الگ

اے قیس اپنے دل میں ذرا جھانک کر تو دیکھ ۔۔۔ لیلیٰ ہے ایک اور ہیں محمل الگ الگ

کیسے نبھے گی اپنی صنم گر سے ہمدمو! ۔۔۔ رستے جدا جدا ہیں تو منزل الگ الگ

دامانِ گل ہیں چاک تو کلیاں ہیں چشمِ تر ۔۔۔ منہ دیکھ دیکھ روتے ہیں بسمل الگ الگ

آنکھوں میں اشک، لب پہ فغاں، دل میں سوز و درد ۔۔۔ پھیلائے ہاتھ آئے ہیں سائل الگ الگ

آرام سے نہ بیٹھیں گے ہم اے صنم گرو ۔۔۔ چھوڑیں گے کر کے اب حق و باطل الگ الگ

مل کر بڑھو کہ وقت کے دھارے کو موڑ دیں ۔۔۔ کیا سوچتے ہو برلبِ ساحل الگ الگ

کیا جانے کس خطا پہ وہ ناراض ہو گئے
رہتے ہیں اب منیرہ سے بالکل الگ الگ

○

بنے میں گرچہ چھوٹا سا نظر آتا ہے دل — کیسے کیسے راز سینے میں چھپا جاتا ہے دل

ہی آنسو، کبھی بجلی، کبھی سیماب ہے — نت نئے پہلو بدل کر سامنے آتا ہے دل

ے ذرّے میں ہے اُس محبوب کی جلوہ گری — پوچھتے ہو ہر قدم پر کیوں مٹا جاتا ہے دل

رہوں کب سے یُوں اے موت اب تو آ بھی جا — اب تو مٹی کے قفس میں سخت گھبراتا ہے دل

ے ماتھے کی شکن کچھ اور گہری ہو گئی — "چھوٹتی جاتی ہیں نبضیں ڈوبتا جاتا ہے دل"

بخود لو چل دیئے ہم کو لئے جاناں کی طرف — غالباً پھر آج ہم کو یاد فرماتا ہے دل

نقاب آ جائے گر محفل میں وہ توبہ شکن — پاؤں چھو لینے کو ذرّوں میں سما جاتا ہے دل

ہیوں رکھتا ہے سوز و درد و غم سے تو اسے — ایسی چیزوں ہی سے تو نشوونما پاتا ہے دل

ں کیا شے ہے محبت کیا ہے جس کے واسطے — اپنی ہستی کو مٹانے میں مزا پاتا ہے دل

کا پتلا تو پہلے بھی مٹ کتنی ہی بار — کیا کروں جب خاک ہو جاتا ہے بن جاتا ہے دِل

ہنکہ جاتے ہوئے دانش کے جل جاتے ہیں پَر — عشق کی اِک جست میں فوراً پہنچ جاتا ہے دل

آنسو، چند آہیں آرزوئے ناتمام — اِن ہی اجزا سے مرکب ہو کے کہلاتا ہے دل

جھوم اُٹھتے ہیں در و دیوار اس کے سحر سے
بے خودی میں جب منیرہ جھوم کر گاتا ہے دل

○

کسی غنچہ دہن کی بات کرو — زلفِ توبہ شکن کی بات کرو
نرگس و یاسمن کی بات کرو — پھر اُسی انجمن کی بات کرو
مدتوں سے بہار رُوٹھی ہے — کسی گل پیرہن کی بات کرو
زندگی تلخ ہوتی جاتی ہے — بُتِ شیریں سخن کی بات کرو
کٹ کے رہ جاتی ہے زباں ہر بار — جب بھی اُس تیغ زن کی بات کرو
ہم اسیروں سے یوں قفس میں تم — یوں نہ ہنس کے چمن کی بات کرو
رہنماؤں کی بات رہنے دو — راہ کی، راہزن کی بات کرو
پھر ہو تجدیدِ شیوۂ منصور — پھر کسی کوہکن کی بات کرو

دل منیرہؔ بجھا بجھا سا ہے
بزمِ شعر و سخن کی بات کرو

○

قطرہ قطرہ بہہ کر دریا بن جاتا ہے — ذرہ ذرہ مل کر صحرا بن جاتا ہے
چودھویں رات کا چاند ہو یا چڑھتا سورج ہو — جس کو دیکھوں تیرا چہرا بن جاتا ہے
لاکھ چھپاؤں راز مگر وہ پا لیتے ہیں — سامنے اُن کے حال کچھ ایسا بن جاتا ہے
دولت کی دیوی کو پا کر اِس دنیا میں — یہ انسان نہ جانے کیا کیا بن جاتا ہے
روشنیوں کا جھلمل جھلمل کرتا ساگر — پل بھر میں کیوں خون کا دریا بن جاتا ہے
جس کو غیر سمجھتے ہیں ہم پہلے پہلے — رفتہ رفتہ جانِ تمنا بن جاتا ہے

وہ تو منیرہؔ بے پردا رہتے ہیں ہر دم
جلوہ میری آنکھ کا پردا بن جاتا ہے

○

پروفیسر محی الدین خلوت ایم۔اے

غلام محی الدین نام ، خلوت تخلص ۔ تاریخ پیدائش ۱۸۹۶ء ۔ آبائی وطن لاہور ۔ ابتدائی تعلیم لاہور ہی میں حاصل کی ۔ منشی فاضل ، ایم اے (فارسی) ، ایم ۔ او ۔ ایل کی ڈگریاں پنجاب یونیورسٹی سے حاصل کیں ۔ سابقہ پنجاب کے مختلف گورنمنٹ کالجوں میں اردو فارسی کے لیکچرار رہ کر ۱۹۴۹ء میں بحیثیت گزیٹڈ آفیسر پنشن حاصل کی ۔

لاہور کی علمی و ادبی فضا میں شعر گوئی اور مضمون نگاری کا شوق پیدا ہوا ۔ اردو فارسی کے ممتاز جرائد و رسائل میں مضامین نثر و نظم مختلف اوقات میں شائع ہوتے رہے ۔ انگریزی کی مستند اور بلند پایہ نظموں کے منظوم تراجم جو برصغیر پاک و ہند کے ممتاز شعراء نے کئے ایک کتاب کی صورت میں بعنوان " دو آتشہ " شائع کئے ۔ بچوں کے لئے بھی آسان انگریزی نظموں کے منظوم تراجم کا ایک مجموعہ " دو رنگی " کے نام سے شائع کیا ۔ اپنی نوعیت کی پہلی لغت " اردو لغاتِ مترادفات " کے نام سے بیس سال قبل زیورِ طبع سے آراستہ ہوئی ۔

غزلوں اور تاریخ اسلام کے ایمان افروز واقعات کا ایک مجموعہ زیرِ طبع ہے ۔ شاعری اور مضمون نگاری کا مشغلہ اب تک بدستور جاری ہے ۔

○

ہے خزانہ یہ بے بہا کچھ سوچ — داغِ دل کو نہ یوں دکھا کچھ سوچ

بے رُخی اور تغافلِ پیہم — ہے وفاؤں کا یہ صلا کچھ سوچ

تُو بھی ہنستا ہے حال پر میرے — غیر سے پھر ہو کیا گلا کچھ سوچ

یوں سرِ بزم شرفِ انساں کا — چاک ہو دامنِ حیا کچھ سوچ

عالمِ رنگ و بو میں انساں کا — مقصدِ زندگی ہے کیا کچھ سوچ

یہ حسیں مہر و ماہ و نکہت و نور — کس کی ہے شوخئ ادا کچھ سوچ

دل کے ویراں کھنڈر میں لے خلوت
گونجتی ہے یہ کیا صدا کچھ سوچ

○

ا جو بزمِ ناز میں غیروں کو اُن کے پاس — باقی رہی نہ دل کے سنبھلنے کی کوئی آس

پرتوِ حسیں لب و گیسوئے یار کا — ہلکا سا یہ کلی کا تبسم گلوں کی باس

میاں ازل سے لکھی تھیں نوشت میں — تیرا تو کچھ قصور نہیں اے نگاہِ یاس

بے نیازِ بادۂ عیش و طرب رہے — غم تیرا آ گیا جنہیں کون و مکاں میں راس

مرِ زیست جیسا ہے ذیشان و خوشنما — ویسی ہی بے ثبات ہے اِس قصر کی اساس

ے جمالِ دوست کے ہر سُو عیاں ہوئے — لیکن بجھی نہ تشنۂ دیدار کی پیاس

چمن سے جانِ بہاراں وہ کیا گیا — سبزہ ہے سرنگوں تو گل و لالہ ہیں اداس

بے باک اس قدر ہے ترے عشق نے کیا
جلوت کا اب نہ ڈر ہے نہ خلوت کا ہے ہراس

○

○

جب سے ہوا ہے زینتِ دل آشنا کا نام — یکسر مٹا ہے دل سے فنا و بقا کا نام

جورِ بتاں سے جب ہوئی رخصت متاعِ صبر — بے اختیار آیا زباں پہ خدا کا نام

بازارِ قتلِ غمزۂ خوباں سے گرم ہے — بدنام اِس جہاں میں عبث ہے قضا کا نام

بڑھتا مریضِ عشق کا ہے درد اور جب — لیتے ہیں چارہ گر سرِ بالیں دوا کا نام

اک دُکھنے سے تیرے دل و جاں پہ بن گئی — حیراں ہوں کیا رکھوں میں تری اس ادا کا نام

یہ بھی ہے اک کرشمۂ رودادِ حسن و عشق — ہنتا ہے ہر زباں پہ شہیدِ وفا کا نام

ہوتے ہیں جو بھی سرخوشِ صہبائے عشقِ دوست
لیتے نہیں ہیں وہ ستمِ ناروا کا نام

○

علاجِ ہجرِ صنم چشمِ خونفشاں میں نہیں — یہ ضبطِ غم میں نہیں نالہ و فغاں میں نہیں

فسانہ حسن کا تیرے زباں زباں پر ہے — وفا کا باب مگر تیری داستاں میں نہیں

کہاں تو جائے گی برقِ تپاں بتا تو سہی — کہ ایک تنکا بھی اب میرے آشیاں میں نہیں

ہے نکھرا عظمتِ انساں سے کائنات کا رنگ — مگر یہ جنسِ گرانمایہ اب جہاں میں نہیں

جو تیرے غم کے حسیں لمحوں میں نصیب ہوئی — وہ بات جانِ جہاں عمرِ جاوداں میں نہیں

نشانِ منزلِ مقصود کیسے پائیں جب — شعورِ منزلِ مقصود کارواں میں نہیں

تری جبیں کے ستارے کچھ اس طرح چمکے — کہ تابِ دید سرِ عرش کہکشاں میں نہیں

جو آنچ وجہِ فروغِ سخن ہے اب خلوت
گدازِ دل میں ہے وہ شوخیٔ بیاں میں نہیں

○

○

رشک کھاتی ہے داغِ دل پہ بہار　　میری پلکوں پہ کہکشاں ہے نثار
تُو جو روٹھے تو روٹھ جائے بہار　　تُو جو آئے تو آئے دل کو قرار
کون صحنِ چمن کو چھوڑ گیا　　سونی سونی پڑی ہے راہگزار
برق گرتی ہے شعلے اُٹھتے ہیں　　ہے تصوّر میں ایک شوخ نگار
آبلہ پا نرے کہاں جائیں　　گُل بداماں بہار میں ہیں خار
ہے جمالِ مآلِ حُسن سے گُل　　چاک دل، اشک ریز، سینہ فگار
رہ گئیں دل کی دل میں یوں گویا
خلوتِ دل ہے حسرتوں کا مزار

○

آج اک شمعِ شبستانِ محبت دیکھی　　اوج پر گویا ہے پروانوں کی قسمت دیکھی
کشتِ امید نہ اپنی ہوئی شاداب کبھی　　ہم نے اے ابرِ کرم تیری سخاوت دیکھی
سرکا اُس عارضِ گلگوں سے جو زلفوں کا نقاب　　رُخِ مہتاب سے اُڑتی ہوئی رنگت دیکھی
بزم میں آئے بھی تڑپا یا بھی اور چل بھی دیئے　　حشر کہتے ہیں اسے ہے یہ قیامت دیکھی
آج آنکھوں سے برستا ہے صبوحی کا خمار　　ہم نے رعنائیِ دوشیزۂ فطرت دیکھی
موند لی آنکھیں تو کونین کے سب راز کھلے
تیرے دیوانوں نے خلوت میں بھی جلوت دیکھی

○

نذیر قیصر نام ۔ قیصر تخلص ۔ ان کا سالِ پیدائش ۱۹۴۵ء ۔ آبائی وطن جالندھر ہے ۔ یہ ہوشیارپور میں پیدا ہوئے اور جس رات ان کی پیدائش ہوئی اُس کی صبح کو ان کی والدہ محترمہ انتقال کر گئیں عرصہ تعزیت گذر جانے کے بعد رشتہ داروں نے ان کے والدِ محترم پر زور دیا کہ وہ دوسری شادی کر لیں ۔ وہ نہ مانے اور قیصر صاحب کو لے کر اپنے وطن جالندھر سے جہلم چلے آئے ۔ ان دنوں جہلم میں ان کے ایک ہندو دوست لالہ اوتار نرائن وکالت کرتے تھے ۔ نذیر صاحب کے خاندان اور اس ہندو گھرانے کے گہرے تعلقات تھے ۔ لالہ اوتار نرائن کا نوجوان لڑکا راج دریائے جہلم میں ڈوب گیا تھا ۔ اس صدمے نے اس گھرانے کو بہت ہی مغموم بنا دیا تھا ۔ چنانچہ لالہ صاحب کے گھر والوں نے نذیر قیصر کو اپنی گود میں لے لیا ۔ لالہ صاحب کی بیوی نند ادر ان کی صاحبزادی اوما بالخصوص نذیر قیصر کو بہت چاہتیں اور انہیں پیار سے اوم کہا کرتی تھیں ۔

تقسیم ملک پر لالہ اوتار نرائن جالندھر چلے گئے اور قیصر صاحب کے والد نے جہلم میں ملازمت اختیار کر لی ۔ گیارہ سال جہلم میں قیام کرنے کے بعد یہ کنبہ ملتان چلا گیا اور ملتان سے لاہور پہنچ گیا اب ان کی مستقل سکونت لاہور میں ہے اور لاہور کی زندگی ہی نذیر قیصر کا اوڑھنا بچھونا ہے ۔

قیصر صاحب کو بچپن ہی سے مناظرِ قدرت بہت محبوب رہے ہیں ۔ اکثر ایسا ہوتا رہا کہ آپ پڑھنے کے لئے گھر سے سکول کو روانہ ہوتے مگر گھر سے نکلتے ہی دریا یا کسی باغ کا رُخ کیا اور وہاں جا کر گھومتے رہے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان مناظرِ قدرت کا اثر قیصر صاحب کے دماغ پر غیر شعوری انداز سے مرتسم ہوتا گیا ۔ چنانچہ ان کی شاعری میں تشبیہات، استعارے اور علامتیں بہت ہیں اور ان کا تعلق زیادہ تر عناصرِ قدرت ہی سے ہے ۔ وہ خود بھی شاعری کو رنگیوں کی راہوں میں خوشبو کا سفر کہتے ہیں ۔

O

الجھتا ہے کیوں تُو فقط ہم سے ناصح — مفر ہے کسے عشق کے غم سے ناصح

تجھے زیب دیتی نہیں دل کی باتیں — تجھے کیا غرض زلفِ پُرخم سے ناصح

نہیں زخمِ الفت کو درماں کی حاجت — علاقہ نہیں اس کو مرہم سے ناصح

رُکے کس طرح اپنی آنکھوں کا دریا — بچے کیسے دل دردِ پیہم سے ناصح

نہیں آتی ہرگز ہمیں دنیا داری — الجھنا سمجھ سوچ کر ہم سے ناصح

مرا جا رہا ہے قیامت کے ڈر سے — ہراساں ہے رفتارِ عالم سے ناصح

سزاوارِ الفت ہیں کافر نہیں ہیں — ڈرائے نہ ہم کو جہنم سے ناصح

مرا شیشۂ دل دو عالم نما ہے
مجھے کام کیا ساغرِ جم سے ناصح

O

قافلہ ٹھہرا ہوا ہے قریۂ قاتل کے پاس — وائے ناکامی پہنچ سکتے نہیں منزل کے پاس

روز و شب دشتِ سفر میں گونجتی ہے یہ صدا — کچھ نہیں جز نارسائی سعیِ لاحاصل کے پاس

تُو ابھی آیا نہیں لیکن ترے قدموں کی چاپ — سن رہا ہوں دیر سے میں رہگذارِ دل کے پاس

پھیلتی جاتی ہیں زلفیں عارضِ خوشتاب پر — چھا رہے ہیں ابر کے ٹکڑے مہِ کامل کے پاس

بہہ رہے ہیں پانیوں میں رنگ کیا کیا دھوپ کے — دھند سی پھیلی ہوئی ہے دُور تک ساحل کے پاس

جھلملانے لگ گئے آنکھوں میں اشکوں کے چراغ
جانے کیا پیغام تھا قیصرؔ سفیرِ دل کے پاس

O

○

زندگی یوں گزر گئی خاموش — جیسے صحرا کی چاندنی خاموش
دور تک کچھ نظر نہیں آتا — شہر سنسان ہر گلی خاموش
اس کا ذکر کیا کہ محفل میں — آج ہے شمع پاس بھی خاموش
حشر کیا کیا بپا ہوئے لیکن — محفلِ زندگی رہی خاموش
وہ بھی بیٹھے ہیں آج مُہر بہ لب — جن کو دیکھا نہ تھا کبھی خاموش
کھل گیا اس پہ رازِ دل آخر — چشمِ حیراں نہ رہ سکی خاموش
آج پھر تیری یاد شام ڈھلے — چھیڑ کر دل کو ہو گئی خاموش

کس کی چاہت میں اس طرح قیصر
پھر رہے ہو گلی گلی خاموش

○

ظلمتِ دل سے شعاعوں کا گزر ہو کہ نہ ہو — کون جانے شبِ ہجراں کی سحر ہو کہ نہ ہو
شوقِ دیدار ٹھہر حدِ نظر سے نہ گزر — عرش پر بھی مرا مقصودِ نظر ہو کہ نہ ہو
اپنے اشکوں سے ہی میں جامِ تمنا بھر لوں — میری جانب نگہِ کیف اثر ہو کہ نہ ہو
حسن سایہ ہی سہی دل میں چھپا لے اس کو — پھر یہ سایہ بھی گرفتِ نظر ہو کہ نہ ہو
کون جانے دلِ برباد پہ ہنسنے والے — کل یہ اجڑا ہوا گھر بھی ترا گھر ہو کہ نہ ہو
ہم تو آنکھوں سے کبھی کام نہ لیں ڈر یہ ہے — اُن کو منظور یہ ایثارِ نظر ہو کہ نہ ہو
ہم سمو لائے ہیں لفظوں کے نگینوں میں لہو — اب یہاں کوئی شناسائے ہنر ہو کہ نہ ہو

جان دینا بھی جدائی میں عبث ہے قیصر
کیا خبر محوِ تغافل کو خبر ہو کہ نہ ہو

○

زمیں کے گھر کا دروازہ سجا کر دیکھ لیتا ہوں
میں اپنی چاپ سے خود کو ڈرا کر دیکھ لیتا ہوں

نظر آتا نہیں جب حرف کوئی لوحِ عالم پر
میں اپنا نام لکھ کر اور مٹا کر دیکھ لیتا ہوں

جہاں بارش پڑے میں جذب ہو جاتا ہوں مٹی میں
جہاں آندھی چلے میں سرسرا کر دیکھ لیتا ہوں

نہیں ملتا کہیں جب اپنی ہستی کا پتہ مجھ کو
ہوا کے سامنے شمعیں جلا کر دیکھ لیتا ہوں

جسے دیکھا نہیں ہے دیکھ کر بھی میری آنکھوں نے
اُسے میں اپنے خوابوں میں سجا کر دیکھ لیتا ہوں

جُدا کرتی نہیں مجھ سے مجھے بہتی ہوئی لہریں
میں اپنا عکس پانی میں بہا کر دیکھ لیتا ہوں

کبھی ہنس کر کبھی آنسو بہا کر دیکھ لیتا ہوں
میں ہر چہرے کو آئینہ دکھا کر دیکھ لیتا ہوں

بہت بے چین کر دیتی ہیں جب تنہائیاں گھر کی
در و دیوار پر شکلیں بنا کر دیکھ لیتا ہوں

چھپاتا ہے بہت مجھ کو مرا سایہ مگر پھر بھی
میں خود کو روشنی سے دُور جا کر دیکھ لیتا ہوں

کوئی میری طرح بیرونِ در بھی قید ہو شاید
میں دروازے کو اندر سے سجا کر دیکھ لیتا ہوں

جسے دیکھا نہیں روتا ہوں اُس کی یاد میں شب بھر
جسے پایا نہیں اس کو گنوا کر دیکھ لیتا ہوں

کبھی کرنا ہوا اندازہ جب اپنے درد کا مجھ کو
میں اُس بیدرد کے دل کو دُکھا کر دیکھ لیتا ہوں

پہن لیتی ہیں جب شاخیں ہرے موسم کے پیراہن
کوئی ٹوٹا ہوا پتہ اٹھا کر دیکھ لیتا ہوں

○

آنکھیں، چہرہ، ہاتھ لیے پھرتا ہوں میں — کیا کیا اپنے ساتھ لیے پھرتا ہوں میں

رنگوں کے انجان جزیروں کی چپ میں — خوشبو کے نغمات لیے پھرتا ہوں میں

گونج ہے میری چاپ میں عہدِ رفتہ کی — کھوئے ہوئے لمحات لیے پھرتا ہوں میں

ایک مسلسل دن ہے میری آنکھوں میں — ایک مسلسل رات لیے پھرتا ہوں میں

ذرا ذرا سی باتوں پر رو پڑتا ہوں — بچوں سے جذبات لیے پھرتا ہوں میں

قیصر یوں لگتا ہے جیسے اپنے ساتھ
اور بھی کوئی ذات لیے پھرتا ہوں میں

○

روز و شب دشتِ فنا کے سامنے رہتا ہوں میں — ایک اَن دیکھی صدا کے سامنے رہتا ہوں میں

مجھ میں لرزاں ہیں بدلتے موسموں کی صورتیں — آئینہ ہوں اور ہوا کے سامنے رہتا ہوں میں

ہر نفس در پیش ہے خوشبو کی منزل کا سفر — رنگ بکھراتی فضا کے سامنے رہتا ہوں میں

کچھ نہیں کھلتا کب آ کر توڑ جاتا ہے کوئی — سوچ کا پیکر بنا کے سامنے رہتا ہوں میں

صبح ہوتے ہی بکھر جاتے ہیں میرے ہاتھ پاؤں — رات بھر پاگل ہوا کے سامنے رہتا ہوں میں

شام ہوتے ہی لپیٹ جاتا ہے مجھ سے میرا جسم
سارا دن عکسِ خلا کے سامنے رہتا ہوں میں

○

○

روشن ہے آسمانِ خلا عکسِ آب سے
کرنیں برس رہی ہیں فضا میں سحاب سے

پھر گھومتی ہے گلیوں میں برسات کی ہوا
پھر کھڑکیوں میں کھِلنے لگے ہیں گلاب سے

حیراں کھڑی ہیں وسعتِ امکاں کی سرحدیں
چپکے ہوئے ہیں پاؤں ہوا کی رکاب سے

نکھرا رہے ہیں نقشِ زمیں کے وجود پر
سائے اُگل رہی ہے سحر آفتاب سے

بکھرے ہوئے ہیں آنکھ میں وہم و یقیں کے حرف
آزردہ دل ہوں خاک و ہوا کی کتاب سے

جب تک رہی درونِ بدن صُبح کی کرن
لپٹا رہا ہوں خیمۂ شب کی طناب سے

جس نے سیاہ کر دیا دن کا سفید پھول
دہکی ہوئی ہے شام اُسی مہرتاب سے

○

سنسان جنگلوں میں اُڑا لے گئی مجھے
میں خاکِ رہگزر تھا ہوا لے گئی مجھے

چُپ چاپ میری ذات کا پودا اجاڑ کر
وہ اپنے گیسوؤں میں سجا لے گئی مجھے

دن بھر میں اپنے جسم کا سایہ بنا رہا
سُورج ڈھلا تو رات چھُپا لے گئی مجھے

میں اپنے دائرے میں دلآزار تو نہ تھا
کیوں مجھ سے دُور میری صدا لے گئی مجھے

فانی تھا میں فنا کے سمندر کی سرد لہر
آئی اور اپنے ساتھ بہا لے گئی مجھے

پل بھر برس کے پیاسے بدن کی منڈیر پر
میں خاک کی مہک تھا گھٹا لے گئی مجھے

○

کوئی دریچہ، نہ روزن کوئی ہوا کے لیے
مَیں کس مکاں میں ہوں کس جرم کی سزا کے لیے

لکیریں کھینچ گیا ابرِ زرد مٹی میں
حروفِ سبز نمایاں ہوئے صبا کے لیے

ہر ایک سمت رواں ہے فصیلِ آئینہ
بھٹک رہی ہے نظر شکلِ ماسوا کے لیے

عجب طلسمِ سفر ہے کہ راہِ ہستی میں
ترس گیا ہُوں مَیں اپنے نشانِ پا کے لیے

برہنہ کر گئی سورج کی روشنی مجھ کو
اُگا تھا میں شبِ ظلمات کی قبا کے لیے

سسکتا رہتا ہوں الفاظ کے ہیولوں میں
کوئی لباس نہیں پیکرِ صدا کے لیے

صدائیں دیتے ہیں منظر اداس گلیوں کے
میں کھولتا ہوں دریچہ اگر ہوا کے لیے

مِرا وجود دلیلِ عدم ہے دنیا میں
سفر میں رہتا ہوں مَیں قریۂ فنا کے لیے

○

○

گلیاں اُداس، کھڑکیاں چپ، در کھُلے ہوئے
اُکتا گیا ہوں میں تو یہ سب دیکھتے ہوئے

ہاتھوں پہ لکھ کے چومتا رہتا ہوں اُس کا نام
مدت گزر گئی ہے جسے خط لکھے ہوئے

خوشبو و رنگ، آب و ہوا، سازو و خامشی
کیا قافلے ہیں دشتِ خلا میں رُکے ہوئے

ہاتھوں میں لے کے چلتا ہوں آنکھوں کی مشعلیں
ہر سمت ہیں ہواؤں میں چہرے اُگے ہوئے

کچھ پوچھتی ہیں پیڑوں کی سرسبز ٹہنیاں
کچھ کہہ رہے ہیں راہ میں پتے گرے ہوئے

محتاجِ ابر و باد ہوئے اہلِ خاکداں
ہر چند اسی زمین میں تھے دریا چھپے ہوئے

اے ماؤرائے فکر اب آواز دے کہ ہم
خود سے بچھڑ گئے ہیں تجھے ڈھونڈتے ہوئے

○

ناصؔر زیدی

نام ناصر رضا زیدی تخلص ناصؔر۔ آپ ۸ اپریل ۱۹۴۳ء کو مظفر گڑھ (یو۔پی) کے ایک معزز سید زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ قیامِ پاکستان پر آپ پاکستان آ گئے۔ آپ کے والدین نے ماڈل ٹاؤن لاہور میں مستقل سکونت اختیار کی۔

ناصر زیدی نے ابتدائی تعلیم راولپنڈی میں پاکستان گرلز ہائی سکول موہن پورہ میں حاصل کی کچھ عرصہ بعد آپ لاہور اپنے والدین کے پاس چلے آئے۔ لاہور سے آپ نے ۱۹۵۹ء میں ماڈل ہائی سکول ماڈل ٹاؤن سے ایٹرنس کیا اور اسلامیہ کالج میں داخلہ لیا۔ یہاں پروفیسر علم الدین صاحب سالک جیسے متبحر عالم کی جوہر شناس آنکھ نے انہیں اپنی سرپرستی میں لے لیا اور ہر قدم پر ان کی حوصلہ افزائی کر کے ان کے ادبی ذوق کو جلا بخشی۔

اسلامیہ کالج میں آپ دو سال بزمِ عروجِ ادب کے جنرل سیکرٹری رہے۔ "بزمِ عروجِ ادب" کا جنرل سیکرٹری ہونے کے ساتھ ساتھ آپ کالج کی دوسری تمام ادبی سرگرمیوں میں بھی امتیازی حصہ لیتے رہے اور حسنِ کارکردگی کے صلے میں کئی انعامات حاصل کیے۔ ماڈل ہائی سکول ماڈل ٹاؤن میں طالب علمی کے دوران ۱۹۵۴ء میں ان کے ایک عزیز حسرت کاظمی ہندوستان سے پاکستان آئے تو ان سے اُن کا کلام سُن سُن کر ان کے دل میں بھی شعر کہنے کا شوق پیدا ہوا اور آپ نے مشقِ سخن شروع کر دی۔ ۱۹۵۶ء – ۱۹۵۷ء میں وارداتِ حُسن و شباب نے شعر گوئی کا جذبہ پیدا کیا چنانچہ ۱۴ جولائی ۱۹۵۷ء کو غالب کی زمین میں پہلی مکمل غزل کہی۔

سب سے پہلی غزل ماہنامہ "چمن" راولپنڈی میں شائع ہوئی اُس وقت آپ عشرت تخلص کرتے تھے اسلامیہ کالج لاہور میں پروفیسر محمد علم الدین سالک اور پروفیسر خالد بزمی کے کہنے پر یہ تخلص ترک کر دیا۔ ۱۹۵۹ء میں ناصر تخلص رکھ لیا۔ ابھی آپ طالب علم ہی تھے کہ ۱۹۶۰ء میں ہفت روزہ "حمایتِ اسلام" لاہور میں

کالم لکھنا شروع کیا۔ ساتھ ہی ہفت روزہ "آتش" اور ہفت روزہ "آزاد دنیا"، لاہور میں بھی کالم نویسی کرتے رہے۔ ایک سال ماہنامہ "گلِ خنداں" لاہور میں معاون ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کیا۔ اور پھر فروری ۱۹۶۴ء میں ادارہ "شمع" لاہور سے معاون مدیر کی حیثیت سے وابستہ ہو گئے اور ابھی تک آپ وہیں کام کرتے ہیں۔

ناصر زیدی متعدد ادبی انجمنوں کے سیکرٹری رہ چکے ہیں۔ آپ کو نفسیات کے مضمون سے گہری دلچسپی ہے۔ غزل گوئی کی طرف زیادہ رغبت ہے۔ غزلوں کا ایک مجموعہ "رت جگے" زیرِ ترتیب ہے۔

پروفیسر محمد علم الدین سالک کی علمی سرپرستی انہیں برابر حاصل ہے اور ان کی راہنمائی اور محترم پیام صاحب شاہجہانپوری ایڈیٹر "حمایتِ اسلام"، کے مشورے آپ کے مشعلِ راہ ہیں۔

○

کہہ رہی ہے یہ کیا صبا، کچھ سوچ
اے حسینہ! پیکرِ جفا! کچھ سوچ

چند روزہ بہار پر مت جا
گُل کا انجام کیا ہوا کچھ سوچ

یہ حسیں رُت، یہ چاندنی، یہ بہار
ایسے عالم میں تُو نہ جا، کچھ سوچ

کیا ہوئے رہروانِ منزلِ شوق
کیوں ہے سنسان راستا کچھ سوچ

خار جس سے لپٹ کے روتے تھے
آبلہ پا وہ کون تھا، کچھ سوچ

ہم نہ ہوں گے تو تیری محفل میں
کون ہوگا غزل سرا، کچھ سوچ

بپھری لہروں پہ چھوڑ دی کشتی
کیا کیا تُو نے نا خدا، کچھ سوچ

رہبری کا بھرم نہ کھُل جاتے
پا شکستوں کے رہنما! کچھ سوچ

کس کو چاہے تیرے سوا ناصر
کون ہے تجھ سا دوسرا، کچھ سوچ

رات سنسان ہے گلی خاموش
پھر رہا ہے اک اجنبی خاموش

بات دل کی چھپائی لاکھ اُن سے
آنکھ لیکن نہ رہ سکی خاموش

ہجر کی آگ میں جلے چُپ چاپ
زندگی یوں گزار دی خاموش

پوجتا ہوں تجھے خیالوں میں
کر رہا ہوں میں بندگی خاموش

شمعِ محفل کچھ اس طرح چُپ ہے
جیسے جاڑے کی چاندنی خاموش

ہم سے اظہارِ مدعا نہ ہوا
لب ہلے پر زباں رہی خاموش

کوئی ہنگامہ چاہیئے ناصر
کیسے گزرے گی۔ زندگی خاموش

○

وہی چمن ہے وہی جورِ باغباں ہے ابھی
فضائے صحنِ گلستاں دھواں دھواں ہے ابھی

چلے چلو کہ سفر ہے ابھی طویل بہت
نشانِ منزلِ مقصود بے نشاں ہے ابھی

کہاں کے بندِ سلاسل کہاں کے سنگِ گراں
کہ میرا عزمِ جواں میرِ کارواں ہے ابھی

اِسی لئے تو چمکتی ہے برق رہ رہ کر
چمن کے گوشے میں اِک میرا آشیاں ہے ابھی

تم اپنے عہدِ وفا پر نہ رہ سکے قائم
مری وفا کا سفینہ رواں دواں ہے ابھی

نہ مطمئن ہو کہ آنکھوں سے بہہ رہا ہے لہو
مرے ندیم! یہ آغازِ داستاں ہے ابھی

متاعِ جنسِ وفا کی نہ بات کر ناصرؔ!
یہ چیز وہ ہے جو بازار میں گراں ہے ابھی

○

دیارِ شوق میں کوسوں کہیں ہوا بھی نہیں
امس ہے ایسا کہ پتّہ کوئی ہلا بھی نہیں

خفا نہیں ہے مگر اِس ادا کو کیا کہیے
پکارتا ہوں تو وہ مُڑ کے دیکھتا بھی نہیں

یہ کس مقام پہ تنہائی سونپتے ہو مجھے
کہ اب تو ترکِ تمنّا کا حوصلہ بھی نہیں

بڑا گلہ ہے دلِ غم پرست کو تم سے
وہ درد اِس کو دیا ہے جو لا دوا بھی نہیں

کہاں تلاش کریں جز تیرے سکونِ نظر
کہ اِس جہاں میں کوئی تجھ سا دوسرا بھی نہیں

بسا ہوا ہے میرے دِل میں بوئے گل کی طرح
وہ دُور دُور ہے مجھ سے مگر جُدا بھی نہیں

کسے سناؤ گے تم مژدۂ سحر ناصر!
وہ رت جگے ہوئے اب کوئی جاگتا بھی نہیں

○

روحِ احساس ہے تہی دامن	دل ہے یا حسرتوں کا اِک مدفن
پھیلتی جا رہی ہے تاریکی:	شام محسوس کر رہی ہے تھکن
ملتفت جب سے ہے نظر اُن کی	دل کو در پیش ہے نئی اُلجھن
میری یادوں سے گُل بداماں ہے	ایک زہرہ جمال کا آنگن
آدمیّت کہیں نہ ہو رُسوا	زندگی کا بدل رہا ہے چلن
ہر ستارہ مرے مقدر کا	اُن کے ماتھے کی بن گیا ہے شکن
لُٹ چکا ہوں رہِ تمنّا میں	آرزو اب تو چھوڑ دے دامن

کس کو اپنا کہیں کہ اے ناصر
ہر حسیں شخص ہے وفا دشمن

○

جب وہ خیال و خواب کی دنیا میں آ گئے	دل کے سیہ کدے میں دیئے جھلملا گئے
کتنی ہی بار دِل کا نگر لُٹ کے رہ گیا	کتنی ہی بار ہو کے وہ ہم سے خفا گئے
اِس التفاتِ ناز کے قربان جائیے	آئے اور آ کے شمعِ تمنّا جلا گئے
پھر لہلہا اُٹھا ہے گلستانِ آرزو	پھر دِل پہ تیری یاد کے بادل سے چھا گئے
پروانے جل رہے تھے مگر شمع تھی خموش	آخر کو اُٹھ کے ہم تری محفل سے آ گئے
تنہائیوں نے سونپ دیئے مجھ کو رَت جگے	جھپکی جو آنکھ خواب میں آکر جگا گئے

ناصر ہم احتیاطِ تمنّا کے باوجود
اِک حُسنِ فتنہ کار کے دھوکے میں آ گئے

○

○

وہ حسیں ہم سے خفا ہو تو غزل ہوتی ہے
درد سا دل میں اُٹھا ہو تو غزل ہوتی ہے

ہم زباں عشق کی لذت سے شناسا ہو ندیم
ہم سخن اہلِ وفا ہو تو غزل ہوتی ہے

بکھرے بکھرے سے ترے گیسوئے عنبر افشاں
بہکی بہکی سی گھٹا ہو تو غزل ہوتی ہے

اُن کے ہونٹوں پہ تقاضہ ہوں کہ پی لیجے حضور!
سامنے جام دھرا ہو تو غزل ہوتی ہے

ہو اِدھر عشق پہ اک کیف کا عالم طاری
حُسن اُدھر نغمہ سرا ہو تو غزل ہوتی ہے

اپنے ہاتھوں میں ہو دامانِ محبت کا غرور
اُن کی آنکھوں میں حیا ہو تو غزل ہوتی ہے

شاعری ایسی عبادت ہے کہ مے خانے میں
پائے ساقی پہ ادا ہو تو غزل ہوتی ہے

شعر کہنا نہیں آسان غزل کہے، ناصر!
عشق جب شعلہ نما ہو تو غزل ہوتی ہے

○

تھوڑا سا مسکرا کے نگاہیں ملائیے
مجھ کو مری حیات کا مقصد بتائیے

ہم سے بھی کچھ حضور تعلق تھا آپ کا
یوں بے مروتی سے نہ دامن چھڑائیے

مدت ہوئی کہ آپ نے خط تک نہیں لکھا
اس بے رخی کا کوئی سبب تو بتائیے

شاید کسی مقام پہ میں کام آ سکوں
مجھ کو بھی ساتھ لیجئے تنہا نہ جائیے

اپنا ہے کوئی ہوش نہ منزل کی ہے خبر
یہ کون سا مقام ہے کچھ تو بتائیے

اہلِ جفا و جور سے لازم ہے احتیاط
ان مہ رخوں سے دامنِ دل کو بچائیے

گزرے گا اس طرف سے بھی اک دن ہجومِ گل
ہر چند آپ راہ میں کانٹے بچھائیے

انکار صاف صاف نہ اقرار صاف صاف
کس جرم کی سزا ہے ہمیں بھی بتائیے

ناصرؔ اداسیاں تو رہیں گی یونہی مدام
ڈھلنے لگی ہے رات کوئی گیت گائیے

کیپٹن محمد محمود اختر

نام محمد محمود تخلص اختر۔ ۲۷ اکتوبر ۱۹۱۶ء کو پیدا ہوئے۔ آپ کا سلسلہ نسب حضرت ایوب انصاری رض
تا ہے۔ آپ کے والد محترم خان بہادر محمد حسام الدین محکمہ پولیس میں ڈپٹی انسپکٹر جنرل تھے۔ اب پنشن
یں۔ اردو شعر و شاعری سے خاص شغف رکھتے ہیں۔ خود بھی کہنہ مشق شاعر ہیں۔ حسام تخلص کرتے ہیں
ام کاکوروی کے نام سے معروف ہیں۔ کیپٹن اختر کی والدہ الٰہ آباد کی تھیں۔ وہ نہایت منتظم، سلیقہ شعار
زاج اور صوم و صلوٰۃ کی پابند تھیں۔ انہیں بھی شعر و شاعری سے لگاؤ تھا خود بھی شعر کہتی تھیں۔ اُن
ال ۱۹۵۴ء میں بمقام کراچی ہوا۔ اُن کی تعلیم و تربیت کو کیپٹن اختر کے مستقبل کی تشکیل میں بڑا دخل ہے۔
گھر پر اردو فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ پھر انگریزی پڑھنے کے لئے سکول میں داخل کئے گئے۔ مدراس یونیورسٹی
ک اور ایف ایس سی دونوں امتحان درجہ اول میں پاس کئے۔ اس کے بعد ریاضی اور سائنس میں بی ایس
ا لیکن آخری سال میں بعض ناگزیر حالات کی بنا پر کچھ عرصے کے لئے سلسلہ تعلیم منقطع ہو گیا۔ پھر معاشیات
اے کیا اور اس کے بعد ایم اے اور ایم ایڈ کی ڈگریاں حاصل کیں۔ نیز شوقیہ طور پر امتحان منشی فاضل
پاس میں بدرجہ اول کامیاب ہوئے۔ علاوہ بریں لندن کے اداروں چارٹرڈ انسٹی ٹیوٹ آف
یز، کارپوریشن آف سیکرٹریز، انسٹی ٹیوٹ آف کاسٹ اینڈ ورکس اکاؤنٹینٹس، کے امتحانات پاس کئے
ملازمت کا آغاز محکمہ انجمن ہائے امداد باہمی سے ہوا۔ جب ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تو
شنڈ افسر کی حیثیت سے فوج میں چلے گئے جہاں مختلف عہدوں پر جنگی خدمات انجام دیں اور صلے میں تمغے
۔ ۱۹۴۹ء میں فوجی ملازمت سے سبکدوش ہوئے اور متعدد غیر ملکی اداروں میں جو پاکستان میں کاروبار
تھے اکونٹس اور مالیات کے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ اوائل ۱۹۶۳ء میں مغربی پاکستان کے پانی
ں کے ترقیاتی ادارہ موسوم بہ واپڈا میں ملازم ہوئے اور آج کل واپڈا کے محکمہ تعلقات عامہ میں پروجیکٹ

کونسلنٹ کے عہدے پر مامور رہیں۔ جب ہندوستان نے ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کو پاکستان پر اچانک حملہ کیا تو آپ نے اپنی خدمات افواج پاکستان کو پیش کیں۔ انہیں قبول کرتے ہوئے جناب کمانڈر انچیف صاحب نے لکھا ہے کہ "وقت آنے پر آپ کی خدمات سے ضرور استفادہ کیا جائے گا۔"

کیپٹن اختر کی شادی ان کے رشتہ کی خالہ زاد سے ہوئی ہے۔ ان کی والدہ سندیلہ ریو۔ پی کے ایک ممتاز تعلق دار چودھری بنی جہاں کی دختر تھیں اور والد سید شمشاد حسین پنجاب کی ریاست جیند کے رئیس اور علی گڑھ یونیورسٹی کے فارغ التحصیل تھے۔ ریاست حیدرآباد دکن میں محکمہ پولیس میں ملازم ہوئے جہاں ترقی کرتے ہوئے سپرنٹنڈنٹ پولیس کے عہدے تک پہنچ گئے۔ جب ہندوستان نے حیدرآباد پر حملہ کر کے ریاست کو بھارت میں ضم کر لیا تو وہ ہجرت کر کے پاکستان چلے آئے۔ ان کا انتقال ۱۹۵۰ء میں بمقام پشاور ہوا۔ کیپٹن اختر کے دو لڑکے اور تین لڑکیاں ہیں۔

گھر کے ماحول کا اثر تھا کہ آپ صغیر سنی ہی سے اردو ادب اور شعر و شاعری میں دلچسپی لینے لگے۔ کالج میں بزم ادب اردو قائم کی اور اس کے سیکرٹری کے فرائض انجام دئے۔ اس بزم کے صدر و سرپرست پروفیسر آغا حیدر حسن دہلوی تھے جو ملک کے مشہور ادیب اور ایک خاص طرز نگارش کے بانی تھے۔ کیپٹن اختر کی عمر ۱۲ سال تھی جب آپ کو غزل کہنے کے لئے جلیل مانک پوری کا یہ مصرعہ دیا گیا۔

ع بے خبر کچھ تجھے اپنی بھی خبر ہے کہ نہیں

پورا شعر یوں ہے۔

روز ہم تجھ سے تصور میں گلے ملتے ہیں
بے خبر کچھ تجھے اپنی بھی خبر ہے کہ نہیں

ایک مبتدی کے لئے یہ خاصی مشکل زمین تھی تاہم آپ نے گیارہ شعر کی غزل پوری کر لی۔ اس واقعہ نے حوصلہ افزائی کی اب آپ نے اختر تخلص اختیار کیا اور مشق سخن شروع کر دی۔ ابتدا میں آپ کی شاعری صرف غزلوں تک محدود رہی۔ پھر نظمیں بھی لکھنے لگے۔ یہ سلسلہ فوج میں جانے تک قائم رہا۔ بعد ازاں زمانہ جنگ اور فوجی زندگی کی مصروفیات میں شعر گوئی کم ہوتے ہوتے بالکل چھوٹ گئی آپ نے پھر تجدید شوق کی کوشش نہیں کی۔ اکثر شاعروں کی طرح آپ نے بھی اپنا کلام محفوظ نہیں کیا اور وہ دست برد زمانہ کی نذر ہو گیا۔ چند اشعار جو آپ کو یاد تھے آئندہ صفحات میں شائع کئے جا رہے ہیں۔

کیا نرالے ہیں حسن کے انداز خامشی بھی کلام ہوتی ہے

اک نگاہِ غلط انداز اِدھر بھی ساقی کوئی میخوار تہی جام لئے بیٹھا ہے

ہراساں نہ ہو بحرِ امواج میں کہ ڈوبے سفینے اُبھرتے بھی ہیں

بے نور سے چراغ، افسردہ سی بزمِ شوق اک چلے ہیں اہلِ تمنا ترے بغیر

رُوح پرور ہے خاطرِ ناشاد عشق میں وہ مقام آ ہی گیا

خدا جانے یہ کس کی جلوہ گاہِ ناز آئی ہے بہ اندازِ دگر اختر دلِ وحشی دھڑکتا ہے

اب ترے پاس آ کے بھی اے دوست دل کی افسردگی نہیں جاتی

اِک ایسا دور بھی اختر گزرا ہے محبت میں کہ دل روتا رہا آنکھوں کے پیمانے نہیں چھلکے

بہرساں نمائش کے پیرہن میں ہم وہ جو ہیں
مثالِ بوئے گل زینتِ دہِ گلزار رہتے ہیں

رشک آتا ہے دل کو آنکھوں پر
جلوہ یار دیکھنا ہے آج

اعتبارِ دل کو اندیشہ ہے بہکانے سے کیا
دوست داری کو غرض دشمن سے مل جانے سے کیا

جاوداں غم کے بخشنے والے
تیرے اکرام کا حساب نہیں

شوق میں باقی تمیزِ موجہ و ساحل نہیں
مرحبا اے دل کہ ہنگامہ ترا باطل نہیں

آج ہر قلب تجمل گہہِ اندیشہ ہے
آج ہر ساز میں ہے نغمۂ باطل ساقی
ناخدا رہزنِ تدبیر نظر آتا ہے مجھے
وہی کشتی، وہی موجیں، وہی ساحل ساقی
تنگ ہے دل کے لئے مسلکِ دیرینۂ عشق
درد کی مے نہ رہی جام کے قابل ساقی

ترا کام اندیشہ کاری نہیں
خلل آ گیا تیرے ایمان میں
بڑھاتا چلا جا سفینے کو تو
خدا لاج رکھ لے گا طوفان میں

سبطین شاہجہانی

نام محمد سبطین، تخلص سبطین۔ دنیائے ادب پر پورے نام محمد سبطین شاہجہانی سے متعارف ہیں۔ آپ ۳۰ اپریل ۱۹۴۰ء کو موضع ٹھٹھہ ضلع کیمبل پور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے لئے اپنے گاؤں کے پرائمری سکول میں داخل کیا گیا۔ لیکن ان کے والد صاحب اپنی ملازمت کے سلسلے میں لاہور میں سکونت پذیر ہوئے تو سبطین صاحب کو بھی ساتھ لے آئے چنانچہ انہوں نے پرائمری کا امتحان لاہور کنٹونمنٹ بورڈ سکول نمبر ۱ سے پاس کیا اور اسلامیہ کنٹونمنٹ ہائی سکول سے ۱۹۵۸ء میں انٹرنس پاس کیا۔

آپ کی شاعری کی ابتدا ۱۹۵۲ء میں ہوئی اُس وقت آپ آٹھویں جماعت میں پڑھتے تھے آپ نے اُس زمانے میں اپنا کلام بہت سے اساتذہ کو دکھایا مگر تسلی نہ ہوئی۔ اُن دنوں صدر بازار لاہور چھاؤنی میں جناب مسکین چاندپوری صاحب کے فن اور کلام کا بہت دور دورہ تھا سبطین بھی اُن کے حلقۂ تلامذہ میں شریک ہو گئے۔ ان کی شاعری کے ابتدائی مراحل میں مسکین صاحب نے ان کا خوب ساتھ دیا اور بڑی راہنمائی کی۔ مگر وہ اپنی کاروباری اور دیگر گوناگوں مصروفیات کی وجہ سے زیادہ وقت اصلاحِ سخن کے لئے نہیں نکال سکتے تھے۔ اِدھر سبطین صاحب کی طبیعت میں روانی اور شعر کہنے کا ولولہ بہت بلند تھا۔ ناچار آپ نے صوفی حبیب اللہ صاحب حاوی کی طرف رجوع کیا۔ صوفی صاحب کے دستِ شفقت اور اصلاحِ سخن نے چند ہی ماہ میں سبطین صاحب کو فنی لحاظ سے اُس مقام پر لا کھڑا کیا جس کے وہ تہِ دل سے متمنی تھے۔ صوفی صاحب

کے فیضان کا یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے ۔ تگر سبطین دنیائے شعر میں اپنا مقام پیدا کر چکے ہیں ۔

آپ نے مختلف فلمی اور ادبی رسائل میں کام کیا ہے جن میں سے ماہنامہ نیرنگِ خیال، ماہنامہ علم و ادب اور ہفت روزہ حمایتِ اسلام خاص پر قابلِ ذکر ہیں ۔

۱۹۶۰ء میں آپ نے سرکاری ملازمت اختیار کر لی جو اب تک جاری ہے ۔

آپ نے تقریباً ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے ۔ نعت، منقبت، قصیدہ، بچوں کی نظمیں، قطعات، غنائیہ، منظوم کہانیاں، نظم، غزل آپ کی جولانگاہ رہی ہیں ۔

○

پلکوں پہ آنسوؤں نے جلائی ہے بزمِ یاس
شبنم کے موتیوں سے چمکتی ہو جیسے گھاس

اک ذوقِ زندگی ہے تصوّر میں موجزن
اب موت کا ہے خوف نہ ہے دار کا ہراس

یہ سانس میں عجیب سی خوشبو ہے دوستو
رچ بس گئی خیال میں اُن گیسوؤں کی باس

کشتی جو ناخدا کی توجّہ سے ہٹ گئی
دیکھی گئی ہے ڈوبتی ساحل کے آس پاس

اب عقل اُن کو ڈھونڈنے نکلے گی دوستو
گُم ہو گئے جو محفلِ جاناں کے آس پاس

جگمگ خیالِ یار سے ہیں دل کی ظلمتیں
اب جشنِ یار ہے جو فضا تھی اُداس اُداس

ہم کو غمِ حبیب ہے جاں سے عزیز تر
اس کے سوا تو آیا نہیں کوئی غم بھی راس

پاکیزگی نہ ہو تو عبث ہیں حسین بھیس
دل صاف ہو تو ٹھیک ہیں سبطین سب لباس

○

مجھ کو بخشا گیا ہے پیار کا ہوش
عقل میں گُم ہے اختیار کا ہوش

برلبِ دل سہ گا رہا ہے جنوں
اب نہیں نغمۂ بہار کا ہوش

مائلِ بے خودی ہے ہر لحظہ
جلوۂ بزمِ حُسنِ یار کا ہوش

ایسی منزل پہ آ گئی ہے عقل
ہے خبر گل کی اب نہ خار کا ہوش

عشق میں اب ہے جامِ رسوائی
کس کو ہے بادۂ وقار کا ہوش

تازہ دم ذہن میں ہوئیں یادیں
دل میں جاگا ہے تیرے پیار کا ہوش

سرفرازِ جنوں نہیں وہ نہیں
جس کے دل میں ہو خوفِ دار کا ہوش

عقل کھو کر بھی خوب رہتا ہے
مجھ کو سبطین اُن کے پیار کا ہوش

نغمۂ سازِ محبت پہ کھنچا جاتا ہے دل
ہوش جاتے ہیں مرے تو ہوش میں آتا ہے دل

ڈوب کر بحرِ وفا میں جب اُبھر آتا ہے دل
اُن کے فیضانِ نظر پہ دل میں اتراتا ہے دل

آب و آتش کا ہے باہم ربط اُن کے ہجر میں
اشک برساتی ہیں آنکھیں آگ برساتا ہے دل

گلشنِ عقل و خرد سے اِس کو عذرِ اجتناب
عشق کے صحرا میں بے خوف و خطر جاتا ہے دل

ڈھونڈتی پھرتی ہے دانش موت کے مخفی رموز
زندگی کی وسعتوں میں گم ہوا جاتا ہے دل

اُن کی باتوں کے تصدق اُن کی یادوں پر نثار
جسم کے ظلمت کدے میں نور برساتا ہے دل

جب زبان و لب پہ لگ جاتی ہے مُہرِ خامشی
پھر حضورِ حسن نغماتِ جنوں گاتا ہے دل

عقل کی مجلس مِلی سنگین جب بے سوز و ساز
اُن کی بزمِ فکر میں شامل ہوا جاتا ہے دل

جب سے وہ مرے دِل کے گلستاں میں بسا ہے
ہر درد کے غنچے میں بہاروپ کھلا ہے

یہ رمزِ عنایت ہے محبت کی ادا ہے
ہر رنگِ وفا اُن کا بہ عنوانِ جفا ہے

عیزوں نے مجھے دیکھا ہے ادراک سے آگے
کیا کم یہ ترے در کی غلامی کا صلہ ہے

غنچوں کے چٹکنے کی صدا تک نہیں آتی
گلزارِ خیالات کی اب کیسی ہوا ہے

دل تا بہ نظر ایک ہی صورت کے ہیں جلوے
مہتاب میں وہ نور نہ کلیوں میں ضیا ہے

مہکا ہوا ہے مثلِ ختن صحنِ تخیل
کیا عطر فشاں کوچۂ گل وش کی ہوا ہے

دیکھے ہیں بہت طلعت و نیرنگ کے پیکر
سنطبیت کوئی اُن سا نہ ہوگا نہ ہوا ہے

ہجر کے ساز پہ جب سوز رواں رہتا ہے
عالمِ ضبط میں پھر کوئی کہاں رہتا ہے

دِل میں ہے صلِّ علیٰ صلِّ علیٰ سے ٹھنڈک
لب پہ اک موجۂ تسنیم رواں رہتا ہے

آنکھوں میں آگ برستی ہے اب اشکوں کی جگہ
سازِ دل سوز سے اب شعلہ فشاں رہتا ہے

تیرے قدموں کے تصدق تیری یادوں کے نثار
عشق کا ذوق مرے دِل میں جواں رہتا ہے

تجھ سے ہی زیست کے گلشن میں مہکتے ہیں کنول
تجھ سے ہی اس کا گلزار جواں رہتا ہے

اِک تری ذاتِ گرامی ہے بس اب وجہِ سکوں
اِک ترا نام بس اب وردِ زباں رہتا ہے

اللہ اللہ رے یہ حسنِ تصور کا کمال
ہر گھڑی خود یہ مجھے اُن کا گماں رہتا ہے

حُسن کا سامری اب پیشِ نظر ہے سبطین
دِل گرفتارِ طلسماتِ جہاں رہتا ہے

○

رنگا گیا ہوں حب سے محبت کے رنگ میں
رہتا ہوں صبح و شام وفا کی ترنگ میں

اے عالمان بارگہہ مہر دیکھنا
اب عشق بس رہا ہے مرے دل کے جھنگ میں

میں تو صنم پرست ہوں مجھ کو حرم سے کیا
کافر ہوا ہوں عشق طلسمات سنگ میں

ہر چیز ایک نسبت اقدس سے ہے بلند
ارض عرب کا نور ہے شیشے میں سنگ میں

دوزخ کا خوف ہے نہ ہے جنت کی آرزو
کیا بے نیازیاں ہیں تمہارے ملنگ میں

اشکوں سے سازِ رنج و الم میں ہے نغمگی
سوزِ دروں کا فیض ہے نغمات و چنگ میں

وہ آ گئے تو نور بداماں ہے زندگی
ورنہ پھنسی پھنسی دلِ تاریک و تنگ میں

از روئے عشق بت کو سمجھتا ہوں میں حسین
شیشے کی بات کرتا ہوں عنوانِ سنگ میں

سبکتین بے سبب نہ تھی بیتاب آبشار
دیکھا تو ایک بزم تماشا تھی سنگ میں

○

عجیب رنگ کشش تھا مرے گناہوں میں
جو مجھ کو کھینچ کے لائے تری پناہوں میں

خوشا جمال کا جادو خوشا جلال کا رنگ
کوئی بھی حجاب نہیں ہے مری نگاہوں میں

ڈر رہا نہ ملے تیرے سنگِ در سے مجھے
انوکھی بات سہی ساری بارگاہوں میں

وہ سرفرازی و عظمت جو تیرے نام میں ہے
نہ تاجداروں میں دیکھی نہ پائی شاہوں میں

تجلیات کا مرکز ہے اُن کا جسمِ لطیف
ہزار طورِ فروزاں ہیں اُن کی باہوں میں

وہ پچھلی رات کا عالم وہ تیری یاد کا ساز
غضب کی شعلہ فشانی تھی میری آہوں میں

وہ دل میں شیشۂ تصور سے آنے والے ہیں
سجا رہا ہوں میں سطین اشک راہوں میں
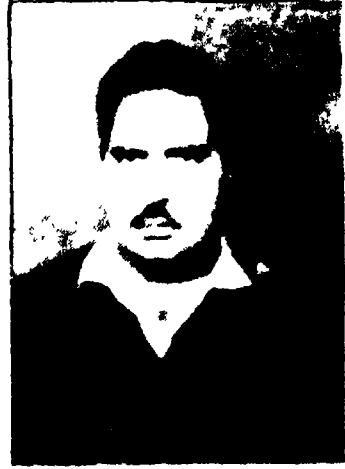
نام محمد صدیق خان ۔ تخلص صدیق ۔ معروف بہ صدیق افغانی ۔ آپ کے والد بزرگوار خان احمد جان خان مرحوم والی افغانستان سردار ایوب خان کے ساتھ نظر بند ہو کر لاہور آئے اور چوبرجی میں رہائش پذیر ہوئے ۔ صدیق صاحب ۹ نومبر ۱۹۳۳ء کو لاہور میں پیدا ہوئے ۔ آپ نے مزنگ ہائی سکول لاہور میں تعلیم حاصل کی اور انٹرنس پاس کیا ۔ اس کے بعد شوقیہ طور پر منشی فاضل کا امتحان پاس کیا ۔ تعلیم کے بعد آپ نے ٹھیکیداری کو ذریعہ معاش بنایا ۔ ہیڈ سلیمانکی ، ہیڈ تونسہ اور دیگر انہار پر تعمیر وغیرہ کا کام کیا ۔ اور اس حیثیت میں اپنی ساکھ قائم کی ۔

ذوقِ شعر گوئی بچپن سے ہی ہے ۔ نظمیں ، غزلیں بکثرت لکھی ہیں ۔ ان دنوں آپ کی طبیعت صرف غزل کی طرف مائل ہے اردو شاعری میں غالب اور اقبال آپ کے پسندیدہ شعرا ہیں ۔

○

دل بتاتا بھی تو کیا سوزِ نہاں کا انداز
کوئی فریاد کی لے ہے نہ فغاں کا انداز

پانو رکھتے ہی دھڑک اٹھتا ہے دل دھرتی کا
تیری رفتار میں ہے موجِ رواں کا انداز

ٹوٹ جائیگا دھواں دھار فضاؤں کا طلسم
شعلۂ گل میں ہے اک برقِ تپاں کا انداز

پھوٹتی ہی نہیں کوئی بھی شفق رنگ کرن
شامِ ظلمت میں کہاں صبحِ جواں کا انداز

کوئی کونپل نہ کوئی پھول، نہ کوئی پتّہ
کتنا غارت گرِ گلشن ہے خزاں کا انداز

جوشِ گردش میں زمیں ہی نہ فلک بن جائے
جانے کس روز بدل جائے جہاں کا انداز

اک تجربہ تھا نشانے کا خطا ہو جانا
ہائے وہ تیرِ نظر اُس پہ کماں کا انداز

کیوں نہ صدیق اندھیرا ہی اندھیرا ہوتا
ہم نے دیکھا ہے یقیں میں بھی گماں کا انداز

○

پتھر ہے میری راہ کا دیوارِ جاں ہنوز
حائل بدن ہے میرے ترے درمیاں ہنوز

کیا کیا ہیں صورتیں مری آنکھوں کے سامنے
شکلوں سے پُر ہے شیشۂ آبِ رواں ہنوز

ملتا نہیں کوئی مجھے باہر کا راستہ
دشتِ طلب ہے میرے لئے چیستاں ہنوز

سنولا گیا سحر کا چمکتا ہوا بدن
چھایا ہوا فضا پہ ہے شب کا دھواں ہنوز

کیونکر نہ روشنی کا سمندر ہو جھیل میں
خورشید ہے کنول کا تجلی فشاں ہنوز

منظر کوئی نظر نہیں آتا بہار کا
شامِ خزاں ہنوز ہے شامِ خزاں ہنوز

میں جل رہا ہوں آپ ہی خود اپنی آگ میں
شعلہ فشاں ہے سانس میں برقِ تپاں ہنوز

صدیق کب نجات ملے گی حیات سے
سر پر اٹھائے پھرتے ہیں بارِ گراں ہنوز

○

تیرگی روکے گی کیسے حسنِ جاناں کی چمک
چھپ نہیں سکتی ترو تازہ گلستاں کی چمک

کرب کا لاوا مرے دل میں پگھلتا ہی رہا
گرم سورج کی طرح ہے داغِ پنہاں کی چمک

خون کی گردش سے تھا رنگین مٹی کا بدن
دم رکا تو بجھ گئی دیوارِ زنداں کی چمک

ریگزاروں میں رواں تھے ہر طرف بحرِ سراب
تشنہ لب سمجھے کہ ہے یہ برق و باراں کی چمک

ہر کوئی تکتا ہے اُس کو ٹکٹکی باندھے ہوئے
کتنی سحر انگیز ہے زلفِ پریشاں کی چمک

اُس رخِ رنگیں سے ہے پھولوں کے چہروں پر نکھار
آنسوؤں سے حسیں ہے آبِ دنداں کی چمک

جل رہے ہیں دھند میں لپٹے ہوئے سرو و سمن
جگنوؤں تک آ گئی شہرِ نگاراں کی چمک

جب سمندر کا لہو جم جائے سطحِ آب پر
پانیوں کو روشنی دیتی ہے طوفاں کی چمک

انتہائے غم میں بھی قائم رہا رنگِ طرب
ماند پڑتی ہی نہیں صبحِ فروزاں کی چمک

فن ہوا چہرہ تو نکھرے اور بھی نقش و نگار
خوبصورت ہے بہت حسنِ پشیماں کی چمک

نقش صدیوں کے بنے لمحوں کی تپتی ریت پر
چھوڑ جاتی ہے نشانِ عمرِ گریزاں کی چمک

دیکھنے والے سراپا حیرتِ تصویر ہیں
آئینہ خانوں میں ہے کس شکلِ حیراں کی چمک

رات بھر جلتے رہے سینے میں داغوں کے چراغ
رات بھر آتی رہی شمعِ شبستاں کی چمک

سوچتے ہی آب حسیں میں ڈھل گیا سورج مکھی
چاندنی میں کھل گئی سروِ چراغاں کی چمک

اب مہک صدیقؔ آتی ہے خزاں سے بھی مجھے
کتنی خوشبو دار تھی جسمِ بہاراں کی چمک

قطعات

اب خیالِ زلفِ جاناں سے بھی گھبراتا ہے دل
سایۂ گیسو نظر آئے تو ڈر جاتا ہے دل
ساحلِ امید کی آسودگی کو چھوڑ کر
غم کے گہرے پانیوں میں ڈوبتا جاتا ہے دل

○

گھر گیا ہوں میں تمنا کی سنہری دھند میں
اب بہک جاتا ہوں جب بھی مجھ کو بہکاتا ہے دل
زخم کے سوکھے شجر کی آبیاری کے لئے
درد کی بپھری ہوئی موجوں سے ٹکراتا ہے دل

○

یہ سمجھ کر بھی کہ رنگوں کا فسوں دائم نہیں
موسمِ گل میں فریبِ رنگ و بو کھاتا ہے دل
دھیان میں سجتا ہے جب پرتو تری تصویر کا
کتنی حیرت سے مجھے آئینہ دکھلاتا ہے دل

○

تیز آندھی ڈھالتی جاتی ہے ٹیلوں کے حصار
دیکھئے کب ریت کی دیوار کو ڈھاتا ہے دل
ڈھونڈتا رہتا ہے بل کھائی ہوئی پگڈنڈیاں
راہ سیدھی ہو تو پھر کب راہ پر آتا ہے دل

○

جب شبِ تاریک میں صدیقؔ مرجاتا ہے چاند
روشنی کے واسطے داغوں کو چمکاتا ہے دل

○

○

غم سے غم خوار، دل سے ہے دلدار — روپ، بہروپ، دھوپ کم آزار
آنکھ، قوسِ قزح، شراب، دھواں — گال، سورج، گلاب، سرخ انار
رنگ، نیرنگ، نغمۂ آہنگ — ضربِ مضراب، کاٹھ کی تلوار
ساز، آواز، راز، بے انداز — دار، دیدار، دیدۂ بے دار
حرف، دھڑکن، صدا، سحر، آہٹ — نطق، جنبش، خروش، وجد، خمار
گھور، گمبھیر، گھن گرج، بادل — شہرِ شب، شور، بھوک، جنس، پکار
کھڑکیاں بند، در کھلے کمرے — ٹوٹتے جسم، سائے پُر اسرار

رات، آکاش، پاش پاش نجوم
فکرِ صدیق، نخلِ سایہ دار

○

مہذب ہوں تو مجھ کو رسم آ جانا ہے دشمن پر — مری تلوار اٹھتی ہی نہیں ابلیس کی گردن پر
پروں کی سرسراہٹ سن کے پیڑوں کے بدن کانپے — کوئی پنچھی جو اڑ کر آ گیا دیوارِ گلشن پر
تری تصویر سے آباد ہے یوں دل کا آئینہ — کہ جیسے نقش ہو صورت کوئی شیشے کے برتن پر
میں ہوں مظلوم، پر ظالم بنا کر پیش کر مجھ کو — لگا دے بدنما سا کوئی دھبہ مرے دامن پر
بجھانے سرد تھا کتنا غموں کی برف کا سایہ — تڑپ کر رہ گئی برقِ تپاں جسموں کے مسکن پر
خدا محفوظ رکھے اب مکاں کی چار دیواری — کہ حملہ زن ہوا ہے شور دروازوں کے روغن پر
اگر فرصت ملے دل کے گلستاں کا نظارہ کر — ہرے زخموں کی تازہ کونپلیں ہیں پورے جوبن پر

نگینے کی طرح ہیں خوبصورت لفظ شعروں میں
زمانہ دنگ ہے صدیق اِس استادیٔ فن پر

○

○

درکار ہے پانی شجرِ صبح و مسا کو
رنگوں کی ضرورت نہیں بے رنگ فضا کو

ملبوس سے نکلے گا چمکتا ہوا سورج
تم کھول کے دیکھو تو ذرا بندِ قبا کو

جل بجھ کے ہوا شہرِ شفق راکھ کا انبار
شعلے کہاں سنتے تھے سمندر کی صدا کو

آ جاتی ہے مہکار بھی پھولوں کے بدن کی
کانٹوں بھرے جنگل میں ہر اک آبلہ پا کو

اڑتے ہوئے لمحوں کے پرندے ہوئے اوجھل
اچھا ہے بھلا دیجیے پیمانِ وفا کو

سائے ہیں کہ ہر دم مرا کرتے ہیں تعاقب
چھیڑا تھا کبھی زلفِ مسلسل کی بلا کو

مفروضوں کے خاکوں میں حقیقت کا بھر رنگ
شانوں سے ہلا سوئی ہوئی شاخِ حنا کو

صدیق گپھاؤں میں مہ و مہر اتارو
آنکھوں کی ضرورت ہے بہت اندھے خلا کو

○

سیپ میں بھی نہ ملا جلوۂ گوہر مجھ کو
لے گیا بانجھ جزیروں میں سمندر مجھ کو

اڑ گئے ہوش جو آئینہ بدن کا دیکھا
دشتِ حیرت سے نکالے کوئی باہر مجھ کو

قیدِ زنداں سے میں نکلا تو ہوا سے تھا سبک
ذات اپنی ہی لگی راہ کا پتھر مجھ کو

اپنی آواز سے بھی سینہ دہل جاتا ہے
اپنے سائے سے بھی لگتا ہے بہت ڈر مجھ کو

حلقہ زن کیوں نہ مرے گرد ہوں صحرا کے ہرن
اچھے لگتے ہیں بہت مرمریں پیکر مجھ کو

راکھ کے ڈھیر تلے آگ دبی ہی رہتی
کر دیا تیز ہواؤں نے اجاگر مجھ کو

تیری مہکی ہوئی زلفوں کا خیال آتا ہے
کیوں نہ خوش رنگ لگے شاخِ صنوبر مجھ کو

صبح صدیق کوئی مست ہوا کا جھونکا
دور جنگل کی طرف لے گیا اکثر مجھ کو

○

○

عالمِ دل میں قیامت کی گھڑی آئی ہوئی
دھوپ کی شدت سے ہر صورت ہے سنولائی ہوئی

شام کو جب جھیل میں سورج کا پتھر گر پڑا
رُت کے سائے بڑھے، پانی میں گہرائی ہوئی

لے اُڑی مشکِ ختن کو جب کبھی پاگل ہوا
میرا بھی چرچا ہوا تیری بھی رسوائی ہوئی

بن گئی شب کی گھنی ظلمت دلیلِ آفتاب
ناشکیبائی سے ہی پیدا شکیبائی ہوئی

کس قدر سُندر تھا پریوں کے جزیروں کی طرح
وہ زمانہ جب مری تجھ سے شناسائی ہوئی

رُت بدلتے ہی بہم اُلجھی شجر کی شاخ شاخ
گل تماشا بن گیا، خوشبو تماشائی ہوئی

ٹوٹتی راتوں میں دونوں کو نہیں حاصل قرار
میری بے چینی ہوئی یا تیری انگڑائی ہوئی

مجھ کو ہے صدیق مرگِ دائمی کی آرزو
ہے طبیعت روز کے جینے سے اُکتائی ہوئی

○

ہٹا کے چھوڑوں گا، پتھر جو میری راہ میں ہے
مرا ہر ایک مخالف مری نگاہ میں ہے

نظر نے تیرے بدن کا محیط چوم لیا
خدا ہی جانتا ہے جو مزا گناہ میں ہے

میں کانپ جاتا ہوں بستر کی سرسراہٹ سے
صدا کا زہر بھرا ناگ خواب گاہ میں ہے

بغیرِ وجہ نہیں سبز رنگ پانی کا
ہرا پہاڑ سمندر کی اِس اتھاہ میں ہے

میں خون دے کے نہ کیوں پرورش کروں اس کو
یہ کائنات کا برگد مری پناہ میں ہے

کنوئیں کے آبِ خنک میں چمک دمک ہے وہی
گرا ہوا کوئی یوسف ضرور چاہ میں ہے

نشاطِ روح کا پرتو غمِ ابد میں ملا
سحر کا رنگ نمایاں شبِ سیاہ میں ہے

کہاں نصیب ہے قربت کے گرم لمحوں میں
وہ اضطرابِ مسلسل جو سردِ آہ میں ہے

سمٹ گئی ہے کچھ اتنی جہاں کی پہنائی
زمیں کا رقبہ بس اِک نقطۂ سیاہ میں ہے

نہ ہار جائے تُو اپنا مقدمہ صدیق
مخالفت کا جنوں تیرے ہر گواہ میں ہے

○

تیز بارش بھی نہ تھی چودہ طبق ڈوب گئے
جھیل کی دُھند میں کتنے ہی اُفق ڈوب گئے

ذہن میں اُبھریں جو یادوں کی سنہری سطریں
کھارے پانی میں کتابوں کے ورق ڈوب گئے

چھا گیا ابر تو آنکھوں میں دھنک بھی نہ رہی
سیلِ گریہ جو بڑھا، شہرِ شفق ڈوب گئے

اہلِ دل پار گئے توڑ کے موجوں کا حصار
خوف سے جن کے بھی چہرے ہوئے فق ڈوب گئے

جب غمِ عشق نے کھائی غمِ دوراں سے شکست
اس قدر ہم کو ہوا اپنا قلق ڈوب گئے

روزنوں سے بھی در آتی نہیں سورج کی کرن
گھر میں وقت کی دیوار کے شق ڈوب گئے

ناخدا آئے خدا بن کے بچانے کے لیے
جن میں غیرت کی ذرا بھی تھی رمق ڈوب گئے

تیرتے ہی رہے صدیق کنول سے الفاظ
وہ مگر جن کے معانی تھے ادق ڈوب گئے

○

سیدہ طیبہ سروش

نام سیدہ طیبہ تخلص سروش، ضلع لائل پور کے ایک دور افتادہ گاؤں میں آج سے اٹھارہ برس قبل پیدا ہوئیں۔ ابتدائی تعلیم گاؤں ہی میں پائی۔ ان کے والد صاحب کو اردو، عربی، فارسی علوم سے بہت دلچسپی ہے اور وہ صاحبِ ذوق ہیں۔ اس لئے سیدہ سروش کو ذوق ادب ورثے میں ملا۔ ابتدائی تعلیم کے دوران غالب اور اقبال کا کلام زیرِ مطالعہ آیا تو شعر ان کی طبیعت کا حصہ بن گیا۔ آپ نے تیرہ سال کی عمر میں پہلی غزل کہی۔ والد محترم کی صحبت کے علاوہ گاؤں میں علمی و ادبی ماحول موجود نہ تھا۔ اس لئے جذبۂ شاعری کچھ زیادہ آگے نہ بڑھ سکا۔ آپ جب اعلیٰ تعلیم کے سلسلہ میں لاہور آئیں تو یہاں کے علمی و ادبی ماحول نے ان کی شعری صلاحیتوں کو پوری شدت سے ابھارا۔ اور آپ خوب شعر کہنے لگیں۔

آپ ہر صنفِ شاعری میں مشقِ سخن کرتی ہیں اور ہر صنف میں کامیاب ہیں۔ منظر کشی، ماحول کی عکاسی، فاقہ کش غریب طبقہ کی زندگی پر تأسف و بے تابی آپ کی نظم کے خصائص ہیں۔

لاہور آنے کے بعد جناب عبدالرشید تبسم ایم اے کی رہنمائی اور توجہ نے ان کے ذوقِ شاعری کو دوبارہ زندگی دی اور ان کی شاعری ایک نئے دور میں داخل ہو گئی اور اُن کا جوہرِ شاعری اور بھی زیادہ صیقل ہو گیا۔

شعر کہنے کے علاوہ آپ افسانے بھی لکھتی ہیں۔ افسانوں میں فضا کی منظر کشی اور کردار کے ارتقا پر زیادہ زور دیتی ہیں۔ آپ کے کلام کی طرح بے شمار افسانے بھی رسائل میں شائع ہو کر قبولیت عامہ کی سند حاصل کر چکے ہیں۔ دنیائے شعر و ادب میں آپ کا مستقبل بہت روشن ہے۔

اردو، فارسی، عربی پر بڑا عبور ہے۔ امسال بی اے کا امتحان دے رہی ہیں۔

○

ہر چند کی خرد نے گریباں کی احتیاط — پر کر سکی نہ غم سے دل و جاں کی احتیاط

اہلِ جنوں پہ تنگ ہے یہ وسعتِ زمیں — وحشت وہ کیا ہو جس کو بیاباں کی احتیاط

مرجھائے پھول نے کہا لازم صبا سے تھی — غنچے کو اپنے خندۂ پنہاں کی احتیاط

ہے آمدِ بہار جو اہلِ قفس سے پھر — صیاد کو ہے روزنِ زنداں کی احتیاط

کرتی ہے اُس سے ناز مگر کھولتی نہیں — ہے کیا صبا کو زلفِ پریشاں کی احتیاط

وہ جو حیا سے نظریں جھکائے ہیں اس میں کچھ — شامل ہے اپنے دشنۂ مژگاں کی احتیاط

ہے برقرار نورِ وفا دل سے اہلِ دل — "لازم ہے اس چراغِ فروزاں کی احتیاط"

جانے کو اُس کے سامنے جائیں مگر سروش
ہو گی نہ دل سے جذبۂ پنہاں کی احتیاط

○

غوغائے کفر سے نہیں دبتی نوائے حق — "گونجی ہے آسماں سے زمیں تک صدائے حق"

سر وہ ہے جو کہ نوکِ سناں پر بلند ہو — جاں وہ جو سب سے ہو گئی پہلے ادائے حق

جس سر زمیں پہ خونِ حمیت گرے وہاں — آباد کوئی ہو نہیں سکتا سوائے حق

جو خود کو فخرِ قیصر و جم جانتے تھے آج — ٹھکرا رہے ہیں سُن کے بھی ہر سُو ندائے حق

وہ صبحِ زندگی ہو کہ شامِ اجل ہو دوست — راضی ہیں ہم اُسی میں ہے جس میں رضائے حق

بے پردہ ہم کو کر نہیں سکتا کبھی عدو — سر پر ہمارے سایہ فگن ہے ردائے حق

کس درجہ خوش نصیب تھے وہ لوگ اے سروش
ہو کر شہید ہو گئے جو آشنائے حق

○

○

"راہیں جدا جدا ہیں تو منزل الگ الگ" — دنیا میں ہر کسی کا ہے حاصل الگ الگ
حیراں ہوں اُس نے کس طرح اِک نگہِ تیز سے — محفل میں سب کو کر دیا گھائل الگ الگ
لیلیٰ کہاں ہے کس میں ہے مجنوں کو کیا خبر — ہر رہگذر پہ رکھے ہیں محمل الگ الگ
اے دوست لاجواب ہے ہر زخم دیکھنا — تاثیرِ زخمِ خنجرِ قاتل الگ الگ
محرومِ التفات تھے اک ہم ہی بزم میں — یوں تو ہے ہر اک پہ وہ مائل الگ الگ
تڑپیں بھی ایک ساتھ نہ صیاد نے ہمیں — پہنائے فصلِ گل میں سلاسل الگ الگ
شیخ و فقیہہ و محتسب اکثر بوقتِ شرب — ہم میکشوں میں ہوتے ہیں شامل الگ الگ

پھر کوئی گل کھلا ہے گلستاں میں اے سروش
ہیں نوحہ خواں قفس میں عنادل الگ الگ

○

یوں جو افسانے گل و بلبل کے دہراتا ہے دل — فصلِ گل آئی ہے، پھر زنداں میں گھبراتا ہے دل
زرد ہوتی شمع کی لو دیکھیے وقتِ سحر — جس طرح بادِ سموم غم میں تھراتا ہے دل
اُن کو بھی پاسِ حیا ہے مجھ کو بھی شرم و وفا — رُو برو ہو کے مگر گستاخ ہو جاتا ہے دل
آئینے کو ملتی ہے زنگار سے جلوہ گری — جس طرح غم کی کثافت سے جلا پاتا ہے دل
باز کیوں رکھتے ہو تم صحرا نوردی سے اِسے — جب کوئی سودا نہ ہو بیمار ہو جاتا ہے دل
اپنی دھڑکن کی صدا کی لوریوں میں جھوم کر — جب شبِ فرقت میں گھبراتا ہے سو جاتا ہے دل
آہ میں اُس دلستاں کی دلبری کو کیا کہوں — جب دھڑکتا ہے اُسی کا نام دہراتا ہے دل
چارہ گر اُس کے بلانے کی کوئی تدبیر کر — "ڈوبتی جاتی ہیں نبضیں بیٹھا جاتا ہے دل"

کیا کہوں ہیں اس کی تنہائی کا عالم اے سروش
اپنی دھڑکن کی صدا بھی سن کے گھبراتا ہے دل

○

○

اپنے دل کو محبت نگار کیا — ہائے کیوں عشق اختیار کیا

تُو تو جاں کا بھی ہو گیا دشمن — ہم نے دل تجھ پہ کیا نثار کیا

اُس نے دانستہ سامنے میرے — غیر کا ذکر بار بار کیا

بوئے گل ساتھ لا کے تُو نے صبا — ہم اسیروں کو بے قرار کیا

زخمِ دل کے طفیل زنداں میں — ہم نے نظارۂ بہار کیا

تُو نے ہر بار عہد شکنی کی — ہم نے ہر بار اعتبار کیا

جذبۂ عشق ہے کہ جس نے سروشؔ
ہم کو مانوسِ رسمِ دار کیا

○

دردِ پیہم ہی شفا ہو جیسے — اک یہی دل کی دوا ہو جیسے

اُن کی ہر بات گلہ ہو جیسے — میرا شکوہ بھی دعا ہو جیسے

دل کو یوں درد ہوا ہے محبوب — یہ بھی اِک تیری ادا ہو جیسے

پر فشاں نکلا ہے پیکاں اُن کا — تنگیٔ دل کا گلہ ہو جیسے

جراَتِ یادِ خدا ہے کس کو — ناخدا یوں ہیں خدا ہو جیسے

بڑھ گئیں وسعتیں روز و شب کی — زندگی پا بہ حنا ہو جیسے

رخصتِ صبحِ مسرت لے سروشؔ
آمدِ شامِ بلا ہو جیسے

○

○

پھر بہاروں میں اڑے تار گریبانوں کے — کب سے تھے آبلہ جُو خار بیابانوں کے

میکشو! جام اٹھاؤ کہ سحر ہے نزدیک — آخری سانس ہیں چھلکے ہوئے پیمانوں کے

رخصتِ فصلِ بہاری کا زمانہ ہے قریب — کھنچ گئے خطِ ورع جام پہ دیوانوں کے

اشک تھمنے ہی نہیں درد کی شب بیت گئی — دیئے بجھنے ہی نہیں غم کے شبستانوں کے

اس گھڑی ٹوٹی ہے بیدادِ اجل بھی اے سروش

ہونٹ سے ہونٹ لگے تھے ابھی پیمانوں کے

○

درد اکثر شبِ تنہائی میں یوں ہوتا ہے — دل میں رہ رہ کے یہ اٹھتا ہے غزل ہوتا ہے

صبح کہتی ہے کہ شبنم ہے گلوں کے آنسو — رات کہتی ہے کہ یہ تاروں کا خوں ہوتا ہے

کیا خبر گل کو، یہ بلبل سے خزاں میں پوچھو — درد پہلو میں دلِ زار کے یوں ہوتا ہے

ظرف لبریز ہو جس کا وہی جھکتا ہے سدا — سر صراحی کا ہی ساغر میں نگوں ہوتا ہے

درد سے آج یوں فارغ ہے مرا دل، جیسے — تو کبھی پاس مرے ہو تو سکوں ہوتا ہے

شروع ہوتا ہے اسی حال میں اکثر اے سروش

[illegible] مجھے حسن کی قربت کا جنوں ہوتا ہے

○

○

حُسن جب پیشِ نظر ہو تو غزل ہوتی ہے
اُن کی قربت میں بسر ہو تو غزل ہوتی ہے

شعلے سے کہتا تھا یوں جلتا ہُوا پروانہ
شمع کے سر پہ سحر ہو تو غزل ہوتی ہے

سامنے آ کے مقابل سے چرا کر پہلو
اُن کا شرما کے گزر ہو تو غزل ہوتی ہے

بعد مدت کے کھلا راز کہ ہر دم دل میں
ضو فشاں غم کا شرر ہو تو غزل ہوتی ہے

کسی کافر کی بس اک جنبشِ مژگاں سے ندیم
زندگی زیر و زبر ہو تو غزل ہوتی ہے

یہ حقیقت ہے بُرا مان نہ لے جانِ وفا
میرا زانو ترا سر ہو تو غزل ہوتی ہے

اجنبی راہوں سے ہم دونوں چلیں اور سروش
ایک ہی سمت سفر ہو تو غزل ہوتی ہے

○

قطعات

کوئی رہ رہ کے صدا دیتا ہے
مجھ کو سپنوں سے جگا دیتا ہے
زخم زنداں میں نگاہوں کو سرِ وش
باغِ جنت کی فضا دیتا ہے

○

غالباً دل میں چشمِ ساقی کا
تیر پیوست ہو کے ٹوٹ گیا
کس نے شوخی سے جھوم کر دیکھا
آئینہ مست ہو کے ٹوٹ گیا

○

تیرا عکسِ جمال کیا کہیئے
مسکراتا ہوا سویرا ہے
میرا دل ہے مزارِ حسرت کا
جس کے چاروں طرف اندھیرا ہے

○

اندھیرے

یہ پائلوں کی بکھیری ہیں کس نے جھنکاریں
مرے خیال کی ویران شاہراہوں میں
یہ کس نے لی ہے شبِ غم میں شوخ انگڑائی
لجا کے ڈوب گیا چاند کس کی باہوں میں
ترے جمال کے جلوے ترے وصال کے دن
سمٹ کے لمحوں میں پھر کھو گئے اندھیروں میں
شبِ وفا سے رہے تیرے تذکرے برسوں
شبِ وفا سے چلی بات پھر سویروں میں
مگر یہ حال ہے اب ناامیدیٔ دل کا
کلامِ شب سے نہ ہے گفتگو سویروں سے
اُجالے آئے گھڑی بھر کو ہو گئے رخصت
کٹی ہے خوب تری یاد کی اندھیروں سے

○

صوفی فقیر محمد صوفی

نام فقیر محمد تخلص صوفی۔ ۴ اکتوبر ۱۹۱۸ء کو لدھیانہ میں پیدا ہوئے۔ قیام پاکستان پر ہجرت کر کے آئے تو نور پور تھل ضلع سرگودھا میں آباد ہو گئے۔ اب نور پور تھل ہی آپ کا وطن ہے۔

آپ کے والد حکیم نبی بخش مرحوم ایک معروف اور بلند پایہ طبیب تھے۔ ساتھ ہی وہ روشن دل اور روشن دماغ اہلِ تصوف بزرگ تھے۔ صوفی فقیر محمد نے طبابت، تصوف اور روشن خیالی ورثہ میں پائی ہے۔

صوفی فقیر محمد کی تعلیم کسی سکول یا کالج کی مرہونِ منت نہیں۔ آپ نے گھر پر ہی اردو، ہندی، فارسی کی تعلیم پائی اور ان میں کمال حاصل کیا۔ اس کے لئے آپ نے کئی اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ خاصا عرصہ ادب کے مختلف شعبوں کی چھان بین اور ریسرچ کی۔ بھگتی تحریک، سکھ مت کی تعلیمات کا دقیق مطالعہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ سکھ دھرم، اسلام کے بہت قریب ہے۔ آپ کے اس خیال کو سکھوں کے سنجیدہ طبقہ نے بھی بہت پسند کیا اور انہوں نے متحدہ ہندوستان کے مختلف مقامات پر بلا کر صوفی صاحب سے تقاریر کرائیں اور ان تقاریر کو بہت سراہا۔

فنِ شعر میں آپ استادی شاگردی کے قائل ہیں لیکن جہاں تک آپ کی اپنی شاعری کا تعلق ہے اس کے فنی پہلو کی تکمیل آپ نے علمِ عروض اور صنائع بدائع کی کتب سے کی ہے۔

آپ کئی سال سے انجمن ترقی ادب ماڈل ٹاؤن لاہور کے ممبر ہیں اور اس کی نشستوں میں شرکت کے لئے شدتِ شوق آپ کو سرگودھا سے لاہور اکثر کھینچ لاتی ہے۔ آپ اپنے موجودہ دورِ شاعری کو محترم عبدالرشید صاحب تبسم کے فیضانِ نظر کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔

○

کس ستمگر نے بگاڑی ہے یہ گھر کی صورت　　نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت

کاش پیدا ہو دعاؤں میں اثر کی صورت　　ڈھونڈ پاؤں غمِ دوراں سے مفر کی صورت

غوطہ زن ہو کے جو لے مول خطر کی صورت　　دیکھے صوفی وہ بلا خوف گہر کی صورت

بے خطر عشق رہِ دار و رسن سے گزرا　　عقل ہر گام پہ تکتی تھی سفر کی صورت

شمع جل بجھتی ہے جل مرتے ہیں پروانے بھی　　کہ نظر آئے کسی طرح سحر کی صورت

خیر کا کام نہیں نام نہیں نیکی کا　　شر کی صورت سے عبارت ہے بشر کی صورت

تیرے اوصاف کا مظہر بھی کئی بار ہوا
کس کی صورت ہے الٰہی یہ بشر کی صورت

○

لکھتا ہوں غزل شاذ اٹھاتا ہوں قلم شاذ　　میں عشق کی راہوں میں بڑھاتا ہوں قدم شاذ

کرتا ہے مری جاں پہ اب مشقِ ستم شاذ　　ہوتا ہے مرے حال پہ اُس بت کا کرم شاذ

بے درد کو ہمدرد بنا لیتا ہے غم شاذ　　صیاد کی آنکھوں میں نظر آتا ہے غم شاذ

ظالم سہی جاہل سہی انسان ہیں آخر　　اس لفظ کی تفسیر بھی ہو جاتے ہیں ہم شاذ

زاہد نے مقام اپنا بنایا ہے بہت دور　　ظالم کے شب و روز کا کھلتا ہے بھرم شاذ

انسان کی فطرت میں ہے بے نام سی مستی　　یہ کیف بہرکیف رہے ہونے دو کم شاذ

میں زہد کی خشکی کو مٹا لیتا ہوں مے سے
صوفی بھی ہوں رندوں کا بھی بھر لیتا ہوں دم شاذ

○

○

میکدۂ نظر سے پی، بادہ و جام سے گزر — مرغِ اسیرِ زلف ہو، دانہ و دام سے گزر
جنسِ خلوصِ دل بیار تن بسپار و جاں سپار — روکھے سلام سے گزر، پھیکے پیام سے گزر
جینے کا ذوق ہے اگر آ تو جئے بغیر جی — پینے کا شوق ہے اگر شیشہ و جام سے گزر
غم نہ ہو آرزو نہ ہو رہروِ عشق تُو نہ ہو — ایسی حیات سے گزر ایسے دوام سے گزر
عشق کو لا بروئے کار دل کی زباں کر اختیار — ترک نہیں قیل و قال میں حرف و کلام سے گزر
قولِ سدید قال ہو قال بحسبِ حال ہو — اپنی خبر نہ پا سکے ایسے مقام سے گزر

صوفی نماز کر ادا دل کو جھکا سجود میں
یعنی رکوع سے گزر جبریِ قیام سے گزر

○

جب کوئی لیتا ہے میرے سامنے نامِ فراق — یاد آ جاتی ہے مجھ کو شامتِ شامِ فراق
جو یہ کہتے تھے بچھڑ جائیں گے تو مر جائیں گے — ہو گئی ان کو گوارا تلخیٔ جامِ فراق
کتنی خاموشی سے گزرے تیز رو ایامِ وصل — ایک ہنگامہ بپا پایا بہ ہنگامِ فراق
صبحدم یہ اوس کے موتی کہاں سے آ گئے — میں نے کچھ آنسو بہائے تھے سرِ شامِ فراق
سرخ سی اک روشنی شب کی سیاہی میں رہے — "جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق"

صوفی جدا شد از نگاہِ جانفزا
بحق تسلیم کرو آخر سرِ شامِ فراق

○

○

ستم آسماں کے اٹھائیں کہاں تک — کہ حرفِ شکایت نہ لائیں زباں تک

کس انداز سے نذر کی ہم نے جاں تک — کبھی حرفِ مطلب نہ لائے زباں تک

تغافل تغافل میں تم لے کے جاں تک — فراموش کر دو مری داستاں تک

تری دوستی بھی عجب رنگ لائی — عدو بن گئے مہرباں مہرباں تک

تم اس دور کی حالتیں مجھ سے پوچھو — قفس بن گیا ہے مرا آشیاں تک

فسانے سُنے تم نے دیر و حرم کے — حقیقت رہی درمیاں درمیاں تک

نہ آپے سے باہر ہو صوفی خدا را
غمِ دل بیاں کر غزل کی زباں تک

○

چشمِ بینا سے ہے ظاہر حسنِ پنہاں کی چمک — چشمِ بینا میں ہے کس کے رُوئے تاباں کی چمک

میری نظروں سے ہے پھیلی حسنِ جاناں کی چمک — میری نظروں میں سمٹ آئی بہاراں کی چمک

خونِ گل سے تیز ہے خاکِ گلستاں کی چمک — شہریاروں نے بڑھائی شہرِ خوباں کی چمک

میری نظروں میں نہیں جچتے یہ روشن قمقمے — میں نے دیکھی ہے چراغِ زیرِ داماں کی چمک

میری آنکھوں کو چمکنے دو چراغاں کی ہو خیر — میری آنکھوں کی چمک سے ہے چراغاں کی چمک

خلوتوں کو ترک کر کے جلوتوں میں آگیا
بھا گئی صوفی کو آخر رنگِ دوراں کی چمک

○

○

دل کی کیا حالت کہوں جب جوش میں آتا ہے دل / عقل و ہوش و مصلحت ہر شے پہ چھا جاتا ہے دل

یاد آجاتی ہے اِک تو سو سو بل کھاتا ہے دل / خود تڑپتا ہے مجھے بھی پہروں تڑپاتا ہے دل

آپ آجائیں کہ جان آجائے میرے شعر میں / ان دِنوں کچھ شاعری کا شوق فرماتا ہے دل

دِل نہ ہو سینے میں تو بیکار ہے سر میں دماغ / سوچتی رہتی ہے عقل اور کام کر جاتا ہے دل

ٹوٹتی جاتی ہے سانس آج آپ کے بیمار کی / ڈوبتی جاتی ہیں نبضیں بیٹھتا جاتا ہے دِل

دِل نے صوفی کر دیا ہے کتنے ہی چھوٹوں کو بڑا
وہ خدا بن جاتا ہے جس بُت سے لگ جاتا ہے دِل

○

جی میں ہے لاؤں غزل میں تُند خُو خُوباں کا نام / لوں خدا کا نام لے کر اس بُتِ ناداں کا نام

عقل نے تسلیم کر لی عشق کی بالا تری / ہو گیا دانائے راز آخر دلِ ناداں کا نام

کس کی خوش فہمی نے یارانِ طریقت دیکھئے / رکھ دیا چشمِ بصیرت دیدۂ حیراں کا نام

تیرے غم کے گرد سارے غم اکٹھے ہو گئے / کیوں غمِ جاناں نہ رکھ دوں میں غمِ دوراں کا نام

کچھ گھروں والے مجھے خیرات دینے آ گئے / پڑ گیا بے خانماں مجھ سوختہ ساماں کا نام

کہکشاں، جنّت، ارم، فردوس، کعبہ، عرشِ دِل / کیا رکھوں میں کیا نہ رکھوں کوچۂ جاناں کا نام

سادگی ہے خود فریبی ہے کہ صوفی طنز ہے
رکھ لیا ہے آشیانہ گوشۂ زنداں کا نام

○

○

لیتا ہوں اس کے نام سے گو میں خدا کا نام
میری زباں پہ اب بھی ہے اس بے وفا کا نام

لانا ہو منع لب پہ جہاں مدّعا کا نام
کیا لوں خدا کا نام میں کیا لوں دعا کا نام

میرا مرض بھی آپ ہیں میری دوا بھی آپ
کیوں چارہ گر کا نام لوں کیوں لوں دعا کا نام

ساحل بعید، کشتی شکستہ، شبِ سیاہ
اب میں خدا کا نام لوں یا ناخدا کا نام

لوگوں نے جانے کیسے کہاں سے سُنا کیا
میں نے لیا ہے کس سے کسی کی جفا کا نام

بے نام سی اداؤں سے لُوٹا دیارِ دل
رکھوں ادا طراز کی کس کس ادا کا نام

صوفی تمام عمر گزاری گناہ میں
چھوڑ اب بتوں کی بندگی تُو لے خدا کا نام

○

کون جانے شبِ ہجراں کی سحر ہو کہ نہ ہو
اور سحر ہو تو انہیں میری خبر ہو کہ نہ ہو

اپنے آغاز کی انساں کو خبر ہو کہ نہ ہو
اپنے انجام پر غافل کی نظر ہو کہ نہ ہو

خود سلامت کہیں یہ خاک بسر ہو کہ نہ ہو
حبیب قیامت ہو۔ یا نوعِ بشر ہو کہ نہ ہو

حضرتِ خضر ہمیں کچھ تو بتاتے جائیں
پھر کبھی آپ کا اِس رہ سے گذر ہو کہ نہ ہو

اک زمانہ ترے اشعار پہ سر دُھنتا ہے
اُن پہ صوفی تری باتوں کا اثر ہو کہ نہ ہو

○

رحمٰن رضوانی ایم ۔ اے

نام ابونصر سید عبدالرحمٰن رضوانی جو مختصر ہوتے ہوتے اب صرف رضوانی رہ گیا ہے ۔ سید یزدانی جالندھری کے چھوٹے بھائی ۹ اپریل ۱۹۳۵ء کو بمقام منٹگمری پیدا ہوئے ۔ ابتدائی تعلیم سے لے کر بی اے تک یہیں تعلیم حاصل کی ۔ ۱۹۵۰ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے (عمرانیات) پاس کیا اور یونیورسٹی کے شعبہ تحقیق عمرانیات سے وابستہ ہو گئے ۔ ۱۹۶۳ء میں زرعی یونیورسٹی لائل پور نے مزید تعلیم کے لئے امریکہ بھیجا جہاں کارنل یونیورسٹی اِتھاکا سے دیہی عمرانیات میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی اور آج کل زرعی یونیورسٹی لائل پور کے شعبہ دیہی عمرانیات سے منسلک ہیں ۔

شعر و ادب سے تعلق ایک طرح سے خاندانی ورثہ کے طور پر پایا ۔ اپنے برادرِ بزرگ یزدانی جالندھری سے بیحد متاثر ہیں ۔ پہلی غزل ماہنامہ "بیسویں صدی" میں شائع ہوئی جبکہ یہ ابھی میٹرک میں پڑھتے تھے ۔ گیت، نظم، قطعہ، غزل ہر صنفِ سخن میں مشق جاری ہے ۔ چند افسانے بھی لکھے ۔ لیکن شاعری اور اس میں بھی غزل اِن کی محبوب ترین صنفِ سخن ہے ۔

بہت کم گو اور خاموشی پسند واقع ہوئے ہیں ۔ دوست بنانے میں بہت محتاط ہیں بلکہ اس وادی میں ڈرتے ڈرتے قدم رکھتے ہیں ۔ لیکن جب کسی کو دوست بنا لیتے ہیں تو پھر دوستی پر سب کچھ لٹا دینا حاصلِ زندگی سمجھتے ہیں ۔

○

گل گل کی زباں پر ہے بجورِ خار کی بحث — نہ چھیڑیں اہلِ گلستاں ابھی بہار کی بحث

ابھی تو اپنے ہی دل پر کچھ اختیار نہیں — ابھی نہ مجھ سے کرو جبر و اختیار کی بحث

عرق عرق ہوئی جام و سبو کی پیشانی — جو چھڑ گئی کہیں چشمِ ستارہ بار کی بحث

جنابِ شیخ بھی کوثر کا ذکر بھول گئے — جو میکدے میں چھڑی جامِ زرنگار کی بحث

اُڑا ہے رنگ، پریشاں ہے ہر طرف خوشبو — زبانِ خار نے چھیڑی نہ ہو بہار کی بحث

کبھی ملے جو ہمیں محتسب سرِ راہے — یہ آرزو ہے کہ چھیڑیں گے حسنِ یار کی بحث

یہ کس کے پاؤں کی آہٹ ہے، کون آیا ہے — رہی ہے دل سے بھی چشمِ انتظار کی بحث

کسی طرح تو کٹے شامِ ہجر، رضوانی
کریں گے چاند ستاروں سے حسنِ یار کی بحث

○

چاکِ دل، چاکِ جگر، چاکِ گریباں کا مزاج — کس نے جانا ہے کسی حالِ پریشاں کا مزاج

تابشِ عکسِ حسیں روز دکھاتا ہے اِسے — آئینہ جانتا ہے دیدۂ حیراں کا مزاج

وہی خاصیتِ نشہ ہے وہی رنگِ خمار — کیفِ صہبا ہے کہ اُس چشمِ غزلخواں کا مزاج

منتِ شانہ کے باوصف، مقدر کی طرح — ہم سے برہم ہی رہا زلفِ پریشاں کا مزاج

آشیانے بھی جلے، برق بھی ٹوٹی لیکن — ایک ہی ڈھب پہ رہا اہلِ گلستاں کا مزاج

چند اُلجھے ہوئے تاروں میں ملے گا تم کو — میرے دامن کا مرے چاکِ گریباں کا مزاج

نگہِ شوق کو بیتابِ تجلی پا کر — عرش پر کیوں نہ رہے جلوۂ جاناں کا مزاج

نشہ مقدار پہ موقوف نہیں رضوانی
لوگ سمجھے ہی نہیں محفلِ رنداں کا مزاج

○

○

ہم رہے جس کی یاد میں برباد
بھول کر بھی نہ آئے اُس کو یاد

اے غمِ عشق تیری عمر دراز
تُو نے ہر غم سے کر دیا آزاد

اب رگوں میں کہاں لہو باقی
نیش زن کیوں ہے نشترِ فصّاد

توڑ دی ہے جنوں نے ہر زنجیر
دم گُسستہ ہے صنعتِ حدّاد

دل کو محبوب ہر ادا اُن کی
وہ نگاہِ کرم ہو یا بیداد

آپ بھی خوب شے ہیں رضوانی
ابھی دل شاد اور ابھی ناشاد

○

اے کاش یہ حیات بھی میرا نصیب ہو
یادِ حبیب ہو کبھی ذکرِ حبیب ہو

جو لطف بُعد میں ہے وہ قربت میں ہے کہاں
تُو دل میں آ نہ میری نظر کے قریب ہو

ہو مندمل جو زخمِ محبت تو کس طرح
جب مہوشوں کے شہر میں قاتل طبیب ہو

میں اُس قدر رہی اپنے دل و جاں سے دُور ہوں
تم جس قدر رہے دل و جاں کے قریب ہو

اے دوست! مانگ بارگہِ عشق سے وہ درد
جس کا ہو کچھ علاج نہ جس کا طبیب ہو

دن مسجدوں میں کٹتا ہے اور میکدے میں رات
اے شیخ! تم بھی آدمی کتنے عجیب ہو

رضوانی! اپنے بخت پہ مجھ کو نہ کیوں ہو ناز
سایہ جو اُس کی زلف کا مجھ کو نصیب ہو

○

○

کر گئے ہم کو تم ہی جب تنہا   زیست کٹتی ہے بے طرب تنہا

یہ فضائیں، یہ رقصِ ابرِ بہار   ہم ہیں ایسے میں اُف غضب تنہا

ایک ایک کر کے سب چراغ بجھے   بزم میں رہ گئے ہم اب تنہا

کھو گئی اُڑ کے خاکِ پروانہ   شمع تا صبح روئے اب تنہا

لاکھ مشکل تھیں پیار کی راہیں   ہم نے طے کی ہیں سب کی سب تنہا

پوچھئے ہم سے سوزِ غم کے مزے   ہم نے کاٹے ہیں روز و شب تنہا

گو رگِ جاں سے بھی قریب تھے وہ   ہم رہے یونہی بے سبب تنہا

وہ تصور میں ساتھ ہوتے ہیں
ہم کو دیکھا ہے کس نے، کب تنہا

○

پیارے پیارے سے کچھ لوگ   دے جاتے ہیں کیا کیا روگ

پیار کا نغمہ، پیار کا گیت   دل کا ماتم، دل کا سوگ

دل والوں کی راہوں میں   ایک سے ایک نرالا روگ

دھن والوں کی دنیا میں   کتنے بے بس ہیں ہم لوگ

وہ انجان ہے سب کے لئے   اپنایا ہے دل نے جوگ

جیون بھر ہے غم کا ساتھ   قسمت کا یہ لکھا بھوگ

راہِ وفا میں رضوانی
رہ گئے کیسے کیسے لوگ

○

○

حسرت ہے، آرزوئیں ہیں اور ہم ہیں دوستو
اِس بزم میں اکیلے کہاں ہم ہیں دوستو

جانے نگاہِ شوق نے کیا کہہ دیا اُنہیں
کچھ کل سے بڑھ کے آج وہ برہم ہیں دوستو

کٹتے ہیں اس طرح سے شب و روز اِن دنوں
اک بے وفا کی یاد ہے اور ہم ہیں دوستو

بزمِ جہاں سے روٹھ کے یہ کون اُٹھ چلا
کیوں بُت بھی محوِ نالہ و ماتم ہیں دوستو

دل کے دیئے جلاؤ کہ کچھ کم ہو تیرگی
اُمید کے چراغ تو مدھم ہیں دوستو

عشق و جنوں کے مدعی یوں تو ہیں سینکڑوں
دیوانے جیسے ہم ہیں بہت کم ہیں دوستو

○

جانیں کیا رکنا اور دم لینا
منزلوں منزلوں کے ہم راہی

ہم بساطِ نشاط کیا جانیں
عمر بھر جب رہے ہوں غم راہی

منزلیں خود سمٹ کے آئیں گی
ہوں گے جب آپ اور ہم راہی

جان کر سنگِ راہ، ایک نظر
یہ بھی ہو گا بڑا کرم راہی

حسرتیں بے شمار ہیں دل میں
اور باقی، دو چار دم راہی

ہم نے دل سے فقط دعا ہی دی
تم نے ڈھائے فقط ستم راہی

کتنے ویران راستوں پہ بھی
ہم نے جانا کہ تم ہو "ہم راہی"

○

○

یہ قربتیں یہ فاصلے
یہ زندگی کے قافلے
نصیب سے جھگڑ جھگڑ
بچھڑ بچھڑ کے ہم ملے
جفائیں اور بڑھ گئیں
ملے وفاؤں کے صلے
فسانے کیسے بن گئے
ابھی تو دل میں تھے گلے
اٹھی نگاہِ مہرباں
تو چاک چاک دل سلے
بہارِ دل بجھی بجھی
ہیں داغ دل کھلے کھلے
اُلجھ پڑے نصیب سے
ہمارے دیکھ! حوصلے

○

دل میں بڑھتے ہوئے اوہام سے ڈر لگتا ہے
دیر و کعبہ کے در و بام سے ڈر لگتا ہے
چلو اس وقت کے پُر پیچ جھمیلوں پرسے
رُخ بدلتی سحر و شام سے ڈر لگتا ہے
ایسا پایا ہے سکوں تلخیٔ ایام میں دوست
موسمِ گل، قدح و جام سے ڈر لگتا ہے
میں نے بکتی ہوئی ناموسِ وفا دیکھی ہے
اب تو ہر چیز کے ہر نام سے ڈر لگتا ہے
ظلم کے آہنی دروازہ سے ٹکراتے ہوئے
تُند جذبات کے اقدام سے ڈر لگتا ہے
زندگی کو فقط اِک کھیل سمجھنے والو!
زندگی کے مجھے انجام سے ڈر لگتا ہے

○

یہ کیسا فسانہ ہے، کیا داستاں ہے — سبک تر ہیں الفاظ، مطلب گراں ہے
الگ ساری دنیا سے دل کا جہاں ہے — نرالا ہے عالم، انوکھا سماں ہے
خیالوں کے اصنام کو پوجتا ہوں — حرم کا تصوّر کہاں تھا کہاں ہے
تغیّر پہ موقوف ہے بزمِ ہستی — خوشی مستقل ہے نہ غم جاوداں ہے
مرا چاند اب تک نظر سے ہے اوجھل — مری آنکھ اب تک ستارہ فشاں ہے
نہ جانے مجھے برق کیوں گھورتی ہے — مرا آشیاں اب غمِ آشیاں ہے
مجھے روشنی کا یقیں مت دلاؤ! — نگاہوں کی حد تک دھواں ہی دھواں ہے

کبھی پوچھ رضوانیؔ غم زدہ سے
محبت کا ذرّہ بھی کوہِ گراں ہے

یوں دیکھئے تو میرے سوا کوئی بھی نہیں — گر سوچیئے تو ایک جہاں میرے ساتھ ہے
ماضی کی تند و تیز ہواؤں کے ہم رکاب — یادوں کا ایک ایک نشاں میرے ساتھ ہے
شہروں میں لوگ اور بیاباں صحراؤں میں سراب — اک کائناتِ وہم و گماں میرے ساتھ ہے
جب پھول سے مہک اُڑی بدنام ہو گئی — میری وفا کا رازِ نہاں میرے ساتھ ہے
ترتیبِ آشیاں کا کروں حوصلہ میں کیا — میرا نصیب، برقِ تپاں میرے ساتھ ہے
بستی کے لوگ میری مصیبت نہ سُن سکے — جنگل کا پھول نالہ کناں میرے ساتھ ہے
ایماں بھی ہے مرے لئے سرمایۂ حیات — اوہام کا بھی ایک جہاں میرے ساتھ ہے

تھا کس کو حوصلہ کہ مرا ہمسفر بنے
رضوانیؔ ایک تنگِ جہاں میرے ساتھ ہے

قطعات

دُور بربط کی لے ہے تھرّائی چاندنی رات اور تنہائی
تم سے ملنے کی آرزو میں ندیم وقت نے پھر سے لی ہے انگڑائی

○

ٹالتا ہوں مگر نہیں ٹلتا وقت تکلیف کا بہانوں سے
مانگتا ہوں خوشی کے کچھ لمحے آپ ایسے ہی مہربانوں سے

○

عشقِ زلفِ بتاں بھی بھول گئے دردِ زخمِ نہاں بھی بھول گئے
ہم غمِ روزگار میں اے دوست اپنا نام و نشاں بھی بھول گئے

○

چاند تاروں میں یہ حسیں شوخی آپ کے دم قدم سے آتی ہے
دیکھ لیتا ہوں آپ کو جس دم زلفِ گیتی سنور سی جاتی ہے

○

بربطِ زیست کے شکستہ تار ایسے اُلجھے کہ گیت گا نہ سکے
گردشِ زیست کی ہے ایسی چال
ایک مدّت سے مسکرا نہ سکے

زبیر کنجاہی

نام محمد صادق۔ تخلص زبیر۔ معروف بہ زبیر کنجاہی۔ ۲۱ جون ۱۹۳۴ء کو کنجاہ ضلع گجرات کے مردم خیز قصبہ میں پیدا ہوئے۔ آپ معاشی طور پر ایک متوسط گھرانے کے چشم و چراغ ہیں۔ آپ کے دادا مرحوم نے زندگی کا زیادہ حصہ بغداد میں بسر کیا تھا۔ اس لئے وہ وطن واپس آئے تو بابا بغدادی کے نام سے مشہور ہوگئے۔ اس خانوادہ میں زبیر پہلے شاعر اور ادیب ہیں۔

آپ نے ابتدائی تعلیم ڈی بی مڈل سکول ساروکی چیمہ ضلع گوجرانوالہ میں حاصل کی۔ انٹرنس کا امتحان سولہ سال کی عمر میں اسلامیہ ہائی سکول کنجاہ سے پاس کیا اور عملی زندگی کی کشمکش نے آپ کو اپنی طرف کھینچ لیا۔

زبیر کنجاہی کو شعر و ادب کا ذوق قدرت نے فطرتاً ودلیعت کیا اس پر اسلامیہ ہائی کنجاہ کے بعض اساتذہ نے جو خود ادیب اور شاعر تھے آپ کی ذہنی تربیت کی طرف خاص توجہ دے کر آپ کے ذوق کو اور بھی زیادہ اُجاگر کر دیا۔ آپ کی ادبی زندگی کا آغاز ایک کہانی سے ہوا جو سکول کے میگزین "ادیب" میں شائع ہوئی۔

آپ کا سب سے پہلا افسانہ ۱۹۵۹ء میں ماہنامہ "نیرنگِ خیال" میں شائع ہوا۔ پھر بعض تحقیقاتی مقالے بھی اسی رسالے میں چھپے۔ آپ کی پہلی غزل ماہنامہ "مشاعرۂ جدید" لکھنؤ کے شمارہ جنوری ۱۹۶۱ء میں شائع ہوئی۔

۱۹۶۰ء سے آپ اپنا کلام مولانا افقر موہانی کو دکھانے لگے اور اصلاحِ سخن کا یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ زبیر کو افقر صاحب سے بڑی عقیدت وارادت ہے اور شعر میں انہیں اپنا امام سمجھتے ہیں۔ افقر صاحب سے اپنی عقیدت کے تحت آپ نے اپریل ۱۹۶۲ء میں راولپنڈی میں افقر اکیڈیمی کے نام سے ایک مکتبہ قائم کیا جس کا اولین مقصد افقر صاحب کے کلام و افکار کی وسیع نشر و اشاعت ہے۔ اس کے علاوہ

دوسری ادبی مطبوعات بھی اس اکیڈیمی کے پروگرام میں شامل ہیں۔ زہیر کنجاہی اس اکیڈیمی کے ڈائرکٹر ہیں۔ یہ اکیڈیمی اس وقت تک تین کتابیں شائع کر چکی ہے جن میں غزلیات کا مجموعہ "فکر و خیال" بھی شامل ہے۔ اسے زہیر نے خود ترتیب دیا۔ مزید پانچ کتب طباعت کے لئے تیار ہو چکی ہیں (۱) ارمغان۔ مجموعہ غزلیاتِ افقر (۲) آئینہ افقر۔ افقر کے خطوط (۳) تلامذۂ افقر (۴) نیلی آنکھیں، زہیر کا تصنیف کردہ ناول (۵) محشرستانِ ادب، بیسویں صدی کے شعرائے لکھنؤ کا محاکمہ از قلم زہیر۔ ان کے علاوہ پانچ کتابیں بیک وقت زیرِ ترتیب ہیں۔ (۱) سوانح افقر موہانی (۲) سوانح ڈاکٹر سیّد عبداللہ (۳) تذکرۂ شعرائے کنجاہ (۴) ہماری اربابِ شعر و ادب (۵) پنجاب کی اردو صحافت۔

مختصر یہ کہ ادبی تحقیقات کے لحاظ سے زہیر کنجاہی اپنی ذات میں خود ایک انجمن ہیں۔ مندرجہ ذیل زندہ شخصیات کے اندازِ زندگی اور افکار و نگارشات نے زہیر کنجاہی کی زندگی پر گہرا اثر ڈالا ہے۔

مولانا امداد صابری، ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، عبدالرشید تبسم ایم اے، ڈاکٹر سلام سندیلوی۔ رفتگان میں سے آپ مومن کو غزل کا بادشاہ مانتے ہیں۔ آپ کے زندہ پسندیدہ شعرا و ادبا حسبِ ذیل ہیں۔

سیّد وقار عظیم، قتیل شفائی، یزدانی جالندھری، شکیل بدایونی، راجندر سنگھ بیدی، زبیدہ سلطانہ۔ آپ کے فلسفۂ حیات میں زندگی عبارت ہے جد و جہد کشمکشِ پیہم اور جفاکشی سے۔ بقولِ اقبال ؎

جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی

○

اے دل بگڑ نہ جائے اس طرح کام میرا — لینا نہ بھول کر بھی محفل میں نام میرا

مجھ کو مٹانے والے دنیا کا سُن فسانہ — کس کس طرح سے آیا کہنے میں نام میرا

دہرائی جائیں گی جب دنیا کی داستانیں — آئے گا ساتھ تیرے اُس وقت نام میرا

لیلیٰ کو جانے والے مجھ کو نہ بھول جانا — ہو جائے نام تیرا بن جائے کام میرا

ہے اُن کو مجھ سے نفرت تو بھی زہیر سُن لے
محفل میں اُن کی آئے لب پر نہ نام میرا

○

ظرفِ سکوت میرا بڑے کام آ گیا — ساقی بہ جام بادۂ گلفام آ گیا

اُس بزم میں وفاؤں کا جب تذکرہ چھڑا — بے اختیار لب پہ مرا نام آ گیا

اب تو بھی آ کے دیکھ تماشائے بیخودی — کوچہ میں تیرے عشق کا بدنام آ گیا

بے اختیار اُن کی طرف اُٹھ گئی نظر — میری نگاہِ شوق پہ الزام آ گیا

جس وقت جا رہا تھا جنازہ زہیر کا
ظالم بھی دیکھنے کو لبِ بام آ گیا

○

آمدِ فصلِ بہاراں کو زمانہ ہو گیا — اپنا گلشن مجھ کو لیکن قید خانہ ہو گیا

وہ سمجھ سکتے نہیں اور ہم بتا سکتے نہیں — کیوں مرتب حُسن و الفت کا فسانہ ہو گیا

رہ گیا تھا ایک دِل لے دے کے اپنا ہمنوا — ناوکِ جاناں کا وہ بھی تو نشانہ ہو گیا

اُن کے سنگِ آستاں پر مل گئی جب سے جگہ
مرنے جینے کا زہیر اپنے ٹھکانا ہو گیا

○

پہونچا دے اے صبا اُسے تو ہی مرا پیام — دن رات ہے زبان پہ جس بے وفا کا نام
سورج بھی تم کو دیکھنے آتا ہے بام پر — تم ہی بتاؤ حُسن کا اب اپنے کچھ مقام
رہ رہ کے یاد اُس کی ستاتی ہے بار بار — ملتا نہیں کسی کو پتا جس کا صُبح و شام
دو چار دن بھی پیار کے گذرے نہ تھے ابھی — قسمت سے پھر نصیب ہوئی فرقتِ دوام
جِس دن سے وہ نگاہ میں اپنی نہیں رہا — راتوں کی نیند ہوگئی اُس دِن سے بس حرام
بدنام کیوں زمانے نے پھر مجھ کو کر دیا — اُلفت کا کھیل تھا اگر ایسا ہی نا تمام

مَیں تو جنونِ عشق میں کیا کیا نہ کہہ گیا
پھر بھی تو اے زہیر وہ کرتے نہیں کلام

○

آج وہ لُطفِ عام نہیں — آج وہ دَورِ جام نہیں
ایک تھے کل ہم تم دونوں — آج کرم کا نام نہیں
پینے والا خاک پیئے — جب گردش میں جام نہیں
حُسن سہی پابندِ جفا — عشق اسیرِ دام نہیں
دیکھنے والا کیا دیکھے — طور کا جلوہ عام نہیں

اُن کی بزم میں آج زہیر
ایک مرا ہی نام نہیں

○

○

نظروں سے دُور ہو نہ ترا آستاں کہیں — دُنیا مٹا نہ دے مرا نام و نشاں کہیں
اتنا خیال بھی نہ رہا تجھ کو دیکھ کر — سجدہ کہیں، جبیں ہے کہیں، آستاں کہیں
تیری نگاہِ ناز نے ایسا مٹا دیا — دنیا میں مل سکا نہ مرا پھر نشاں کہیں
پھر کون تجھ کو دعوتِ میخانہ دے گا شیخ — ہم سا نہ اب ملے گا تجھے مہرباں کہیں
کعبہ سمجھ کے سجدہ کروں گا میں اے زہیر
مل جائے نقشِ پا کا جو اُن کے نشاں کہیں

○

گِلہ زمیں کا نہ پروائے آسماں مجھ کو — پھرا رہا ہے مقدر کہاں کہاں مجھ کو
سُنا دوں میں جو فسانہ فریبِ منزل کا — زمانہ کہنے لگے میر کارواں مجھ کو
اِدھر بھی ایک نظر سب کو دیکھنے والے — کہ لائی ہے تری اُلفت کشاں کشاں مجھ کو
عدم سے آیا تھا ہستی میں ڈھونڈنے تجھ کو — مگر مِلا نہ یہاں بھی ترا نشاں مجھ کو
مِلی اجازتِ سجدہ نہ پاسباں سے زہیر
مِلا نصیب سے اُن کا جو آستاں مجھ کو

○

تیور کے ساتھ حُسن کی فطرت بدل گئی — یعنی چھُری سی ایک مرے دل پہ چل گئی
اُس دِلرُبا سے عہدِ وفا کی اُمید کیا — جِس پہ مری وفاؤں کی دنیا مچل گئی
ہے آرزوئے وصل نہ دیدار کی ہوس — کیسی ہوائے یاس مرے دل میں چل گئی
آئے جو وقتِ نزع عیادت کو وہ مری — پہلے سے کچھ ضرور طبیعت سنبھل گئی
پہلے تھا انتظار کہ آئیں گے وہ زہیر
وہ آگئے تو اور بھی حالت بدل گئی

بن جاتی تمامِ عمر ہے قضا بھی کبھی کبھی　　لیتی ہے جان تیری جفا بھی کبھی کبھی
اے دوست تیری تلخ کلامی کے باوجود　　دل کو پسند ہے یہ ادا بھی کبھی کبھی
مانا کہ بے وفائی بھی اِک حُسن ہے مگر　　کیا ہو بُرا کرو جو وفا بھی کبھی کبھی
کہہ دے یہ چارہ سازوں سے بہرِ خُدا کوئی　　کچھ ہو دوا تو کچھ ہو دُعا بھی کبھی کبھی
کیا خوب ہو کہ اپنی جفاؤں کے ساتھ ساتھ　　بن جاؤ دردِ دِل کی شفا بھی کبھی کبھی

تبدیلیٔ مذاق کو لازم ہے اے زہیرؔ
دورِ شرابِ ہوش رُبا بھی کبھی کبھی

آتا ہے نامہ بر مرا نامہ لئے ہوئے　　بیٹھا ہوں انتظار کی دنیا لئے ہوئے
محشر ہے دُور تر، تو قیامت ہے دُور دُور　　مَیں ہوں ابھی سے ذوقِ نظارہ لئے ہوئے
دل میں ہے میرے عشق کی رسوائیوں کا خوف　　نِبتی نہیں ہے نام تمہارا لئے ہوئے
جوشِ جنوں میں چل دیئے صحرا کو آج ہم　　دِل میں خیالِ دامنِ صحرا لئے ہوئے

او بے وفا! زہیرؔ کو ٹھکرا نہ اِس طرح
پھرتا ہے سر میں وہ ترا سودا لئے ہوئے

محفل سے کیوں اُٹھاتے ہو اپنے زہیرؔ کو　　زاہد نہیں وہ شیخ نہیں کچھ ولی نہیں

مَیں تو جنونِ عشق میں کیا کیا نہ کہہ گیا　　پھر بھی تو اے زہیرؔ دہ کرتے نہیں کلام

اُس نے بھلا دیا ہے زہیرؔ آہ اب مجھے　　میں جس کی یاد سے کبھی غافل نہیں رہا

زہیرؔ اُس آستانے کی زیارت کو چلو تم بھی　　جہاں بندے خدا کے دو جہاں کو یاد کرتے ہیں

تصدق حسین تصدق

نام تصدق حسین ۔ تخلص تصدق ۔ آپ یکم جنوری ۱۹۰۵ء کو روڑکی (ضلع سہارنپور) میں پیدا ہوئے۔ اس وقت آپ کے جدِ امجد حضرت شاہ احسان اللہ محشرؔ دہلوی شاگردِ ذوقؔ بقیدِ حیات تھے۔ ۱۹۰۷ء تک ان کے زیرِ سایہ رہے۔ مئی ۱۹۰۷ء میں حضرت نے انتقال فرمایا۔

حضرت محشرؔ کو تصوف میں حضرت نجف علی شاہ چشتی نیازی سے بیعت و خلافت تھی۔

تصدق صاحب کی ابتدائی تعلیم آپ کے والد محترم شاہ عبدالغفور اور مولانا سید محمد شفیع مرحوم بخاری فاضلِ دیوبند کی نگرانی میں ہوئی۔ انگریزی دوسرے کئی اساتذہ کے علاوہ سید محمد سرور چشتی مرحوم سے پڑھی اور اُن کے ایما پر آپ انگریزوں کو اردو فارسی پڑھانے لگے کچھ عرصہ گورنمنٹ ہائی سکول روڑکی میں ہیڈ مولوی رہے۔

جس گھر میں آپ کی آنکھ کھلی وہ علمی خزائن سے معمور تھا۔ حضرت محشرؔ کے کتب خانہ میں جو پانی پت سے ہوتا ہوا روڑکی آیا تھا ہر فن پر کتابیں موجود تھیں۔ کلیاتِ میرؔ، کلیاتِ سوداؔ، دیوانِ ظفرؔ جس کی چار جلدیں گھر میں تھیں ان کے مطالعہ کو شاعری کے لئے دلیلِ راہ بنایا۔ پھر دوسرے اساتذہ کے کلام سے بھی استفادہ کیا۔

روڑکی میں محمد ابراہیم وقیرؔ ارشد تلامذہ ظہیرؔ دہلوی زندہ تھے ابتدا میں اُن سے مشورہ سخن کیا۔ آپ ہر صنفِ سخن پر استادانہ قدرت رکھتے ہیں اور آپ کا کلام زبان و بیان اور فن کے حسن کا دلکش نمونہ ہوتا ہے۔

○

گُل ہوا عقل و آگہی کا چراغ
دل میں ہے کیفِ بیخودی کا چراغ

کر کے گُل میری زندگی کا چراغ
قبر پر لائے اب وہ کسی کا چراغ

کس کے دیدار کو نکلتا ہے
لے کے چاند اپنی چاندنی کا چراغ

بزم میں میرے ماہوش کے حضور
گُل ہیں بے رنگ، پھیکا پھیکا چراغ

سوزِ پروانہ سے ہیں بیگانہ
شمع زہرہ کی، مشتری کا چراغ

عشق کی ضو ہے قلبِ مضطر پر
ہے یہ غم آشنا خوشی کا چراغ

خود فنا ہو کے اب بصورتِ گُل
خندہ زن ہے کلی کلی کا چراغ

نہ رہا داغِ دل بھی بعدِ فنا
تھا تصدق یہ جیتے جی کا چراغ

○

یوں جلوہ گر ہے کعبۂ دل میں ضیائے حق
ہر ہر نفس سے آتی ہے پیہم صدائے حق

بادِ صبا جو لائی چمن میں نوائے حق
نکلی کلی کلی کی چٹک سے صدائے حق

جب رتبہ دانِ حق ہوا نغمہ سرائے حق
چمکی ضیائے حق کہیں اٹھی صدائے حق

حق ناشناس کو نہیں ملتا سکونِ دل
حق دل کا ہے قرار تو دل ہے برائے حق

وہ بے بہا ہے قطرۂ خونِ شہیدِ قوم
اس لعل شب چراغ میں دیکھو ضیائے حق

باطل بزعم لعنتِ پستی میں ہے اسیر
وہ کیا اُبھر سکے گا جسے خود دبائے حق

ہوں اس کے حق میں کون و مکاں کی سعادتیں
پیشِ نظر اگر ہو بشر کے رضائے حق

کیوں جان و دل پہ ہو نہ تصدق کو افتخار
قربان ایک حق پہ ہے اک مبتلائے حق

○

○

ہے بہار افزا ہمارے داغِ عصیاں کی چمک
زاہدو! تم کو مبارک باغِ رضواں کی چمک

آج پھر ملنے کو ہیں صحرا نوردی کے مزے
پھر رگِ دل تک بڑھی خارِ مغیلاں کی چمک

دیکھتے ہی دیکھتے پروانہ خاکستر ہوا
سر کو دھنتی رہ گئی ہے شمعِ گریاں کی چمک

راہِ تسلیم و رضا میں بن کے میری رہنما
لے چلی مقتل کی جانب تیغِ براں کی چمک

کیا لبِ غنچہ پہ شبنم کی چمک تھی ناگوار
لے اڑی اس کو جو خورشیدِ درخشاں کی چمک

صحنِ کعبہ میں جمالِ مصطفےٰ کے فیض سے
دیکھ لی اہلِ نظر نے نورِ ایماں کی چمک

ہے یہ سب ماہِ عرب کے نور کی جلوہ گری
مہر و مہ کی روشنی، ماہِ درخشاں کی چمک

اللہ اللہ دیدہ و دل کے تصدق یہ نصیب
مصحفِ رخ کا تصور نورِ عرفاں کی چمک

○

قائم ہے حسن و عشق کی محفل الگ الگ
بسمل الگ ہیں تو قاتل الگ الگ

نذریں قبول کرتا ہے قاتل الگ الگ
سر کچھ الگ الگ ہیں تو کچھ دل الگ الگ

موجیں تو لے چلیں مجھے ساحل پہ گھیر کر
کہتا ہے سینہ تان کے ساحل "الگ الگ"

تکمیلِ راہِ عشق میں جو تھک رہا جہاں
بنتی گئی ہر ایک کی منزل الگ الگ

بیم و رجا میں جنگ رہی تا دمِ حیات
آخر کیا اجل نے بمشکل الگ الگ

قدرت نے ذوقِ عشق بھی بخشا بقدرِ ظرف
تقسیم جب بشر کو کیے دل الگ الگ

مشکل کشا کے در پہ گیا جو بھی دردمند
حل ہو گئی ہر ایک کی مشکل الگ الگ

کہہ رہا ہے یوں ہے تصدق کنارِ کشت
عالم میں جیسے ہوں حق و باطل الگ الگ

○

○

مسکرا اٹھتا ہے دل مسرور ہو جاتا ہے دل
جب کسی کے تیرِ مژگاں کی خلش پاتا ہے دل

کھینچتا ہے اُس کو دل خود بھی کھنچا جاتا ہے دل
دل کو دل سے راہ ہے جاتا ہے دل آتا ہے دل

کون دل کو لے گیا خود اپنے دل سے پوچھیے
دل جب آتا ہے کسی پر پھر کہاں جاتا ہے دل

دل کے زخموں کو نہ چھیڑا ہے چارہ گر بس شکریہ
اِن ستاروں ہی کے جھرمٹ میں سکوں پاتا ہے دل

جا رہا ہوں کوچۂ دلبر میں یوں بالواسطہ
دل کو لے کر وہ چلے مجھ کو لیے جاتا ہے دل

ایک وہ دن تھا کہ طفلِ دل کو بہلاتا تھا میں
آج بچوں کی طرح خود مجھ کو بہلاتا ہے دل

پیکرِ خاکی کو آئے کیا ہوائے عشق راس
اشک برساتی ہیں آنکھیں آگ بھڑکاتا ہے دل

توڑ دیتی ہیں تصدق دم ہزاروں حسرتیں
جب کہیں آزارِ الفت کے مرے پاتا ہے دل

○

آیا جو مصیبت میں لبوں پر خدا کا نام
گمنام ہو کے رہ گیا جُرم و خطا کا نام

رائج ہو جس کے عہد میں جور و جفا کا نام
اُس تند خو کو خار ہے حرفِ وفا کا نام

بیتا ہوں علم شوق بھی لے کر قضا کا نام
دم کر رہا ہوں آبِ بقا پر فنا کا نام

تیرے مریض کو ہے شفا سے کچھ ایسی ضد
وحشت سی دل میں ہوتی ہے سن کر دوا کا نام

لے دے کے رہ گئی یہ مرے دل کی کائنات
اک اُس کی یاد اور بس آگے خدا کا نام

چھیڑو نہ ذکر یار کی زلفِ سیاہ کا
بیٹھے بٹھائے لینے لگے کس بلا کا نام

شہرت میں دونوں لازم و ملزوم ہو گئے
میری وفا کی دھوم بتِ بے وفا کا نام

اک بے وفا پہ جان فدا کی تو غم نہیں
روشن تو ہو گیا ہے تصدق وفا کا نام

○

میں چھوڑوں آپ کے قدموں کو اتنی تاب نہیں
قسم ہے آپ کے سر کی نہیں جناب نہیں

نہ جانے پہلا سا کیوں دل میں اضطراب نہیں
تمہاری زلف میں شاید وہ پیچ و تاب نہیں

جو خاکپائے سرِ راہِ بو تراب نہیں
وہ شہرِ علم کی محفل میں باریاب نہیں

بشر کے واسطے کتنی خوشی ہے کتنے الم
"یہ وہ سوال ہے جس کا کوئی جواب نہیں"

الٰہی درسِ محبت کا کچھ نصاب بھی ہے
کہ اس کا کوئی بھی مکتب نہیں کتاب نہیں

دکانِ حسن میں شوخی بھی ہے لگاوٹ بھی
جو چاہو جنسِ وفا بھی، تو دستیاب نہیں

قریب تر رگِ جاں سے، نگاہ سے مستور
وہ اتنا کھل بھی گئے پھر بھی بے حجاب نہیں

میں آج تک بھی تصدق ہوں مستِ جامِ الست
خمار دور ہو جس کا یہ وہ شراب نہیں

اُن آنکھوں کو پیکِ قضا باندھتا ہوں
اُس ابرو کو تیغِ ادا باندھتا ہوں

پریشان اوراق اور میری وحشت
یہ شیرازہ پھر کھل گیا باندھتا ہوں

مجھے ناز ہے اپنی آہِ رسا پر
دعاؤں سے دستِ خطا باندھتا ہوں

کجا میں کجا بندشِ نظمِ گیسو
میں وحشت میں کیا جانے کیا باندھتا ہوں

تری زلفِ مشکیں کی لے لیں بلائیں
انہیں سے میں دستِ خطا باندھتا ہوں

محبت کے عقدے کھلے جا رہے ہیں
تصور میں زلفِ دوتا باندھتا ہوں

رقم کر کے توصیفِ زلفِ معنبر
ہوا باندھتا ہوں ہوا باندھتا ہوں

تصدق طبیعت ہے جولانیوں پر
سمندِ وفا کھل گیا باندھتا ہوں

دل درد سے محروم ہے معلوم نہیں کیوں
وہ کیف ہی معدوم ہے معلوم نہیں کیوں

عاشق ترا مغموم ہے معلوم نہیں کیوں
دیدار سے محروم ہے معلوم نہیں کیوں

ہوتا ہے زمانے میں ہر اک موت کا صدمہ
مرنے کی مرے دھوم ہے معلوم نہیں کیوں

وہ حسنِ خداداد جو بے وہم و گماں ہے
اک ہستیٔ موہوم ہے معلوم نہیں کیوں

لاکھوں کو تہِ تیغ کیا پھر بھی ستمگر
معصوم کا معصوم ہے معلوم نہیں کیوں

وہ رازِ محبت جو لبوں تک بھی نہ آیا
ہر ایک کو معلوم ہے معلوم نہیں کیوں

ہوتا تھا جو محسوس وجودِ دلِ شیدا
نظروں سے وہ معدوم ہے معلوم نہیں کیوں

دل نے ہی دکھایا ہے مجھے ظلم تصدق
دل ہی مرا مظلوم ہے معلوم نہیں کیوں

دل موت سے دلگیر ہے معلوم نہیں کیوں
ہستی پہ یہ تغییر ہے معلوم نہیں کیوں

پہلے تھی کوئی خوابِ محبت کی بھی تعبیر
اب خواب ہی تعبیر ہے معلوم نہیں کیوں

دنیا کو تری جور و جفا کی ہے شکایت
دنیا تری دلگیر ہے معلوم نہیں کیوں

اک رندِ خرابات کی اک شیخِ حرم کی
میخانے میں تصویر ہے معلوم نہیں کیوں

ہے تیغِ جفا بھی سرِ تسلیم بھی حاضر
اب اس پہ بھی تاخیر ہے معلوم نہیں کیوں

قاتل نے تو پوشیدہ مجھے قتل کیا تھا
اب لاش کی تشہیر ہے معلوم نہیں کیوں

شمشیر بکف آتا ہے کیا کوئی، تصدق
لب پر مرے تکبیر ہے معلوم نہیں کیوں

پوچھتے کیا ہو حالِ دل صورتِ حال دیکھ کر چہرۂ پُر ملال پر حزن و ملال دیکھ کر

دستِ کرم اٹھا بھی دو دستِ سوال دیکھ کر اپنے گدائے حسن کا عجزِ کمال دیکھ کر

مجھ کو نہ پائمال کر میرا مآل دیکھ کر اپنے جمال کی قسم اپنا جمال دیکھ کر

اُس کے جلال و قہر کو آ گیا مجھ پہ رحم خود اپنے کرم کی اک جھلک شاملِ حال دیکھ کر

دستِ طلب دراز تھا بند تھی چشمِ آرزو دستِ کرم تڑپ اٹھا دستِ سوال دیکھ کر

کہتے تھے ہم تو پہلے ہی دیکھ تو آئینہ نہ دیکھ خود تجھے رشک آ گیا اپنا جمال دیکھ کر

حسن کی بے نیازیاں ناز و نیاز بن گئیں میرے شکستہ حال میں اپنا کمال دیکھ کر

یہ بھی تصدق آپ کی محویتِ کمال ہے
اُس کی مثال بن گئے اپنا مآل دیکھ کر

دیدۂ دل سے دیکھیے رفعتِ آستانِ دل جلوۂ بے نیاز ہے جلوۂ لامکانِ دل

دیر ملا حرم ملا مل نہ سکا نشانِ دل کھنچ نہ سکا خیال میں نقشۂ لامکانِ دل

چہرۂ پُر ملال پر قطرۂ اشکِ خوں نہ دیکھ بن کے خرابِ آرزو نکلی ہے داستانِ دل

سوز و دروں کا واسطہ صبر و سکوں کا واسطہ گریۂ ناگہاں نہ بن رہزنِ کاروانِ دل

دل کا عدم عدم نہیں عشق کی کائنات میں مٹ گیا جب نشانِ دل بن گئی داستانِ دل

حسرت و یاس و آرزو مل گئے آہ خاک میں کیسا زمینِ عشق پر چھا گیا آسمانِ دل

بیٹھ نہ جائیے کہیں اپنے جگر کو تھام کر دل میں اگر ہو حوصلہ لیجیے امتحانِ دل

میرے جنوں پہ ناز تھا حسنِ جنوں نواز کو
آہ تصدق آرزو پڑ گئی درمیانِ دل

○

دل کی تباہی لب پر لائیں ایسے ہم واللہ نہیں
دل کی بابت دلبر جانے دل سے ہم آگاہ نہیں

دل کی اداسی امرِ مسلّم کون ہے پھر کون لیسے
جنسِ خوشی کا ذکر تو کیا ہے رنج بھی خاطر خواہ نہیں

جیتے جی جو رنج و الم تھے رکھ کے لحد میں اب وہ کہاں
آہ یہ سیرِ عمر کے ساتھی آج مرے ہمراہ نہیں

اہلِ تصوّف میں بھی کہاں ہے اب وہ مذاقِ فقر و فنا
نعرہ زنِ ہُو حق تو بہت ہیں لیکن حق آگاہ نہیں

خیر رہے ایماں کی تصدقؔ ہم بھی مٹے گو دل بھی مٹا
عشق میں ہم گمنام ہیں لیکن شکر یہ ہے گمراہ نہیں

○

صاف لفظوں میں کہوں مجھ کو ضرورت کیا ہے
خود بتا دیتی ہے صورت مری حسرت کیا ہے

دیکھتا ہوں تو تمہیں دیکھتا رہ جاتا ہوں
خود ہوں حیرت میں کہ آخر مجھے حیرت کیا ہے

ایک پیکانِ نظر اک شررِ برقِ جمال
اور اے دل ترے جذبات کی قیمت کیا ہے

دلِ بیتاب نکل خون کے آنسو بن کر
ہم دکھا دیں انہیں دیدار کی حسرت کیا ہے

نہ وہ آتے ہیں نہ بیتابیٔ دل میں ہے کمی
یہ نہیں ہے جو مصیبت تو مصیبت کیا ہے

دل جو ٹھہرے تو کروں شکوۂ بیتابیٔ دل
پوچھتے ہیں وہ "تمہیں مجھ سے شکایت کیا ہے"

دل ہوا اُس پہ تصدق وہ تصدقؔ دل پر
اب تصدقؔ نہیں معلوم محبت کیا ہے

○

فیاض عالم یوسفی

نام فیاض عالم خان، تخلص عالمؔ ۔ ۱۹۴۵ء میں فیروز پور میں پیدا ہوئے ۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو لاہور میں وارد ہوئے اور صدر بازار لاہور چھاؤنی میں مستقل طور پر آباد ہو گئے ۔

آپ نے اینٹرنس کا امتحان ۱۹۶۰ء میں اسلامیہ ہائی سکول لاہور چھاؤنی سے اور ایف اے ۱۹۶۲ء میں اسلامیہ کالج لاہور سے پاس کیا ۔ اسلامیہ کالج میں پروفیسر خالد بزمی صاحب نے آپ کے افکار پر گہرا اثر ڈالا اس کے بعد آپ نے ۱۹۶۴ء میں فارسی فاضل کے امتحان میں کامیابی حاصل کی ۔

آپ کی شاعری کی ابتدا اس وقت ہوئی جب آپ آٹھویں جماعت میں پڑھتے تھے ۔ آپ کے ایک استاد بشیر احمد صاحب بڑا ادبی ذوق رکھتے تھے ۔ اُن کے فیضان سے طبیعت میں جولانی پیدا ہوئی اور الفاظ شعر کی صورت میں ڈھلنے لگے ۔ اصلاحِ سخن کے لئے آپ کی نظر محترم حبیب اللہ صاحب نادی پر پڑی جس سے کئی دوسرے مشتاقانِ فن فیضان حاصل کر رہے تھے ۔ استاد کی نظر نے آپ کے شعر کو جلا بخشی اور حوصلہ افزائی کی ۔ اِس دوران میں آپ کے بھائی رشید احمد خان بھی آپ کا حوصلہ بندھاتے رہے ۔ آپ کا سب سے پہلا شعر یہ ہے ؎

نہیں ہے حال میں حالت ہماری دید کے قابل
کہ مستقبل میں اُڑنے کو پرِ پرواز ہے حاصل

○

آتی نہیں ہے عیش پرستی کسی کو راس　　مردانِ جنگ زیست بھی ہوتے ہیں غرقِ یاس
جب ہو جنونِ شوق میں منزل کی آرزو　　مجنونِ حق پرست کی بڑھتی ہے اور پیاس
جب ہو ظہورِ عالمِ بے دست پائی کا　　بنتی ہے میرِ قافلہ پھر زندگی کی یاس
باطل کی دل فریبی کا مجھ پر ہو کیا اثر　　فطرت میں اپنی رکھتا ہوں میں عقلِ خود شناس
جو اپنے آس پاس کی رکھتے نہیں خبر　　منزل سے دور دور رہے اُن کی نگاہِ یاس
ایمان کی لگن میں اُسے مل گیا صلہ　　میدانِ کفر میں جو ڈٹا مردِ حق شناس

عالمؔ ہے اُن کی زندگی بدتر سے بھی خراب
جن کو ذرا بھی قوم کا ہوتا نہیں ہے پاس

○

کالی گھٹا میں دیکھیے آبِ رواں کا رقص　　ہونے کو ہے بہار میں برقِ تپاں کا رقص
کنجِ قفس کے گرد ہے اب آشیاں کا رقص　　بزمِ تصورات میں ہے گلستاں کا رقص
معدوم ہو گیا ہے اب امن و اماں کا دور　　ہے گلشنِ حیات میں برقِ تپاں کا رقص
گردابِ آرزو ہے، طلاطم ہے، خیر ہو　　کشتی کے گرد و پیش ہے آبِ رواں کا رقص
دورِ غم و خوشی کا ظہور اس کی ذات ہے　　ہے باعثِ نظامِ جہاں آسماں کا رقص
یہ عالمِ وجود ہے جنّت کی اک جھلک　　پردے میں روز و شب کے ہے باغِ جناں کا رقص

جوشِ جنوں کو عالمِ مقصد ہوا نصیب
ہے منزلِ مراد پہ عزمِ جواں کا رقص

○

بے سود آرزو کے فسانے سے کیا غرض
ہم کو غرض غرض سے، زمانے سے کیا غرض

بجلی گرے کہ آگ لگے، آشیاں جلے
اُن کو کسی کے دُکھ کے فسانے سے کیا غرض

کیف و سرورِ رند کا مقصودِ ذوق ہے
پی پی کے مجھ کو ہوش میں آنے سے کیا غرض

جو کچھ ہوا، ہوا، وہ اب آگے کی سوچیے
بھولی ہوئی سی بات جتانے سے کیا غرض

جب جل کے خاک ہو گیا ہے آشیانِ شوق
اب گلشنِ وفا کو سجانے سے کیا غرض

دار و رسن پہ وقف ہوں روزِ ازل سے میں
مجھ کو کسی کے دار سجانے سے کیا غرض

عالمؔ سدا بہار گلستاں میں آ گئی
ہم کو خزاں کے آنے نہ آنے سے کیا غرض

کرنا کہاں ہے اپنے وہ داماں کی احتیاط
جس نے نہ کی ہو چاکِ گریباں کی احتیاط

جن کو نہیں ہے طالبِ دیدار کی طلب
کیوں کر کریں گے وہ دلِ سوزاں کی احتیاط

گلچیں گزر نہ جائے کہیں گُل کے پاس سے
رکھتے ہیں کس قدر وہ گلستاں کی احتیاط

ہر ایک تارِ آرزو ہے مستیز اب
وہ کر سکے نہ عارضِ تاباں کی احتیاط

جن کا ہمیشہ کام رہا تیر افگنی
کیونکر کریں وہ حالِ پریشاں کی احتیاط

بادِ صبا بھی بن گئی ہے آج تو رقیب
لازم ہے اب تو کوچۂ جاناں کی احتیاط

اُن کی جفا کی میری وفا پاسباں بنی
کرتا ہوں اب بھی عظمتِ پیماں کی احتیاط

ہونٹوں سے اُن کے پھولوں نے ہنسنا چرا لیا
اُن سے نہ ہو سکی لبِ خنداں کی احتیاط

عالمؔ جو آج چھائی ہے میخانے پر گھٹا
مشکل ہے ایسے وقت میں پیماں کی احتیاط

○

تیغوں کے سائے میں بھی کرے جو ثنائے حق　　بے شک اُسی کو ہوتی ہے حاصل رضائے حق

قربان جان و مال ہے حق کے لئے سدا　　روزِ ازل سے دل ہے مرا آشنائے حق

ہے عزم اُن کا ردِّ عمل تیغ و توپ کا　　شیرِ وغا وہ ہوتا ہے جو ہے فدائے حق

کیونکر نہ رزم گاہ میں یہ فتح یاب ہوں　　اِن غازیوں پہ سایۂ فگن ہے ہمائے حق

اپنے وطن کی آن پہ قربان جو ہو گئے　　رحمت نے ان کو ڈھانپا ہے بن کر ردائے حق

مسمار ہو گئیں ہیں ستم کی عمارتیں　　گونجی جو آسماں سے زمیں تک ندائے حق

وہ مانگتے ہیں غیر سے کیوں نانِ ننگ و نام
روزِ ازل سے یہ تو ہے عالم عطائے حق

○

جاں نثاروں کو ملی عزمِ درخشاں کی چمک　　چمکی مقتل سے جہاں میں اہلِ ایماں کی چمک

منزلِ ظلمات کو روشن کروں گا بالیقیں　　ہے مرے جذبات میں تعلیمِ قرآں کی چمک

جس طرف ہم بڑھ گئے فتحِ مبیں حاصل ہوئی　　ہے کلیدِ رزمگہ عزمِ فراواں کی چمک

ہر طرف آنے لگی ان کو نظر اپنی قضا　　جب پڑی کفار پر شمشیرِ ایماں کی چمک

لشکرِ حق کا نہ کیوں عالم میں روشن نام ہو
سر پہ جلوہ بار ہے تائیدِ یزداں کی چمک

○

○

رہتا نہیں ہے دل میں خیالِ جفا کا نام　　آتا ہے میرے لب پہ جو اُس بے وفا کا نام

جس طرح دوڑتی ہے چمن میں ہوا کی لہر　　یُوں جھومتا ہوں سن کے میں اُس جانفزا کا نام

ہے منزلِ حیات "یقیناً" جہاد میں　　دل میرا مسکراتا ہے سُن کر قضا کا نام

اِس سرزمیں کے ذکر سے پاتا ہے دل سکوں　　ردِّ بلا سمجھتا ہوں میں کربلا کا نام

ہر شے کی ماہیت ہے حقیقت میں ایک ہی　　تصویرِ کائنات ہے حکمِ خدا کا نام

اک خوش ادا کا نام ہے وجہِ قرارِ جاں　　میری دوا کا نام ہے اُس دلربا کا نام

عاؔلم جب اِس جہان کی گردش میں پھنس گیا
کشتی بھنور میں چھوڑ دی لے کر خدا کا نام

○

شرابِ عشق سے بہتر کوئی شراب نہیں　　جو اس میں کیف ہے اُس کیف کا جواب نہیں

گلوں کا قرب میسر ہے خارزاروں کو　　مجھے تو اُنس ہے کانٹوں سے اجتناب نہیں

جو دل میں خواہشِ مے اور زباں پہ نفرت　　یہ اجتناب تو تکمیلِ اجتناب نہیں

جفا سے عہدِ وفا میں نہ کچھ خلل آیا　　یہ سچ ہے عشق کی فطرت میں انقلاب نہیں

جنونِ عشق کا محور اِسے سمجھتا ہوں　　گلوں کے چہرے پہ رنگینیٔ شباب نہیں

وہ عشق، عشق نہیں ہے نہ ہو جنوں جس میں　　وہ عزم عزم نہیں ہے جو کامیاب نہیں

فضائے خواب میں رقصاں ہے خوابِ بیداری　　یہ وہ ہے خواب کہ جس میں اصولِ خواب نہیں

جواب دوں تو میں کیا دوں جواب لے عاؔلم
کوئی سوال ہی جب قابلِ جواب نہیں

○

پڑ گیا ہے واسطہ کچھ ایسے انسانوں کے ساتھ — جن کی وسعت کھیلتی ہے تنگ دامانوں کے ساتھ

بیکسی، بیچارگی رہتی ہے ویرانوں کے ساتھ — رقص میں وحشت رہا کرتی ہے دیوانوں کے ساتھ

جلتی ہے جب شمع نورانی ہے پیغامِ اجل — موت بھی ہر رنگ میں رہتی ہے پروانوں کے ساتھ

کیوں تعجب ہے رقیبِ صبحِ غفلت پر تمہیں — روزِ اوّل سے اِسے ہے بَیر انسانوں کے ساتھ

بیخودی میں یہ تو ہیں بیگانۂ سود و زیاں — مفت الجھا کرتے ہیں فرزانے دیوانوں کے ساتھ

یہ مقدّر کا کرم ہے یہ ہے فیضِ چشمِ یار — کار فرما خوش نصیبی ہے جو دیوانوں کے ساتھ

غیر ممکن ہے چمن میں اب گزارہ اے جنوں — بن میں بن بیٹھے گی دیوانوں کی دیوانوں کے ساتھ

کوئی دیوانہ ہوا جاتا ہے عالمِ رشک سے
کوئی محوِ لطفِ دل ہے اپنے ارمانوں کے ساتھ

جنوں ساماںیاں لے کر ہوائے مشکبار آئی — چمن میں شور برپا ہے بہار آئی بہار آئی

خزاں دیدہ گلستاں میں بہارِ نو بہار آئی — پیامِ جاں فزا لے کر ہوائے کوئے یار آئی

شفق بھی آسماں کے رُخ پہ شکلِ گلعذار آئی — بہار آئی بہار آئی برائے لالہ زار آئی

وفا کا خون دے کر لالہ و گل کا جہاں بخشا — کسی دیوانے کی نہ دلیں جو راہِ خار زار آئی

مقدّر دیکھ کر میرا رقیبوں کو تعجب ہے — زہے قسمت کہ اس کو میری یادِ بیقرار آئی

تصوّر کھنچ گیا جب امتیازِ حق و باطل کا — وہیں دیوانۂ حق کی نظر میں شکلِ دار آئی

وفورِ شوق سے خنداں گلوں کو چوم لینے کو — صبا صحنِ چمن میں ناز سے دیوانہ وار آئی

ذرا محتاط اہلِ دل بہت پُر کیف عالم ہے
یہی آواز صحرا کی طرف سے بار بار آئی

بشیر رزمی

نام محمد بشیر بیگ۔ تخلص رزمی۔ یکم فروری ۱۹۴۲ء کو قصبہ راجہ سانسی، تحصیل اجنالہ، ضلع امرتسر میں پیدا ہوئے۔ قیام پاکستان پر مشرقی پنجاب سے ہجرت کرکے آئے تو صدر بازار لاہور چھاؤنی میں مقیم ہوئے اور اب یہی آپ کا وطن ہے۔

آپ نے ۱۹۵۹ء میں انٹرنس، ۱۹۶۲ء میں ایف اے، ۱۹۶۴ء میں بی اے اور ۱۹۶۶ء میں ایم اے پاس کیا۔

فنِ شعر سے آپ کو بچپن ہی سے مناسبت ہے۔ تمام اصنافِ سخن پر طبع آزمائی کرتے ہیں لیکن طبیعت کا زیادہ رجحان غزل کی طرف ہے اردو غزلیں خاصی تعداد میں کہہ چکے ہیں۔ اصلاحِ سخن کے لیے صوفی حبیب اللہ صاحب، حاوی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اور ان کا بہت احترام کرتے ہیں کبھی کبھی فارسی میں بھی شعر کہتے ہیں اور اچھا کہتے ہیں۔

میری زبان شعر، مرے ہونٹ ہیں سپاس — میرا امامِ عشق، جنوں ہے مری اساس

دار و رسن کا خوف نہ زنداں کا ہے ہراس — ڈرتا نہیں اجل سے کبھی مردِ حق شناس

کج بینیٔ نظر مجھے دھوکہ نہ دے سکی — خود جلوہ گر ہوا ہوں پہن کر نیا لباس

شبنم کے موتیوں سے منوّر تھا گلستاں — لیکن کلی کلی نظر آئی مجھے اُداس

گمراہ عقل رنگ بدلتی رہی سدا — دھوتی رہی شرابِ جنوں زنگِ التباس

چھوڑی نہیں تھی میں نے کبھی پیمانِ عزم — میرا کوئی قصور نہ تھا اے نگاہِ یاس

جلوہ نیا، ضیا بھی نئی، طور بھی نیا — بجھتی نہیں مگر نظرِ دید کی پیاس

بادِ بہار مشک فشاں، صبح ہے قریب — گیسوئے یار کی مجھے پھر آ رہی ہے باس

میری فغاں لئے ہوئے تھی دُودِ احتجاج — میرے سکوتِ اشکِ رواں میں تھی التماس

رفتارِ مہر و ماہ ارادے سے اِن کے ہے — تقدیرِ کائنات ہیں مردانِ خود شناس

رمزی حریمِ ناز ہے دامِ نگاہ میں
دیر و حرم سدا رہے منّت کشِ قیاس

○

گردابِ جستجو میں خیالِ رواں کا رقص — ہے بے گماں یہ کاشفِ سرِ نہاں کا رقص

تحریکِ انقلاب ہے رفتارِ دہر کی — گردش میں آسماں کی ہے سود و زیاں کا رقص

جاری ہے تنکے تنکے پہ چرخِ کہن کا ظلم — دیکھے تو کوئی جلتے ہوئے آشیاں کا رقص

دشتِ جفا کے تُند بگولوں کے ساتھ ساتھ — ہے دیدنی شہیدِ اناالحق کی جاں کا رقص

گردابِ ہجر میں ہے سفینہ خیال کا — امواجِ درد سے ہے دلِ ناتواں کا رقص

بارانِ سنگ ہائے الم رونما رہی — سر پر مرے رہا اجلِ ناگہاں کا رقص

گلشن میں پھول پھول فسردہ جمال ہے — رنگِ بہار میں ہے نشانِ خزاں کا رقص

پیشِ نظر ہے گردشِ پرکار کا اصول
وابستۂ بہار ہے رزمی خزاں کا رقص

○

ایمان و کفر و غم کے فسانے سے کیا غرض — ہوں غرقِ جامِ چشم، زمانے سے کیا غرض

ہوتے ہیں بے نیاز مجاہد بہار سے — رزم آشنا کو بزم سجانے سے کیا غرض

ہر جس کے جام میں مئے عرفانِ حق اُسے — بنتِ عنب کا خون بہانے سے کیا غرض

بے لوث جن کے دل نہیں احباب کے لئے — اُن سے تعلقات بڑھانے سے کیا غرض

ساقی کی چشمِ مست سے ہے واسطہ مجھے — جامِ سفال و جم کے فسانے سے کیا غرض

کج بینیٔ نگاہ میں ہر شے خمیدہ ہے — بے سود راہِ راست دکھانے سے کیا غرض

رنگی گلوں کے ساتھ اُبھرتے ہیں خار بھی
یوں گلشنِ ادب کو سجانے سے کیا غرض

○

○

ممکن نہیں ہے عقل سے داماں کی احتیاط — جب ہو سکی نہ جیب و گریباں کی احتیاط

مجھ سے رقیب چھین نہ لے دولتِ فراق — رکھتا ہوں رات دن غمِ جاناں کی احتیاط

جادو بھری بلے پناہ کسی کی نگاہ میں — کس طرح ہو سکے دلِ ناداں کی احتیاط

چلنے لگی ہے تند ہوائے غمِ فراق — لازم ہے بزمِ دل کے چراغاں کی احتیاط

دامانِ چاک، عصمتِ داماں کا تھا گواہ — قدرت جو بن گئی دلِ کنعاں کی احتیاط

خونِ شہیدِ عشق عیاں ہے گلاب سے — یوں کام آ گئی دلِ سوزاں کی احتیاط

رزمی ہوا ہے اب گلِ حسرت بھی دل خراش
ہے زخم کار یادِ نگاراں کی احتیاط

○

جو خود شناس ہو، ہے وہی آشنائے حق — لرزاں ہیں اس سے بام و درِ ماسوائے حق

گھبرا گیا جو پیچ و خمِ زلفِ دہر سے — پہچانتا نہیں ابھی حُسنِ ادائے حق

بر دوشِ خوفِ تیرگیٔ کفر چل بسی — ضو بار چار سمت ہے مہرِ ضیائے حق

میدانِ مرگ و زیست طلب کر رہا ہے خون — ہے امتحانِ برششِ تیغِ وفائے حق

بادِ بہارِ رزم خراماں چمن چمن — نصرت بدوش بوئے نسیمِ رضائے حق

رزمی سپاہِ غیر کو ہو گی شکست فاش
شمشیرِ ظلم سوز نکبت ہے گدائے حق

○

○

قلبِ کافر میں ہے پنہاں نارِ شیطاں کی چمک — چشمِ عارف میں درخشاں نورِ یزداں کی چمک
خود شناسی سے عیاں ہے قربِ یزداں کی چمک — غیر سوزی ہے دمِ شمشیرِ عرفاں کی چمک
گُل بہاروں کی ضیا، بُلبل نظاروں کی نوا — باغِ ہستی میں رواں ہے حسنِ جاناں کی چمک
اللہ اللہ آہِ پُرتاثیرِ شاہینِ جلال — اب فروغِ آشیاں ہے برقِ سوزاں کی چمک
دل شجاعت کا پیمبر، خوں شہادت کا امین — شمعِ نصرت میں ہے روشن عزمِ مرداں کی چمک
چشمِ بینا چاہیئے رزمی نظارے کے لئے
ذرّے ذرّے سے عیاں ہے مہرِ تاباں کی چمک

○

ہر اِک کی آرزو کا ہے حاصل الگ الگ — راہیں جُدا جُدا ہیں تو منزل الگ الگ
اِک مکتبِ خبر ہے تو اِک مکتبِ نظر — دونوں کے ارتقا کے مسائل الگ الگ
کافر جفا کا پتلا تو مومن وفا کی جان — دونوں ہیں ذوقِ کار میں کامل الگ الگ
اک ہے ہزارِ امن تو اِک بُلبلِ ستم — گلزارِ زیست میں ہیں عنادل الگ الگ
دریائے عشق و رہ دِ ہوس میں بہت ہے فرق — طوفاں جُدا جُدا ہیں تو ساحل الگ الگ
بس ایک ہی نگاہِ کرم کام کر گئی — محسوس کرتے ہیں نظر و دِل الگ الگ
یلغار بن کے آئے تھے رزمی! ہنودِ غم
ہم نے گرائے مدِّ مقابل الگ الگ

○

○

راہ میں بے شک ہزاروں خوش نظر پاتا ہے دل — خوب سے بھی خوب تر کی ڈھونڈ میں جاتا ہے دل

مضطرب دل کی تڑپ بیکار جا سکتی نہیں — خود تڑپتا ہے ہمیں بھی ساتھ تڑپاتا ہے دل

جب کتابِ زندگی میں دیکھتا ہے بابِ مرگ — خوف کھاتا ہے زمانے سے نہ گھبراتا ہے دل

دشت زارِ چشم کو سیرابِ غم کرتے ہوئے — جوش میں طوفان بن کر خود بہا جاتا ہے دل

زیست کی تاریک شب میں خوں جلا کر فکر کا — شبستانِ آرزو میں نور برساتا ہے دل

نغمۂ تقدیر لہراتا ہے سازِ عزم پر — گردشِ اوقات کا محور نظر آتا ہے دل

کھل رہے ہیں دمبدم رزمی! نفس کے پھول دیکھ
لمحہ لمحہ زیست کی خوشبو سے مہکاتا ہے دل

○

وہ عشق عشق نہیں عشق کامیاب نہیں — کہ جس میں جذبۂ اخلاص بوتراب نہیں

مزاجِ کیف میں کیوں جوشِ التہاب نہیں؟ — نگاہِ ناز میں کیا گرمیٔ شراب نہیں

سمجھ سکا نہ کوئی ماسوائے اہلِ جنوں — کتابِ عشق سے مشکل کوئی کتاب نہیں

رہینِ پردۂ گوشِ ہوس بنے کیونکر — صدائے نالۂ دل، نغمۂ رباب نہیں

جوابِ خواہشِ دیدار، سوزِ ہجرِ دوام — یہ وہ جواب ہے جس کا کوئی جواب نہیں

تمہیں بھی مل نہ سکے وہ گھڑی جہاں آرام — فضائے دشتِ دل ایسی بھی تو خراب نہیں

ہزار بار پڑے روئے حسن پر پردہ — بچے جو چشمِ جنوں سے کوئی نقاب نہیں

میں اُس جناب میں کیوں لب کشا ہوں اے رزمی
کہ جس جناب میں آزادیٔ جواب نہیں

○

عطاء الحق قاسمی

عطاء الحق قاسمی، یہی نام اور یہی تخلص، یکم فروری ۱۹۴۳ء کو امرتسر میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وز
یں حاصل کی۔ ماڈل ہائی سکول ماڈل ٹاؤن سے میٹرک' اور ایم اے او کالج لاہور سے بی۔ اے کیا
کل یونیورسٹی اورنٹیل کالج میں ایم اے (ادبیات اردو) کی تیاری کر رہے ہیں۔

شعر و ادب سے شروع ہی سے مس رہا ہے اور ان کی اس دلچسپی کی بنیاد ان کے والدِ محترم
ڈالی جو انہیں ایسی کتابیں پڑھنے کے لئے لا کر دیا کرتے تھے۔ جو سبق آموز ہونے کے ساتھ ساتھ ادبی
سے بھی معیاری ہوتی تھیں۔ کالج میں جا کر یہ ذوق اور نکھرا اور ادبی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصّہ
لگے۔ چنانچہ اپنے زمانے میں کالج کی واحد ادبی انجمن "مجلسِ نمودِ اردو" کے سیکرٹری اور صدر رہے۔ نیز
عرصہ کالج میں رہے کالج کے علمی اور ادبی مجلّہ "شفق" کے چیف ایڈیٹر بھی رہے۔ آج کل پنجاب یونی
کے اردو مجلّہ "محور" کے مدیر ہیں۔

اگرچہ اظہارِ جذبات کے لئے نظم اور نثر دونوں سے کام لیتے ہیں۔ لیکن اصل میدان نثر ہی ہے ا
نثر میں بھی طنز و مزاح محبوب صنف ہے۔ ایک مدّت تک ہفت روزہ "شہاب" لاہور میں فکاہیہ
"کچھ یونہی" کے زیرِ عنوان لکھتے رہے ہیں۔ ان مزاحیہ مضامین کا مجموعہ اسی نام سے زیرِ ترتیب ہے۔
آج تک جن رسائل و جرائد میں لکھتے رہے ہیں۔ اُن میں لیل و نہار، اقدام، نصرت، قندیل، شہ
اور بیسویں صدی خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

اصنافِ سخن میں سے غزل کم اور نظم زیادہ لکھتے ہیں اور اکثر نظم معرّیٰ۔ غزل میں بھی اسلوبِ
کے پیرو ہیں۔ خیالات میں جدّت ہوتی ہے اور اندازِ بیان میں ندرت۔

○

دِل کو ترے غم سے تہی داماں نہیں دیکھا — اِس شہر کو مَیں نے کبھی ویراں نہیں دیکھا

یوں دیکھ رہا ہوں در و دیوار کی صورت — جیسے کبھی مَیں نے کوئی زنداں نہیں دیکھا

مَیں ساتھ لئے پھرتا رہا مہرِ جہاں تاب — لوگوں نے مِرا چاکِ گریباں نہیں دیکھا

وہ دیکھ رہا تھا دمِ رخصت مِری جانب — مَیں نے ہی اسے دیدۂ گریاں نہیں دیکھا

سائے کی طرح رہتا ہے ہر دم جو مِرے ساتھ — مَیں نے اُسے اب تک کبھی عنواں نہیں دیکھا

اِس آئینہ خانے میں عطاؔ ہم نے تو اب تک
دل سا کوئی آشفتہ و حیراں نہیں دیکھا

○

کیا بات ہوئی ہے اب کے برس وہ جوش نہیں دیوانوں میں — گلشن میں اداسی پھیلی ہوئی ہے خاموشی زندانوں میں

پھر سینے میں اِک درد اُٹھا، پھر آنکھوں میں دیپ جلنے لگے — پھر دل کو کسی کی یاد آئی، پھر شام ہوئی ویرانوں میں

کیا جانیے کس کس پر برسے یہ اُمڈی ہوئی خاموش گھٹا — کیا جانیے کیا کیا بہہ جائے اِن ٹھہرے ہوئے طوفانوں میں

یوں جھانکتا پھرتا ہوں پہروں مَیں گلی گلی، دروازے دروازے — مَیں کھو بیٹھا ہوں جیسے کچھ اِن اُجڑے ہوئے سے مکانوں میں

اِن چلتے پھرتے سایوں کی نگری میں عطاؔ ہم کس سے کہیں
جو ہوتا ہے دن ڈھلتے ہی، اِن عشرت کے ایوانوں میں

○

○

لہو کے دیپ جہاں میں جلانے آئے ہیں — نشانِ ظلمتِ شب کے مٹانے آئے ہیں
کوئی یہ نیند میں ڈوبے ہوؤں سے جا کے کہے — لئے سحر کا علم، ہم جگانے آئے ہیں
بھٹک گئے ہیں جو منزل سے، اِس طرف آئیں — کہ ہم زمانے کو رستہ دکھانے آئے ہیں
ہمارے سینوں میں روشن ہے شمعِ حق، ہم لوگ — جہاں سے ظلم کی رسمیں مٹانے آئے ہیں
لئے چلو ہیں بہاروں کے قافلے ہم لوگ — خزاں رسیدہ گلستاں سجانے آئے ہیں

نگارِ ہستی ہوئی دوستو خفا ہم سے
ہم اہلِ شوق اسے پھر منانے آئے ہیں

○

جب سے بنایا عقل کو میزان دوستو — ہر شے سے اُٹھ گیا مرا ایمان دوستو
پھیلی ہوئی زمین کی عظمت سے روٹھ کر — کس سمت جا رہا ہے یہ انسان دوستو
آنے لگا ہے لطف اب اُس کے فراق میں — ہستی کا ہو چلا مجھے عرفان دوستو
اجڑی کچھ اس طرح سے مرے دل کی انجمن — لگتا ہے شہر بھی مجھے ویران دوستو
ایسے گذر گیا وہ مجھے دیکھتا ہوا — جیسے نہ مجھ سے تھی کبھی پہچان دوستو
اب دیکھئے تو خاک سی اڑتی ہے ہر طرف — کیا کیا تھے اپنے دل میں بھی ارمان دوستو

ہر بار آ ہی جاتا ہے دل کے فریب میں
اپنا عقل ہے کس قدر نادان دوستو

○

○

دن ڈھلا، تن گئی ہر سمت ردائیں تاروں کی
محفلیں سجنے لگیں دل کے الم زاروں کی

وادیٔ دل سے ہٹے وقت کی برفیلی ردا
آنچ دے اپنے دہکتے ہوئے رخساروں کی

خشک پتّوں کو ہواؤں سے بچا لو یارو
یہ نشانی ہیں مہکتے ہوئے گلزاروں کی

رات جب نیند سے مدہوش تھا آباد نگر
کیسی آواز تھی گرتی ہوئی دیواروں کی

اِس کڑی دھوپ میں دو چار قدم چل کر دیکھ
بیٹھنا ٹھیک نہیں چھاؤں میں دیواروں کی

زندہ رہنا ہے عطا تجھ کو، تو حق بات نہ کہہ
سخت ہوتی ہے سزا، ایسے گنہ گاروں کی

○

پیدل ہے کوئی اور کوئی موٹر لیے ہوئے
ہر شخص اپنے ساتھ مقدر لیے ہوئے

محفل سے تشنہ کام ہی رخصت نہ ہوں کہیں
ہم خواہشوں کا دل میں سمندر لیے ہوئے

یہ شہر کیسا شہر ہے، کیسے ہیں اس کے لوگ
ہر شخص آستیں میں ہے خنجر لیے ہوئے

سب دیکھتے ہیں، سوچتے ہیں، بولتے نہیں
کاندھوں پہ مصلحت کی ہیں چادر لیے ہوئے

حیران ہوں کہ ہر کوئی شیشے کے شہر میں
پھرتا ہے اپنے ہاتھ میں پتھر لیے ہوئے

گھبرا کے اُٹھ کھڑا ہوا بستر سے آج وہ
آنکھوں میں شب کے خواب کا منظر لیے ہوئے

○

خود کو کھٹک رہا ہوں کسی خار کی طرح
حائل ہوں اپنی راہ میں دیوار کی طرح

لمحہ بہ لمحہ پھیلتی جاتی ہیں ظلمتیں
دن ڈھل رہا ہے مشرقی اقدار کی طرح

بوئی ہمیں نے سینۂ شب میں ہے روشنی
ڈالی ہمیں نے صبح کے انوار کی طرح

اُس شوخ کی خوشامدیں کرتا ہوں رات دن
مَیں ہوں ٹرسٹ کے کسی اخبار کی طرح

انسان بک رہا ہے عقا کوڑیوں کے مول
سارا جہاں ہے مصر کے بازار کی طرح

کھڑکی کھول کے باہر دیکھوں

سائیں سائیں کرتی شاخیں
اندر باہر خوف ہوا کا
دائیں بائیں
سہمے منظر
کھڑکی کھول کے باہر دیکھوں
تو ڈر جاؤں
کالی، پیلی، نیلی آنکھیں، رستہ روکیں
رات کے دروازے سے باہر موت کی وحشت
گنبد کی آواز کا بھالا بن کر
میرے دل میں اُترے
میرے لئے ہر نقش وجودِ مرگ کی آہٹ
چہرہ چہرہ
گئے زمانوں کی آوازیں
آگے پیچھے
ہوا، چڑیلیں، رات کی ہیبت
کھڑکی کھول کے باہر دیکھوں
تو ڈر جاؤں

○

عبدالحق عارف

نام عبدالحق تخلص عارف ۔ ۱۹۱۲ء میں ضلع فیروز پور میں پیدا ہوئے ۔ بچپن کا زمانہ دیہاتی ماحول میں گزرا اور مناظرِ قدرت غیر شعوری طور پر دل و دماغ پر اثر انداز ہوتے رہے ۔ سخن وری کا جوہر بچپن ہی سے جزوِ طبیعت تھا ۔ چنانچہ ابھی آپ ہائی سکول ہی میں زیرِ تعلیم تھے کہ شعر کہنے لگے ۔ کسی سے اصلاح نہ لی ۔ ذوق ہی راہنمائی کرتا رہا ۔ چنانچہ آپ کہتے ہیں ؎

نہ ملا عارف کو کوئی شاعری میں رہنما
اپنے بندے کی خدا نے رہنمائی آپ کی

کالج کے زمانہ میں شعر گوئی کا شوق اور بھی بڑھ گیا اور آپ ہر صنف میں شعر کہنے لگے ۔

آپ نے تقریباً دس سال محکمہ تعلیم میں ملازمت کی اس کے بعد محکمہ ملٹری اکاؤنٹس میں ملازم ہو گئے ۔ اس وقت آپ ڈپٹی اسسٹنٹ کنٹرولر آف ملٹری اکاؤنٹس کے عہدے پر فائز ہیں ۔

○

بادل میں سبکھ لیتی ہے سیلِ رواں کا رقص
توپ و تفنگ و ایٹم و تیغ و سناں کا رقص
آخر میں بن کے سرتاپا برقِ تپاں کا رقص
یہ برق آکے دیکھتی ہے آشیاں کا رقص
صحنِ چمن میں گویا مکین و مکاں کا رقص

بیکس غریب جان کے دامن جھٹک دیا
جب اُٹھ سکا نہ بوجھ زمیں پر ٹپک دیا
پھر کہ لگایا اور نمک بھی چھڑک دیا
کہہ کہ حرام شیخ نے اس کو جھڑک دیا
پہلو میں میرے آلبسا دردِ نہاں کا رقص

ہے "ایڈ" کا لبادہ تجارت کا روپ رنگ
ہر بھیس میں ہیں نت نئے ہتھکنڈے اور ڈھنگ
ہوتی ہیں غرقِ جامِ مئے سب کو پلا کے بھنگ
مشرق میں آکے مغربی قوموں کا ناچ رنگ
بلبل کے آشیاں میں ہے برقِ تپاں کا رقص

ٹپ ٹپ ہے آنسوؤں کی جھڑی سی لگی ہوئی
چنگاریاں ہیں راکھ کے نیچے دبی ہوئی
دو تار کا ہے ساز، رگِ جاں کھنچی ہوئی
عارفؔ ہے رنج و یاس کی محفل سجی ہوئی
لیتا ہے دل میں چٹکیاں دردِ نہاں کا رقص

○

○

چلمن سے تک کے حسنِ نمایاں کی احتیاط — سوجھی ہے بانکپن میں عجب بانکی احتیاط
کون و مکاں کا راز ہے قرآں کی احتیاط — اُس راز کی امین ہے ایماں کی احتیاط
رکھتا جا پھونک پھونک کے اے راہ رو قدم — لازم ہے خار زار میں داماں کی احتیاط
دُرِّ صدف کا بحر کی تہ میں خیال رکھ — کر اندرونِ دل غمِ پنہاں کی احتیاط
سر پہ چڑھے کہ اور بھی شعلہ بھڑک اُٹھے — پروانوں کو تھی شمعِ فروزاں کی احتیاط
آنے دے صبح و شام کی گردش میں انقلاب — ہے کیا ضرور زلفِ پریشاں کی احتیاط
دامن جو تر نہ ہو سکا تھا، چاک ہو گیا — کام آ سکی نہ یوسفِ کنعاں کی احتیاط
جا کر رہے گا خُلد میں بھی حور سے الگ — مہنگی پڑے گی شیخ کو ایماں کی احتیاط

وقتِ جہاد کیسے ہو جام و سبو کا ذکر
عارف بجا ہے آج غزلخواں کی احتیاط

○

عبث ڈھونڈا انہیں سارے جہاں میں — چھپے بیٹھے تھے وہ دل کے مکاں میں
مقدر کو بدل زورِ عمل سے — ملے گا کیا تجھے آہ و فغاں میں
تماشائی بپا کر دیں گے محشر — چھپے کب تک رہو گے لامکاں میں

کسی قابل نہ تھا ناچیز عارف
خدا نے لاج رکھ لی امتحاں میں

○

○

مشتاق اِدھر نظریں، بیتاب اُدھر جلوے — پھر پردہ حائل کیوں، یہ پردۂ حائل کیا
تُو کوششِ پیہم بن موجوں کے تلاطم میں — اے طالبِ آزادی تیرے لئے ساحل کیا
ناکامئ الفت میں مر مر کے جینا سیکھا — آتا جو نہ مرنا بھی، تھا جینے سے حاصل کیا
محرومئ منزل سے حاصل ہو جسے لذّت — ڈھونڈے گا وہ منزل کو آوارۂ منزل کیا

جلوے بھی، تقاضے بھی، دونوں ہیں مکینِ دِل
اب طُور پہ جائے گا عارفؔ تیرا سائل کیا

○

جب وفا ہی نہیں زمانے میں — پھر مجھے آپ سے گِلا کیوں ہو
تُو بھی رکھتا ہے قوّتِ بازو — "غیر کا تجھ کو آسرا کیوں ہو"
بے خطا ہے جو وہ بشر کب ہے — جو بشر ہے وہ بے خطا کیوں ہو
دردِ دِل تھا مِرے مقدّر میں — اِس میں کچھ آپ کی خطا کیوں ہو
یاد ہے سب جو طُور پر گزری — اب تقاضے کا حوصلہ کیوں ہو

جب ہمیں دیکھتا ہے وہ عارفؔ
ہم سے پردوں میں پھر بھلا کیوں ہو

○

منظور زیدی

نام سید منظور آلِ حسین زیدی۔ تخلص زیدی۔ آپ ۱۹۴۰ء میں شہر علی گڑھ میں پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم میرٹھ میں پائی۔ قیامِ پاکستان پر آپ لاہور چھاؤنی میں مستقل طور پر مقیم ہو گئے۔ آپ نے انٹرنس ۱۹۵۶ء میں ایف اے ۱۹۶۲ء میں بی اے، ۱۹۶۴ء میں اور ایم اے ۱۹۶۶ء میں لاہور ہی سے پاس کیا۔

آپ کا خاندان ممتاز علمی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ آپ نے آنکھ کھولی تو گھر کی فارغ البالی کے علاوہ علم و ادب کے لئے بڑا سازگار ماحول تھا۔ شعر و سخن سے فطری لگاؤ تھا۔ بچپن ہی میں شعر کہنے لگے۔ سونے پر سہاگا یوں ہوا صوفی حبیب اللہ صاحب حاوی سے آپ کو شرفِ تلمذ حاصل ہو گیا۔ اُن کی اصلاح نے اُن کے کلام میں اور بھی نکھار پیدا کر دیا۔ اُردو کے علاوہ آپ فارسی میں بھی شعر کہتے ہیں اور نثر بھی خوب لکھتے ہیں۔

اِن دنوں آپ بزمِ معارج اُردو لاہور چھاؤنی کے جائنٹ سیکرٹری بھی ہیں۔

○

موسمِ گل میں اور بہار کا ہوش ‌ ‌ ‌ محوِ حیرت ہے عقلِ زار کا ہوش
اوج پر جب ہو اقتدار کا ہوش ‌ ‌ ‌ ہوش میں رکھیے اختیار کا ہوش
خاکساری ہے اقتدار کا ہوش ‌ ‌ ‌ اوجِ انساں ہے خاکسار کا ہوش
مٹی اڑتی ہے اُن کے کوچہ میں ‌ ‌ ‌ دیکھیے میری خاکِ زار کا ہوش
بیخودی میں ہُوا ہوں گُم ایسا ‌ ‌ ‌ نہ ہے اپنا نہ اپنے یار کا ہوش
دیکھ کر رنگِ عالمِ مانی ‌ ‌ ‌ کیف میں گُم ہے عقلِ زار کا ہوش

بے خودی بے سبب نہیں زیدی
رقص فرما ہے یادِ یار کا ہوش

○

جب نگاہِ مست کا اِک جام پا جاتا ہے دل ‌ ‌ ‌ کیف میں سرشار ہو کر ہوش میں آتا ہے دل
یاس و حرماں، دردِ پنہاں سے جو بھر جاتا ہے دل ‌ ‌ ‌ ڈوب کر بحرِ الم میں پھر اُبھر آتا ہے دل
ہو کے گم راہِ محبت میں سمجھ پاتا ہے دل ‌ ‌ ‌ منزلِ مقصود ملتی ہے جو کھو جاتا ہے دل
یہ امیرِ کارواں ہے حسرت و ارمان کا ‌ ‌ ‌ میں بھی جاتا ہوں اُدھر جس طرف جاتا ہے دل
یاد جب آتی ہے اُن کی سوزِ غم لاتی ہے ساتھ ‌ ‌ ‌ ابر بنتا ہے تصور اشک برساتا ہے دل
گفتگو اُس کے تصور سے تو کرتا ہے ضرور ‌ ‌ ‌ جانے کیا اپنی ہی لے میں اُس سے کہہ جاتا ہے دل
محو ہو کر بارگاہِ ناز میں جاتا ہوں یوں ‌ ‌ ‌ راہ بنتا ہے تصور طور بن جاتا ہے دل

عشق کی تاثیر سے تبدیل ہو جاتا ہے جب
ہو کے بالآخر فنا زیدی نکھر آتا ہے دل

○

لیتا ہے کون اُس کی جفا و عطا کا نام
اہلِ وفا کے دم سے ہے اُس بے وفا کا نام

شوقِ شراب دل میں ہو اور لب پہ اجتناب
زاہد اسی کو کہتے ہیں کیا اتّقا کا نام

اچھے کو اچھا کہنے سے کرتا ہے وہ گریز
رکھا ہے گالی اُس نے ہماری دعا کا نام

اِس سرزمیں میں جذب ہے خونِ شہیدِ ناز
روشن رہے گا اِس سے سدا کربلا کا نام

زیدی کا نام رند سے سُن کر وہ بول اُٹھے
ہاں خوب جانتا ہوں میں اُس پارسا کا نام

وہ قلب قلب نہیں قلبِ کامیاب نہیں
کہ جس میں عظمتِ آدابِ بوتراب نہیں

ملے ہیں جام جو غیروں کو کچھ حساب نہیں
مرے نصیب میں اک بوند بھی شراب نہیں

وہ عشق عشق نہیں جس میں التہاب نہیں
وہ حُسن حُسن نہیں جس میں آب و تاب نہیں

کمالِ حسن ہی خود بن گیا ہے اِک پردہ
تجلّیات ہیں حائل کوئی نقاب نہیں

جمالِ شاہدِ قدرت کا عکس رنگیں ہے
بہارِ حُسنِ چمن پہ کوئی شباب نہیں

وہ ذہن کیا ہے نہ ہو فکرِ ارتقا جس میں
وہ کیا ہے عزم، وفا کو جو دستیاب نہیں

گریز کرتے ہو پینے سے کیوں تم اے زیدی
شراب عشق کی پینے میں کیا ثواب نہیں

ہاں مرا شوریدہ سر جھک کر جہاں رہ جائے گا — کعبۂ مقصود اک بن کر وہاں رہ جائے گا
رُخ اگر بدلا نہ میری گردشِ حالات کا — کھاتے کھاتے چکر اک دن آسماں رہ جائے گا
واعظا اے قلب کو اللہ رکھے برقرار — جگمگاتا عشق کا یہ آسماں رہ جائے گا
یہ سمجھ کر بیٹھ جائیں گے کہ منزل ہے یہی — چلتے چلتے پائے شوق اپنا جہاں رہ جائے گا
آج میرے زورِ سجدہ کی حقیقت دیکھنا — یا جبیں رہ جائے گی یا آستاں رہ جائے گا
ڈھونڈھ ہی لیں گے تجھے مشقِ تصور کی قسم — دیدۂ دل سے بھٹک کر تو کہاں رہ جائے گا
دل کی بربادی پہ دل سے عشق کہتا ہے یہی — غم نہ کر تیری جگہ میرا نشاں رہ جائے گا

صلح ناممکن ہے اے زیدی حریفوں سے مری
یا زمیں رہ جائے گی یا آسماں رہ جائے گا

لوگ قسمت کا جسے زیر و زبر کہتے ہیں — ہم اُسے شوخیٔ اندازِ نظر کہتے ہیں
انقلابات کی زد سے نہ بچے گا کوئی — وقتِ رخصت یہی لمحاتِ سحر کہتے ہیں
ہر نظر پر نظر آتی ہے جنہیں تیری نظر — اہلِ دانش اُنہیں اربابِ نظر کہتے ہیں
بجھ رہی ہے جو شبِ ہجر کی تنہائی میں — مَیں ہوں وہ شمع جسے شمعِ سحر کہتے ہیں
جس میں برباد دیاروں کی جھلک ملتی ہے — اہلِ دل اُس کو محبت کا نگر کہتے ہیں
ہم تو ہر منزلِ دشوار سے ہنس کر گزرے — ہم سفر یہ تو کہیں کس کو سفر کہتے ہیں
کشتیٔ دل سے جو طوفاں کوئی ٹکراتا ہے — ہم اُسے حسن کے جادو کا اثر کہتے ہیں

شامِ غم روئے منور کا تصور زیدی
ہجر والے اُسے قسمت کی سحر کہتے ہیں

شیخ غلام حسین قیصر

ام غلام حسین تخلص قیصر۔ تاریخ پیدائش ۱۴ دسمبر ۱۹۰۳ء آپ ایک ممتاز تعلیم یافتہ خاندان سے تعلق رکھتے
یہ دور میں اس خاندان کے افراد کشمیر کے اعلیٰ حکومتی عہدوں پر فائز تھے۔ انگریزی حکومت کے ابتدائی
ں یہ خاندان کشمیر سے پنجاب آگیا اور اس کے ارکان یہاں حکومت کے مختلف شعبوں میں اعلیٰ عہدوں پر
رہے۔

اپ کی ذہنی تربیت میں گھر کے پاکیزہ اور علمی ماحول کو بہت دخل رہا۔ ابتدائی تعلیم وکٹوریہ ڈائمنڈ جوبلی
ل وزیرآباد میں حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم مرے کالج سیالکوٹ میں پائی اور وہیں سے گریجویٹ ہوتے اس
ر ملازم ہو گئے۔ کچھ عرصہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل رہے۔ مگر طبیعت نے ملازمت کی روائتی پابندیاں قبول
سے ترک کر دیا۔ ۱۹۳۰ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے فارسی کا امتحان پاس کیا۔ اسی سال بمبئی میں
ں کی وکالت شروع کر دی۔ ۱۹۳۵ء میں ایم اے اقتصادیات کی ڈگری لی اور ۱۹۵۰ء میں فائنل
ے اور معاشیات کا امتحان شفیلڈ سے پاس کیا۔

اپ ۱۹۳۹ء میں بمبئی سے دہلی چلے آئے اور ۱۹۴۷ء میں قیامِ پاکستان پر دہلی سے پاکستان میں پہنچ
اپ سرگودھا میں مقیم ہیں اور وکیل ہیں۔

شعر و ادب سے لگاؤ آپ کو بچپن ہی سے رہا ہے۔ آپ اہلِ ذوق اور اہلِ دل ہیں۔ خدمتِ خلق
ا مشغلہ ہے۔

اس وقت تک آپ کا کلام دو مجموعوں "آئینہ دل" اور "نوائے سروش" کی صورت میں شائع ہو کر
وق و نظر سے خراجِ تحسین حاصل کر چکا ہے۔

کس کی آمد سے نکھر آئی ہے گھر کی صورت
نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت

پرتوِ نورِ خدا حسنِ بشر کی صورت
شانِ محبوب درخشاں ہے قمر کی صورت

مئے خوش رنگ کی مستی ہے جنوں کی منزل
ساغرِ دیدۂ پرنم میں گہر کی صورت

نغمۂ و نالۂ جاں سوز سے دل کی رونق
شبِ تاریک کے پردوں میں سحر کی صورت

گرمیٔ خونِ جگر میں ہے بلا کی شوخی
ہے پر و بال میں میرے جو شرر کی صورت

طُور کے جلوؤں کی تابانی میسّر ہو گی
ہے دعاؤں میں مری ایک اثر کی صورت

دردِ دل، سوزِ جگر، جذبۂ الفت قیصر
جلوۂ دید میں پنہاں گُلِ تر کی صورت

جب غم و آلام کی صہبا سے بھر جاتا ہے دل
دل سے گھبراتا ہوں میں اور مجھ سے گھبراتا ہے دل

وہ وفا نا آشنا ہے اور میں مجبور ہوں
میری ناکامی پہ اکثر مجھ کو بہلاتا ہے دل

صدمۂ فرقت سے ہے خاموش سازِ زندگی
ڈوبتی جاتی ہیں نبضیں بیٹھتا جاتا ہے دل

اُن کی یادوں کا تسلسل میرے دل کی روشنی
دِل جلاتا ہے مجھے مجھ سے جلا پاتا ہے دل

ناز بردارانِ حسن و عشق سے یہ پوچھیے
دِل اگر جائے تو کیسے لوٹ کے آتا ہے دل

وعدۂ امروز و فردا آرزوئے خام ہے
اِس تصور سے حقیقت ہے کہ شرماتا ہے دل

چارہ گر تنہائیوں کی سیرت قیصر رہی
آئینہ روشن ہے دل کا جس پہ اتراتا ہے دل

○

جور و جفا ہے جس کی لغت میں ادا کا نام ۔۔۔ میرے لبوں پہ اب بھی ہے اُس بے وفا کا نام

تہذیبِ نو کا پردہ دری ہی شعار ہے ۔۔۔ اب مٹ گیا جہان سے شرم و حیا کا نام

سوزِ دروں نہ شوخیِ حسنِ خیال ہے ۔۔۔ بے مہریٔ صنم ہے کہیں ہے جفا کا نام

پھولوں میں تازگی نہ کوئی رنگ روپ ہے ۔۔۔ خاموشی سحر میں پریشاں صبا کا نام

مرغانِ خوش نوا بھی چمن میں ہیں نغمہ سنج

قیصر کے شعر میں ہے نشہ دوسرا کا نام

○

روزِ ازل سے نہ بچھی رہی تیری رسم و راہ ۔۔۔ اے گردشِ زمانہ کریں کب تلک نباہ

تاریک ہیں فضائیں کوئی روشنی نہیں ۔۔۔ محروم ہو گئے ہیں ضیاؤں سے مہر و ماہ

مردانِ حق پرست کا اونچا مقام ہے ۔۔۔ اُن میں غریب ہے نہ کوئی ہے جہاں پناہ

تیرے کرم سے دیدۂ بینا لیے ہوئے ۔۔۔ ہر شے میں تجھ کو دیکھ رہی ہے مری نگاہ

جوشِ جنوں سے چاک گریباں جو ہو گیا ۔۔۔ اٹھی ادائے ناز کی شوخی سے واہ واہ

سازِ حیات تیری محبت میں نغمہ زن ۔۔۔ اب آرزو کسی کی رہی ہے نہ دل میں چاہ

قیصر۔ بہارِ جلوۂ رنگین ہوا تمام

اے جستجوئے یار نرالی ہے تیری راہ

○

○

خودی میری تبسم ریز آخر سوئے دار آئی — "تماشا کامیاب آیا تمنّا بے قرار آئی"

تڑپ ہے ہر رگِ جاں کی اُسی کا نام تھا رقصاں — کہ جس کے عشق کی مستی میں خوئے جاں نثار آئی

مرے نالوں سے دنیائے خرد پر اک لرزہ تھا — پریشانی ہوس کاروں پہ آئی بار بار آئی

میں سلطانِ محبت ہوں مری سیمائے روشن سے — عیاں ہے سوزِ فطرت کا، جنوں کا حسنِ دارائی

سحر کا نور، پھولوں کی مہک، شبنم کی بیتابی — صبا کی ہر روش صحنِ چمن میں مشکبار آئی

چمک میری نگاہوں سے چرائی چاندتاروں نے — مرے سوزِ نفس سے شب کی زلفوں میں بہار آئی

ابھی تک تیرا قیصرؔ ہے تلاشِ رازداں میں گم
چمن بندی زمانے کی اِسے ناسازگار آئی

○

ہر رگِ جاں کی تڑپ نیزا بنا دیتی ہے — آگہی درد کے شعلوں کو ہوا دیتی ہے

عشق آزارِ محبت نہیں سوزِ دل ہے — یہ جلن وہ ہے جو اکسیر بنا دیتی ہے

گردشِ شام و سحر سیر گئی پیہم سے — اپنے ہنگامے تہِ خاک ملا دیتی ہے

مزرعِ زیستِ ہستی ہے فریبِ دنیا — اپنی آغوش کے فتنوں کو جگا دیتی ہے

جذبۂ جوشِ جنوں چشمِ فسوں ساز سے پوچھ — جو مجھے جامِ مئے ہوش ربا دیتی ہے

دولتِ فقر نے قیصرؔ کو دیا سوزِ حیات
سیرتِ حسن و فا جس کو ضیا دیتی ہے

○

○

مئے حقیقت ہے دل کے شیشے میں جس کی مستی اُبل رہی ہے
دل و جگر کی کشید ہے جو مری نگاہوں میں ڈھل رہی ہے

مری محبت ہے سوز دل کا مجھے ضرورت ہے راز داں کی
چھپا لو دامن میں شمعِ الفت ہوا بہت تیز چل رہی ہے

چراغ جل جل کے عقل و دانش کے رہگذاروں میں بجھ رہے ہیں
ہوس پرستوں کی خام کاری ابھی تو پہلو بدل رہی ہے

تلاش میری فلک کی پہنائیوں میں رقصاں رہی ہے اکثر
ندائے حسنِ ضیائے فطرت مری زباں سے نکل رہی ہے

کمال ہے جستجو کا میری قریب ہو کر خموش ہوں میں
یہ حسنِ پاسِ ادب ہے یا بیخودی ابھی تک سنبھل رہی ہے

وفا شعاری ہے ظرف میرا مری جبیں کو ہے ناز جس پر
رہِ حرم میں قدم قدم پر ہی سجدہ ریزی عمل رہی ہے

نگار خانہ بزمِ ہستی میں کیا، کیا ہے یہ تو نے فیصد مر
برنگِ عیش و طرب متاعِ عزیز انساں کی جل رہی ہے

○

○

ہر کہیں عشق کا آزار نہیں ہو سکتا — ہر کوئی طالبِ دیدار نہیں ہو سکتا

شوخیٔ صورتِ اصنام کو بھی دیکھا ہے — حُسن ہر رنگ میں دلدار نہیں ہو سکتا

پھول کھلتے ہی جہاں لوٹ لیے جاتے ہیں — دردمندوں کا وہ گلزار نہیں ہو سکتا

سوزِ پنہاں سے ہوئی بزمِ جہاں کی تخلیق — یہ وہ جلوہ ہے جو ہر بار نہیں ہو سکتا

مَیں ہوں اظہارِ محبت تری رعنائی کا — میرے جذبے سے تو انکار نہیں ہو سکتا

صورتِ اہلِ نظر سیرتِ قیصر ہو کر
مٹ نہ جائے تو وہ ایثار نہیں ہو سکتا

○

ہر چند کسی شوخ سے شکوے ہیں گلے ہیں
بیمارِ محبت کے مگر ہونٹ سِلے ہیں

گلشن کی بہاروں سے تعلق نہیں ان کا
دِل وادیٔ فرقت ہے نئے پھول کھِلے ہیں

یہ بھی تو کرامت ہے تری مست نظر کی
ساغر مئے اُلفت کے ترے در سے مِلے ہیں

اے نالۂ شب گیر ترا سوز سلامت
قیصر کی وفاؤں کے سکوں بخش صِلے ہیں

○

نوابزادہ یلدرم شرر

نام سید یلدرم مرزا ۔ تخلص شرر ۔ آپ دہلی میں ۱۷ نومبر ۱۹۳۰ء کو پیدا ہوئے اور ایک نواب گھرانے کے
وچراغ ہیں ۔ آپ نواب سید سکندر مرزا کے بیٹے ، نواب سید سلطان مرزا کے پوتے اور نواب سید سردار
اکے پڑپوتے ہیں ۔ نواب سید سردار مرزا کے والد نواب سید حیدر مرزا ایران سے وارد ہند ہوئے
۔ انہوں نے نواب سید فضل علی خاں اعتماد الدولہ وزیر اودھ کی صاحبزادی امراؤ بیگم صاحبہ سے شادی
رر دہلی ہی میں مستقل سکونت اختیار کر لی ۔

آپ کے والد ایران کے بہت دلدادہ تھے ۔ چنانچہ شرر صاحب ابھی چند ماہ کے تھے کہ آپ کے والد
نفریح کے لئے اہل و عیال سمیت ایران تشریف لے گئے ۔ وہاں کچھ عرصہ قیام کرنے کے بعد واپس
ے تو دہلی میں اُن کے حالات نہایت ناسازگار ہو چکے تھے جو سنبھالے نہ جا سکے ۔ پاکستان کا قیام عمل میں
۱۹۴۷ء میں یہ خاندان ہجرت کر کے پاکستان آ گیا ۔ جو تھوڑا بہت اثاثہ دہلی میں تھا وہ بھی وہیں رہ
ور حالات زیادہ خراب ہو گئے ۔

اِن حالات میں آپ نے انٹرنس کا امتحان پاس کر لیا مگر اس سے آگے پڑھائی کا اہتمام نہ کر سکے
فکرِ معاش میں غلطاں ہو گئے ۔ آپ کے اندازِ فکر پر مادی فلسفہ کا گہرا اثر ہے ۔

آپ انجمنِ ترقی ادب ماڈل ٹاؤن کی مجلسِ انتظامیہ کے ایک سرگرم رکن ہیں اور شعر
ے علاوہ مقالے ، افسانے ، مضامین بھی خوب لکھتے ہیں ۔

جس شیشے کو دیکھا وہی ٹوٹا نظر آیا
پھوٹی ہوئی قسمت کا تماشا نظر آیا

ہر دِل میں ٹھکانا مجھے اُس کا نظر آیا
ہر آنکھ کی پُتلی میں وہ پھرتا نظر آیا

اُس راہ میں دل والوں نے آنکھیں بھی بچھائیں
جس راہ سے وہ شوخ گزرتا نظر آیا

اُس زخم پہ ظالم نے لگائے مرے چرکے
جو زخم کہ اُس کو مرا بھرتا نظر آیا

اُس پر سے ہوا صدقے مرا دل بھی جگر بھی
جس آنکھ میں اُلفت کا تقاضا نظر آیا

اُس پر ہی اُٹھی آنکھ ہمیشہ مرے دل کی
کِھلتا ہوا مجھ کو جو شگوفہ نظر آیا

کیا ہے مجھے بتائے کوئی دلبری کا راز
میری تو عاجزی ہے مری بندگی کا راز

جس کی ہے میرے دل کی نگاہوں کو جستجو
وہ ہی ہے میری موت میری زندگی کا راز

اے دوست اب نہ دے تو محبت کے واسطے
اب مجھ پہ کھل چکا ہے تری دوستی کا راز

دیوانگی سے پہلے ہی میں کیوں نہ مر گیا
افسوس راز ہی نہ رہا عاشقی کا راز

اب بھی میں تیرے راہگذر سے گزرتا ہوں
گو مجھ پہ کھل گیا ہے تری بے رخی کا راز

وہ راتیں جن میں چند لئے تھے سکوں کے سانس
اب بنتی جا رہی ہیں مری بے خودی کا راز

○

دامان چاک جیب و گریباں پھٹے ہوئے
اِس حال میں ملا ہے مجھے یار با خلوص

لے ڈوبی ایک دوستی کی آرزو ہمیں
جاں دے دی اُس پہ جس میں ذرا بھی ہوا خلوص

ظلم و ستم ہی سہنے پڑے ہم کو بے شمار
جب تک کسی کے واسطے دل میں رہا خلوص

بے زر ملا کسی سے ہو کس طرح دوستی
بِکتا ہے مول دہر میں انسان کا خلوص

وہ ڈھا رہے تھے ظلم و ستم ہنس رہا تھا مَیں
اُن کی نگہہ میں قہر مرے دل میں تھا خلوص

○

کون چومے گا سرِ رہ ترے قدموں کے نشاں
کون اٹھائے گا بصد شوق جفا میرے بعد

وہ مری قبر پہ آتے ہیں بہاتے آنسو
دے دیا مجھ کو محبت کا صِلا میرے بعد

دل میں حسرت ہی رہی آپ کے آجانے کی
مرگ کا میری تماشا نہ ہوا میرے بعد

○

صاحب عالم خیرالدین خورشید جاہ

نام مرزا خیرالدین تخلص شاد رُخ ۔ القاب صاحبِ عالم، خورشید جاہ ۔ آپ مُغل شاہانِ دہلی کے چشم و چراغ ہیں ۔ آپ کا شجرہ نسب شاہ عالم ثانی سے ملتا ہے ۔ شاہ عالم ثانی کے دو بیٹے تھے ۔ اکبر شاہ اور معظّم بخت ۔ معظّم بخت کے بیٹے مرزا عزیزالدین تھے جنہیں ۱۸۵۷ء کے غدر میں ہڈسن نے گولی مار کر ہلاک کر دیا تھا ۔ مرزا عزیزالدین کے بیٹے مرزا کبیرالدین غدر کے وقت تین سال کے تھے ۔ اُن کی انّا نے اُنہیں اپنا بیٹا ظاہر کر کے بچا لیا ۔ یہ مرزا خیرالدین کے دادا تھے ۔ مرزا کبیرالدین کے بیٹے مرزا فیاض الدین اور مرزا فیاض الدین کے فرزند خیرالدین ہیں ۔ ابھی چند سال ہوئے کہ مرزا فیاض الدین نے لاہور میں انتقال کیا ۔ شہزادہ مرزا فیاض الدین نہایت خوبصورت، سیرچشم، بلند اخلاق، وسیع مشرب کثیرالاحباب، نفاست پسند اور اہلِ ذوق انسان تھے ۔

شہزادہ خیرالدین اپنی آبائی رہائش گاہ رنگ محل، دہلی میں یکم اکتوبر ۱۹۱۴ء کو شہزادی بادشاہ جہاں کے بطن سے پیدا ہوئے ۔ مرکزی حکومتِ ہند نے قاضی عبدالواحد صاحب کیو۔یڑ کو آپ کا گارڈین مقرر کیا ۔ قاضی صاحب ایک متبحر عالم اور اہلِ ذوق بزرگ ہیں ۔ شہزادہ خیرالدین کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی ۔ بارہ سال کے ہوئے تو چیفس کالج اجمیر میں داخل کرا دیئے گئے ۔ جہاں شہزادگانِ ریاستہائے جے پور، جیسلمیر، منی پور، جیند وغیرہ آپ کے ہم سبق اور ہم جلیس تھے ۔ اِس کالج میں انٹرنس کو ڈپلوما کلاس کہا جاتا تھا ۔ شہزادہ خیرالدین نے ڈپلوما کلاس میں کئی مضامین کے نتائج اور تحریر اور تقریر کے مقابلوں میں خاص امتیازی پوزیشنیں حاصل کر کے بے شمار انعامات حاصل کئے ۔ آپ نے اپنی یہ روایت کالج کے درجہ میں بھی قائم رکھی اور انعامات جیتتے رہے ۔ اس کے علاوہ کالج کے ہیڈ پری فیکٹ اور ڈی بیٹنگ سوسائٹی کے سیکرٹری رہے اور کالج میگزین میں بکثرت مضامین لکھتے رہے ۔

کالج ہی کے زمانہ میں آپ نے تین مشہور ہیروں کوہِ نور، دریائے نور اور آرلف پر ریسرچ کر کے ان کی پوری ہسٹری کا سراغ لگایا۔ آپ ۱۹۳۳ء میں وہاں سے گریجویٹ بن کر دہلی واپس آئے اور اپنی اسٹیٹ کے منیجر بنا دیئے گئے۔

ابھی آپ کالج ہی میں تھے کہ ۱۹۳۱ء میں وائسرائے ہند نے آپ کو ہیڈ آف رائل مغل فیملی بنا دیا۔ مغل چیف کے طور پر آپ کو اسلحہ ایکٹ اور عدالت میں حاضری سے مستثنیٰ قرار دے دیا گیا۔ یہ دونوں مراعات آپ کے لئے پاکستان میں بھی بحال رہی ہیں۔

پھر آپ آنریری مجسٹریٹ بنا دیئے گئے اور پی سی ایس کا محکمانہ امتحان پاس کر لینے پر آپ کو درجہ اول کے اختیارات مل گئے۔ کچھ عرصہ آپ دہلی ایڈمنسٹریشن میں راشننگ آفیسر بھی رہے۔

تقسیم ملک پر ۱۹۴۷ء میں آپ کو دہلی سے ہجرت کرنا پڑی۔ پاکستان پہنچنے سے پہلے آپ دہلی کے قلعۂ معلّی میں پناہ گزیں تھے کہ آپ کے گھر لڑکا پیدا ہوا۔ صورتِ حال کی مماثلت کے پیشِ نظر آپ نے اس بیٹے کا نام محمد جلال الدین اکبر رکھا۔ آپ کے یہ صاحبزادہ اس وقت ایف ایس سی کے طالب علم ہیں اور یہ امتحان پاس کرنے کے بعد میڈیکل کالج میں داخلہ لینے کی سوچ رہے ہیں۔

شہزادہ خیرالدین پاکستان آئے تو ماڈل ٹاؤن لاہور میں مستقل سکونت اختیار کی اور اب یہیں آباد ہیں۔ پاکستان میں آپ کی دہلی والی حیثیت برقرار رہی۔ چنانچہ آپ کو فلم سنسر بورڈ، زو کمیٹی، مینٹل ہاسپٹل کمیٹی، امپرومنٹ ٹرسٹ ٹریبونل وغیرہ کا ممبر نامزد کیا گیا۔ خاصی زمین اور جائیداد الاٹ ہو گئی۔

آپ کا بھائی کوئی نہیں۔ بہنیں چار ہیں۔ ان میں سے ایک لیڈی ڈاکٹر ہیں۔ ان کا زیادہ قیام انگلستان میں رہا ہے۔ ایک دوسری بہن لاہور کے ایک مقامی کالج میں لیکچرار ہیں اور ریم اے پی ایچ ڈی ہیں۔ آپ کے چھ بچے ہیں۔ دو لڑکے اور چار لڑکیاں۔ ایک صاحبزادے محمد جلال الدین اکبر کا ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں۔ دوسرے کا نام غلام معین الدین جاوید جاہ ہے۔ یہ ۱۹۴۶ء میں بمقام دہلی پیدا ہوئے اور اب بی اے کا امتحان دے رہے ہیں۔ اس کے بعد لندن سکول آف اکنامکس میں داخلہ لینے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ آپ کی تین چھوٹی صاحبزادیاں ذکاوت جہاں، فصاحت جہاں، نباہت جہاں سکول میں زیرِ تعلیم ہیں۔ بڑی صاحبزادی فضیلت مآب صباحت جہاں نے امسال ہوم اینڈ سوشل سائینسز کالج گلبرگ سے بی ایس سی کا امتحان دیا ہے۔ یہ دہلی میں ۱۹۴۵ء میں پیدا ہوئی تھیں۔ مصوری، افسانہ نگاری ان کے محبوب مشغلے ہیں۔ شعر و ادب سے گہرا لگاؤ ہے۔ اہلِ ذوق ہیں۔ شہزادہ صاحب کے سارے بچے ابھی تک غیر شادی شدہ ہیں۔

صاحبِ عالم خیرالدین خورشید جاہ کا حلقۂ احباب بہت وسیع ہے۔ وسیع مشرب اور وسیع خیال ہیں۔ طبیعت میں مزاح بہت ہے۔ دسترخوان وسیع رکھتے ہیں۔ معاشرتی سرگرمیوں میں خاصا حصّہ لیتے ہیں۔ مطالعہ کا بہت شوق ہے۔ شعر و ادب کے بڑے دلدادہ ہیں اور خود بلند پایہ شاعر ہیں۔ شاعری میں شاہ رُخ تخلص کرتے ہیں۔ نادار اور مستحق شعرا و ادبا کی دامے درمے مدد کرتے رہتے ہیں۔ انجمن ترقیِ ادب ماڈل ٹاؤن کی مجلسِ انتظامیہ کے ممتاز رکن ہیں۔ گزشتہ سال آپ نے شعرائے انجمن میں صحت مند جذبہ مسابقت پیدا کرنے کے لیے اس کے مشاعروں میں بہترین طرحی غزل اور ایک بہترین طرحی شعر کہنے والے شعرا کو انعام کے طور پر کپ اور لفافہ رقوم دیں۔ یہ سلسلہ کئی مشاعروں تک جاری رہا۔

○

ہم کو یہ عظمتِ شاہانہ مبارک باشد
کھل گیا خود درِ میخانہ مبارک باشد

ہائے اِن توبہ شکن کالی گھٹاؤں کا ہجوم
ساقیا! بادہ و پیمانہ مبارک باشد

کس طرح بدلا ہے اندازِ بہاراں اے دوست
بس گیا پھر سے یہ کاشانہ مبارک باشد

کیا کہا تُو نے نہیں توڑا ہے پیمانِ وفا
ہاں تجھے شوخیٔ فرزانہ مبارک باشد

ناصحا تجھ کو مبارک ہو یہ فردوسِ بریں
ہم کو تو محفلِ جانانہ مبارک باشد

اے صبا تُو نے سُنا شور ہے میخواروں میں
کہ خرد لائی ہے نذرانہ مبارک باشد

ہاں بدل ڈال مرا بخت یہ افسردہ دلی
تجھ کو اوصافِ مسیحانہ مبارک باشد

ہائے وہ ناز وہ انداز وہ تیور شاہ رُخ
ہم کو اک لغزشِ مستانہ مبارک باشد

ہنسی کی ہوں یا ہوں رُلانے کی باتیں
یہ سب ہیں مجھے جل میں لانے کی باتیں

وہ کرتے رہے آتے جانے کی باتیں
نہ آئیں زباں پہ ٹھکانے کی باتیں

ہمیں کیا خبر تھی وہ بگڑیں گے ایسے
نہ سمجھے وہ ہنستے ہنسانے کی باتیں

مرادوں کے دن ہیں جوانی کی راتیں
نہ کر ہمنشیں دل ہلانے کی باتیں

محبت کی باتیں جوانی کی باتیں
نہ کر ہمنشیں دل دُکھانے کی باتیں

کبھی ہم سے نفرت، کبھی ہم سے اُلفت
یہ ہیں رنگ اپنا جمانے کی باتیں

سمجھتے تو ہیں تیرے کھُل کھیلنے کو
مگر یہ نہیں لب پہ لانے کی باتیں

چلے غیر کے گھر بہانے بہانے
یہ سب ہیں نیا گُل کھلانے کی باتیں

یہ مانا کہ وعدہ کیا ہے وفا کا
یہ سب کچھ فقط ہیں رجھانے کی باتیں

جو اک بات بھی کہہ نہ سکتے تھے کھُل کر
سُنیں اُن سے ہم نے زمانے کی باتیں

دکھائیں کیسے چھپا کر اپنا سینہ
سنائیں کتنے دل کے آنے کی باتیں

وہی تم نے غمزوں کے نشتر چلائے
وہی تم نے کیں دل جلانے کی باتیں

ہمیں بارہا تم نے جانچا ہے پرکھا
چلو اب تو چھوڑو جلانے کی باتیں

کہو تو سنائیں تمہیں اُن کی بتیاں
ستم کی کرم کی مٹانے کی باتیں

ترے طاقِ ابرو کا نقشہ جو دیکھا
مرے دل نے کیں سر جھکانے کی باتیں

چلو شاہ رُخ میکدے سے اٹھو بھی
کہاں تک یہ پینے پلانے کی باتیں

○

ممتاز رومانی

نام ممتاز علی خان تخلص ممتاز رومانی۔ تاریخ پیدائش ۲ مارچ ۱۹۴۳ء۔ آپ ایک ممتاز اعوان زمیندار گھرانے کے چشم و چراغ ہیں جو دورِ مغلیہ میں دہلی میں مقیم تھا۔ ۱۸۵۷ء کے غدر میں یہ خاندان دہلی سے ہجرت کر کے پنجاب آگیا اور میانوالی میں آباد ہوا۔ اب یہ وہیں آباد ہے اور زمینداری کرتا ہے۔

ممتاز رومانی نے ابتدائی تعلیم مڈل سکول بالا ضلع میانوالی سے پائی اور انٹرنس کا امتحان خالقیہ ہائی سکول سرگودھا سے پاس کیا۔ ۱۹۶۵ء میں امتحان عالم اردو کی سند حاصل کی۔ آپ کا ذریعہ روزگار وثیقہ نویسی ہے۔

شعر و ادب کا ذوق فطری ہے۔ بچپن ہی سے شعر کہتے رہے ہیں اور ۱۹۶۲ء میں شیخ غلام حسین صاحب قیصر سے تلمذ اختیار کیا۔

آپ انجمن ترقی ادب ماڈل ٹاؤن کے ایک سرگرم رکن ہیں اور اس کے طرحی مشاعروں کے لئے باقاعدہ غزلیں لکھ کر ڈاک کے ذریعے بھیجتے رہتے ہیں۔

○

چشمِ گل میں ہے نہاں نورِ سحر کی صورت
دیکھ لیتی ہے جسے اہلِ نظر کی صورت

جب کبھی میرے تصور میں وہ آ جاتے ہیں
روشنی ملتی ہے پھر شمس و قمر کی صورت

آپ کے در کی وہ عظمت کو بھلا کیا جانے
جس نے دیکھی ہی نہیں آپ کے در کی صورت

شہرِ جاناں کی طرف اب مرا دل کہتا ہے
شاید اس سال نکل آئے سفر کی صورت

جو بھی آنکھوں سے تری یاد میں آنسو نکلا
مل گئی اُس کے مقدر کو گہر کی صورت

آج غمخوار جو بیگانوں کے ہیں وہ اپنے
کل تلک ساتھ رہے تیر و نشتر کی صورت

چین ملتا نہیں ممتازؔ کسی صورت بھی
ہو رقیبوں کے تصرف میں جو گھر کی صورت

○

خود کو جب محبوب کے در کے قریں پاتا ہے دل
گلشنِ ہستی کی ہر اِک شے کو ٹھکراتا ہے دل

توڑ دیتا ہے سراسر بندشِ دیر و حرم
جب کسی بت پر، خدا شاہد ہے آ جاتا ہے دل

راز داں میرا ہے یہ اور میں ہوں اِس کا راز داں
دِل کو سمجھاتا ہوں میں اور مجھ کو سمجھاتا ہے دِل

تیرے در پر اے ستمگر خود تو میں آتا نہیں
مجھ کو تو مجبور کر کے کھینچ کر لاتا ہے دِل

زندگی میں اِک مقام ایسا بھی آتا ہے کہ جب
اپنی بے تابی کے قصے سُن کے شرماتا ہے دِل

کیا بتاؤں ہجر کی راتیں ہیں کٹتی کس طرح
خود تڑپتا ہے مجھے بھی ساتھ تڑپاتا ہے دِل

یاد جب ممتاز روحانی کو آتی ہے تری
ڈوبتی جاتی ہیں نبضیں بیٹھتا جاتا ہے دِل

○

ہم جاں بہ تعمیل کریں گے صنم پناہ
اک بار ہم سے آپ بڑھائیں تو رسم و راہ

ہوتی ہیں اور تیز مرے دل کی دھڑکنیں
میری نگہ سے ملتی ہے جب آپ کی نگاہ

میں ہوں قتیلِ شیوۂ لطفِ ستم گری
معلوم ہو سکا نہ مجھے آج تک گناہ

غیروں کو کیا پڑی تھی کہ بنتے وہ غمگسار
جب آپ ہی نہ بن سکے اپنوں کے خیرخواہ

مانیں نہ مانیں آپ کی ممتاز ہے خوشی
اُلفت وگرنہ آپ سے اُن کو ہے بے پناہ

رہِ عشق و محبت میں ملی ہے اُس کو دانائی
کہ حسن کی شوخی و مستی خوشی سے سوئے دار آئی

خرد اپنی نمائش میں ہمیشہ ہوشیار آئی
مگر ناکامیوں کی زد میں دیکھا بار بار آئی

مبارک ہو تمہیں اہلِ چمن فصلِ بہار آئی
لیے دامن میں اپنے رحمتِ پروردگار آئی

مہک پھولوں کی، کلیوں کا تبسم، تازگی دل کی
نسیمِ صبح دامن میں لیے مستِ خمار آئی

جھکی بے ساختہ میری جبینِ ممتاز سجدے میں
تصور میں مرے جب بھی کبھی تصویرِ یار آئی

گلستانِ ہستی میں اکثر انقلاب آتے رہے
پھول کھلتے بھی رہے کھل کھل کے مرجھاتے رہے

خوشنما پھولوں سے اور رخسارِ مغیلاں سے کبھی
ہم چمن زارِ جہاں میں دل کو بہلاتے رہے

زندہ ہوا نے فراقِ یار میں شام و سحر
خونِ دل پیتے رہے لختِ جگر کھاتے رہے

دستِ اُلفت ہم بڑھاتے ہی رہے اُن کی طرف
وہ مگر کچھ سوچ کے ہر بار ٹھکراتے رہے

ظرف تھا ممتاز لاثانی ہمارا اس لئے
ہر قدم پہ ہم فریبِ دوستاں کھاتے رہے

○

اِن حسینوں کی محبت مجھے کیا دیتی ہے — درد اور رنج و الم حد سے سوا دیتی ہے

جو شناسا ہی نہیں اس کو بھلا کیا معلوم — "آگہی درد کے شعلوں کو ہوا دیتی ہے"

آہ جب دل سے نکلتی ہے کسی بے بس کے — کوہ کیا ارض و سماوات ہلا دیتی ہے

کتنی کم ظرف ہے بے درد یہ ظالم دنیا — جو خطاکار نہیں اُن کو سزا دیتی ہے

ہر ادا اُس بتِ طنّاز و حسیں پیکر کی — ایک ہلچل سی مرے دل میں مچا دیتی ہے

عشق کے سوز میں پنہاں ہے وہ مستی ممتازؔ
اچھے اچھوں کو جو دیوانہ بنا دیتی ہے

○

تمہیں مبارک ہو اے زمانے کی گردشو ابھی پھر سنبھل رہی ہے — مری محبت رہِ وفا میں اک اور کروٹ بدل رہی ہے

عجیب حالت ہے شمعِ اُلفت کی بجھ رہی ہے نہ جل رہی ہے — مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے کہ ہجرِ جاناں میں ڈھل رہی ہے

جلایا میں نے ہے اس کو خونِ جگر سے یہ بجھ نہ جائے ہمدم — چھپا لو دامن میں شمعِ اُلفت ہوا بہت تیز چل رہی ہے

وہ چشمِ نرگس، حسین چہرہ کنول سا اور وہ گھنیری زلفیں — جو دیکھتا ہے اُسی کے دل پر چھری محبت کی چل رہی ہے

مرے نشیمن کے چند تنکے کبھی کے اے دوست جل چکے ہیں — نہ جانے پھر آج کیوں گلستاں میں برقِ سوزاں مچل رہی ہے

ستم نئے ڈھا رہے ہیں مجھ پر یہ جن کا مسلک جفا شعاری — دُعا مگر پھر بھی اُن کے حق میں مری زباں سے نکل رہی ہے

ملا نہ ممتازؔ کوئی میکش کہ ظرف جس کا میں آزماتا
وگرنہ شیشے میں میرے دل کے شرابِ اُلفت اُبل رہی ہے

○

سردار خورشید علی

نام سردار خورشید علی خاں تخلص خورشید آپ سردار اشرف علی خاں کے صاحبزادے ہیں۔ آبائی وطن
کابل افغانستان اور مقامِ پیدائش لکھنؤ۔

آپ نے ابتدائی تعلیم مشن سکول قیصر باغ لکھنؤ میں پائی اور ۱۹۱۹ء میں اپنے خاندان کے ساتھ دہلی چلے
آئے۔ کچھ عرصہ دہلی کے عربک سکول میں پڑھتے پھر شملہ چلے گئے اور شملہ سے ورنیکلر فائنل کا امتحان اوّل درجہ
میں پاس کیا۔ شعر و سخن کا بچپن سے ذوق رہا ہے۔ چنانچہ طالب علمی کے زمانہ میں سکول کے مشاعروں میں سرگرم
حصہ لیتے رہے۔ شملہ میں سید ذوالفقار علی صاحب بخاری کے شاگرد رہے۔ اصنافِ سخن میں سے غزل کی طرف
آپ کا زیادہ رجحان ہے۔ زبان سادہ اور الفاظ و معانی عام فہم ہوتے ہیں۔ شملہ کے ایک مشاعرہ میں
غالب مرحوم کی غزل کا مصرع "زباں سخن کے لیے ہے سخن زباں کے لیے" طرح دیا گیا تو اس زمین
میں غزل پڑھی جو بہت مقبول ہوئی۔

۱۹۲۰ء میں علی گڑھ انٹرمیڈیٹ کالج میں داخلہ لیا اور ۱۹۲۱ء میں علی گڑھ کو خیرباد کہا اور فوج
کی ملازمت کر لی۔ آپ کمشنڈ افسر بنا دیئے گئے۔ سیماب اکبرآبادی۔ اصغر گونڈوی۔ جناب ساغر علی گڑھی
جگر مرادآبادی کی صحبتوں سے مستفیض ہونے کے مواقع اکثر و بیشتر ملتے رہے اور علی گڑھ کالج میگزین میں
غزلیں شائع ہوتی رہیں۔ ۱۹۳۳ء میں فوجی ملازمت چھوڑ کر ریاست مانادور چلے گئے۔ اس زمانہ میں
کاٹھیاواڑ کی ریاستوں میں اردو شعروادب کا فقدان تھا لیکن آپ نے محترم عاصم بے پوری سے مل کر وہاں
خوشگوار ادبی ماحول پیدا کر دیا۔ اور مجلس شعروادب قائم ہو گئی۔ پھر آپ ناگرمل چلے گئے وہاں شیخ
[illegible] کے کمانڈر اور ایڈی کانگ مقرر ہوئے۔ شیخ عبدالخالق صاحب خالق والئے ریاست [illegible]

شاعر تھے ۔ خوش تر مانگرول فنوں میاں عباسی اور چند مقامی ادبا کی اعانت سے مانگرول میں بھی بزم شعروادب کا قیام عمل میں لائے ۔ ہز ہائنس مہابت خان والئے ریاست جوناگڈھ کی چھوٹی صاحبزادی بلند پایہ شاعرہ تھیں اور مجلس شعروسخن کی شمع بھی ۔ اسی طرح ہز ہائنس نواب سردار علی خان صاحب آف کروائی اسٹیٹ شعری بھوپالی ۔ عشاق یا پوڑوی مانگرول کے مشاعروں میں شرکت کیا کرتے تھے ۔

قیام پاکستان کے بعد آپ کراچی ، نواب شاہ ، رحیم یارخان ، صادق آباد وغیرہ میں اکثر مشاعروں میں شرکت کرتے رہے ہیں ۔ اب بزم ادب ماڈل ٹاؤن کے ممبر ہیں اور اس کے مشاعروں میں شرکت کرتے ہیں ۔

○

○

جبینِ شوق نذرِ آستاں ہوگی تو کیا ہوگا
تیرے قدموں پہ اے جاناں یہ جاں ہوگی تو کیا ہوگا

سکوتِ اہلِ گلشن میں ہیں بے شک مشکلیں بے حد
زباں جب حالِ دل کی ترجماں ہوگی تو کیا ہوگا

جلا کر خرمنِ دل کو مرے برقِ تبسم سے
نگاہِ لطف پرور مہرباں ہوگی تو کیا ہوگا

حریمِ ناز سے چلمن اٹھا کر دیکھنے والے
نگاہِ شوق میری رازداں ہوگی تو کیا ہوگا

یہاں تکمیلِ ذوقِ بیخودی ہے منزلِ مقصود
خرد کی رہزنی گر درمیاں ہوگی تو کیا ہوگا

ابھی تو نقطۂ دل ہے ہماری ناگہاں الفت
مگر جب یہ مکمل داستاں ہوگی تو کیا ہوگا

غزل لکھنے کو اے خورشید لکھ دی ہے مگر ڈر ہے
کہ وہ مذبوحِ نقدِ شاعراں ہوگی تو کیا ہوگا

○

ہر گام پر ہے گردِ بازار کی طلب
پھر حسن کو ہے اپنے خریدار کی طلب

پھر حسرتوں کو چاہیے صحرا نوردیاں
دیوانگانِ شوق کو ہے خار کی طلب

جیسے کہ اپنے سوزِ الم کا کریں گے مول
یوں کر رہے ہیں ہم کسی بازار کی طلب

پہلے تو وحشتوں کو تھا درکار دشتِ غم
اب دشتِ غم کو ہے کسی گلزار کی طلب

سو بار دل کے شیشہ میں دیکھو جمالِ ناز
زیبا ہے تم کو شوخیٔ دیدار کی طلب

ٹوٹے ہیں کتنے جام و سبو اضطراب میں
ساقی سے پوچھیے کسی میخوار کی طلب

حسرت سے دیکھتے ہیں تمنا کے بام و در
کیسے بتائیں دیدۂ خونبار کی طلب

ہم سے تجلیات کے معمور ہیں جہاں
خورشید ہم ہیں مطلعِ انوار کی طلب

○

○

کائناتِ زندگی زیر و زبر ہوتی نہیں — ہم جہاں ہیں اب وہاں شام و سحر ہوتی نہیں

عشق کہتے ہیں جسے ناکامیوں کا نام ہے — عشق میں تدبیر کوئی کارگر ہوتی نہیں

ہم سمجھتے ہیں کہ آوازِ شکستِ دل ہنوز — کارگر ہوتی ہے لیکن بے اثر ہوتی نہیں

ہر نظر کب دیکھ سکتی ہے ہمارے دل کے داغ — ہر نظر دنیا میں یارو دیدہ ور ہوتی نہیں

اب تو بزمِ زندگی پر چھا رہا ہے اک سکوت — اب نوائے مطربِ دل کارگر ہوتی نہیں

مدتیں گزریں ہیں تیری یاد میں روتے ہوئے — مدتیں گزریں کہ اپنی چشم تر ہوتی نہیں

دیکھئے خورشید کیا منظر ہو اب آفاق کا
خاک کے ذروں پہ تاروں کی نظر ہوتی نہیں

○

داغِ دل بڑھ کر گلستاں ہو گیا — صحنِ گلشن کنجِ زنداں ہو گیا

ایک دل تھا بس انیسِ بیکسی — وہ اسیرِ زلفِ جاناں ہو گیا

موت کا احساس جب پیدا ہوا — مرنا جینے سے بھی آساں ہو گیا

وہ سنے گا کیا ہماری داستاں — وہ ہی باتوں میں پریشاں ہو گیا

انفعالِ جرم ہے وجہِ کرم — حشر میں بخشش کا ساماں ہو گیا

آئے وہ خورشید مجھ کو دیکھنے
درد کا اب میرے درماں ہو گیا

○

نہیں وہ داغِ غم گر دیکھنے دل دیکھنے والے
نہ دیکھیں داغِ مہ بھی ماہِ کامل دیکھنے والے

بنا ہوں پیکرِ حسنِ ازل مشقِ تصوّر سے
مری صورت میں دیکھیں حسنِ کامل دیکھنے والے

جلا کر سوزِ غم میں دل کو اپنے طُور پیدا کر
ارے او طُور پر جلووں کا حاصل دیکھنے والے

جو ہیں پروردۂ طوفاں اُنہیں ساحل سے کیا مطلب
وہ ہیں گرداب میں دامانِ ساحل دیکھنے والے

ترا ذوقِ طلب منزل پہ خود پہنچائے گا تجھ کو
اگر ہمّت ہے تجھ میں خوابِ منزل دیکھنے والے

دمِ نظّارہ تجھ کو امتحانِ ضبط کرنا ہے
ذرا آئیں تو اب میرے مقابل دیکھنے والے

تجلّی گاہِ حسنِ دوست ہے خورشید دِل میرا
کریں تابِ نظر پیدا مرا دل دیکھنے والے

یہ دلبروں کے لیے ہیں نہ مہ وشاں کے لیے
تمام رنج ہیں عشاقِ خستہ جاں کے لیے

شہیدِ تیغِ ادا ہو کے جاوداں ہو جا
تڑپ رہا ہے عبث عمرِ جاوداں کے لیے

سمجھ کے توڑنا گلہائے باغ اے گلچیں
بہارِ عالمِ ہستی ہے امتحان کے لیے

کبھی بنیں گے یہی برقِ صد نشیمن سوز
جو تنکے لائے ہیں چُن چُن کے آشیاں کے لیے

وفورِ شوق میں ہم ایسے ہو گئے بیخود
ہزار بوسے تکیر سنگِ آستاں کے لیے

مرا نصیب، نہیں آپ پر کوئی الزام
ستم ہے میرے لیے اور کرم جہاں کے لیے

نہ چہچہے نہ ترانے، نہ زمزمہ خوانی
نوائے غم ہے فقط فکرِ نکتہ داں کے لیے

یہ بدگمان زیادہ ہے اُن سے بھی خورشید
نکالیے کوئی تدبیر پاسباں کے لیے

شاداب دہلوی

نام مرزا محمد اسحاق بیگ، تخلص شاداب۔ دہلی کے رہنے والے ہیں۔ آج سے تقریباً چالیس سال قبل اپنے مغل کے گھر محلہ شاہ گنج دہلی میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد مرزا ولی محمد دہلی ٹراموے کمپنی میں ایک ٹیکنیکل آسامی پر فائز تھے اور چار سو روپے ماہوار تنخواہ پاتے تھے۔ اُن کا آبائی مکان دہلی کے کوچہ پنڈت میں تھا۔ تعلیم کے لئے شاداب صاحب کو پرائمری سکول میں داخل کیا گیا۔ آپ نے چار جماعتیں پاس کی تھیں کہ والد کا انتقال ہو گیا جس پر تعلیم ختم کر دینی پڑی اس وقت آپ کی عمر بارہ برس تھی۔ مزید علمی استعداد گھر پر مطالعہ سے حاصل کی شعر کہنے کا شوق بچپن ہی سے تھا۔

۱۹۴۷ء کے ہنگامے میں آپ کا محلہ زیرِ تاخت و تاراج آیا تو آپ کی والدہ شاداب صاحب اور اُن کے بہن بھائیوں سمیت مقبرہ ہمایوں میں پناہ گزیں ہو گئیں۔ ایک مہینہ بعد بمشکل یہ گھرانا پاکستان پہنچ سکا۔ شاداب صاحب کی چھوٹی ہمشیرہ کی شادی قیامِ پاکستان سے پہلے لاہور چھاؤنی میں ہو چکی تھی اس لئے پاکستان میں وارد ہونے کے بعد یہ گھرانا لاہور چھاؤنی ہی میں مستقل طور پر بس گیا۔ شاداب صاحب دو سال شدید بیمار رہے۔ تندرست ہونے پر ایک خراد کی مشین پر ملازم ہوئے۔ ۱۹۵۹ء میں ان کا ایک ہاتھ مشین کی لپیٹ میں آکر ٹوٹ گیا۔ مشین کے مالک نے نوکری سے جواب دے دیا۔ اس کے بعد دو چار جگہ پر عارضی ملازمت کی مگر کسی جگہ پاؤں نہیں جم سکے۔

اب ایک پُرگو شاعر ہیں۔ مشاعروں میں بکثرت شریک ہوتے ہیں اور کلام ترنم سے پڑھتے ہیں۔

پروردگار رحمتِ باراں گیا پلٹ
وہ برق و باد اور وہ طوفاں گیا پلٹ

گُلِ پیرہن بنا کے پہنا گلے میں ہار
تقدیرِ گل جو چمکی گلستاں گیا پلٹ

افسانۂ حیات مکمل نہ کر سکا
راہوں سے زیست کی میں ہراساں گیا پلٹ

تُو نے سُنی نہ بات یہ اب تک ملال ہے
در تک میں تیرے آ کے مِری جاں گیا پلٹ

تم دُور تھے تو تھی مری افسانہ زندگی
تم پاس آ گئے تو یہ عنواں گیا پلٹ

جھونکے بتا رہے ہیں نسیمِ بہار کے
اب کے برس بہار کا ساماں گیا پلٹ

اب وہ حسین صُورتیں بھی خواب ہو گئیں
مدت ہوئی کہ شہرِ نگاراں گیا پلٹ

جل بُھن کے چند تنکے نشیمن کے رہ گئے
یہ کیا ہوا نظامِ گلستاں گیا پلٹ

پیری میں اب شباب کی باتیں کہاں نصیب
آئی خزاں تو رنگِ بہاراں گیا پلٹ

میرے غریب خانے پہ تشریف لائیے آپ
رنگِ غریب خانۂ ویراں گیا پلٹ

کچھ اس طرح سے رنگ جمایا بہار نے
شاد اب اپنی زیست کا عنواں گیا پلٹ

○

ہے روز و شب کے تقاضوں میں انتظار کی بحث — کریں گے ہم سے کسی دن تو وہ قرار کی بحث
مباحثہ ہوا محفل میں اور خوب ہوا — مباحثے میں ہوئی دل کی جیت ہار کی بحث
وہ آنکھوں آنکھوں میں اظہارِ عشق کرتے رہے — بڑے مزے میں ہوئی میرے اُن کے پیار کی بحث
بچانا چاہا مگر دل کو میں بچا نہ سکا — اُلجھ گئی ہے تری زلفِ مشکبار کی بحث
ترے حسین تصور کی یادگار ہے دل — حسین لفظوں میں ہوتی ہے یادگار کی بحث

اڑا کے لائی ہے خوشبوئے زلفِ یار یہاں
صبا نے چھیڑ دی شاد آپ نے لفِ یار کی بحث

○

ہوا ہے کوئی نہ ہوگا یزید سا گستاخ — اُسی کو کہتے ہیں اہلِ جہاں بڑا گستاخ
حسینؓ ابنِ علی کو شہید کر ڈالا — زمینِ کرب و بلا پر تھے اشقیا گستاخ
حسینؓ کہتے تھے مشکل ہے بیعتِ مسلم — وہ جانتے تھے کہ ہے شمرِ بے حیا گستاخ
گلے کو تیروں سے اصغر کے کر دیا چھلنی — نہ بخشا جائے گا بدکار حرملا گستاخ
ردائے زینب و کلثوم چھین لی ہائے — یہ بی بیوں پہ کیا ظلم ناروا گستاخ
ترے ارادوں کو پامال کر گئے ہیں حسینؓ — ملے گا تجھ کو کہیں بھی نہ آسرا گستاخ

ہمیں حسینؓ ہی شاد آپ بخشوائیں گے
ذلیل ہوگا جہاں میں حسینؓ کا گستاخ

○

آئیے آجائیے اب تو نگاہ و دل کے پاس
پا لیا ہے میری نظروں نے تمہیں منزل کے پاس

قافلے والو نہ پوچھو راہ کی دشواریاں
بات منزل کی کریں گے اب تو ہم منزل کے پاس

دل کے دھوکے میں نہ آ مانوس ہے قاتل سے دل
دل کو جانے دے اگر جاتا ہے یہ قاتل کے پاس

کیا خبر تھی انقلاب ایسا بھی آئے گا کبھی
کشتیاں سب ڈوبتی دیکھیں گے ہم ساحل کے پاس

ختم نہیں ہوتی حقیقت کوشش یادوں کی حبیب
کون ٹھہرا ہے بھلا اب تک کسی باطل کے پاس

حوصلے ہوں پست اے شاداب جن کے بے سبب
وائے ناکامی پہنچ سکتے نہیں منزل کے پاس

ساغر بھی میرے ہاتھ صراحی بھی میرے پاس
پھر بھی بھڑک رہی ہے مرے دل کی آج پیاس

رونا ہمارا بھی تو کوئی بے سبب نہیں
روتے ہیں اس لئے کہ نکل جائے گی بھڑاس

بیٹھے ہیں ان کی نظروں سے نظریں ملائے ہم
صورت شناس ہم ہیں تو ہم ہی سخن شناس

تم کو غرور اور ہمیں صبر چاہیئے
تم کو ہے ناز حسن پہ ہم کو وفا کا پاس

سب اجنبی نہیں ہیں مری بزم شوق میں
صورت شناس کچھ ہیں تو کچھ ہیں سخن شناس

اتنا پتہ ہے بحر حوادث میں ناخدا
کشتی ہماری ڈوبی ہے ساحل کے آس پاس

وہ دن بھی تھے کہ ہم سے تھی زیبائش چمن
مدت ہوئی قفس کی ہوا آ گئی ہے راس

دنیا کی تلخ باتوں سے پرہیز چاہیئے
شاداب ایسی بات کرو جس میں ہو مٹھاس

شمع محفل میں جل بجھی خاموش — دور تک یوں ہے روشنی خاموش

میں وہاں سے گزر رہا ہوں جہاں — زندگی کی ہے زندگی خاموش

دے رہی ہیں پیامِ اُلفت کا — اُن کی نظریں جھکی جھکی خاموش

آس کہتی ہے آ گئی منزل — یاس کہتی ہے پر ابھی خاموش

عشق ہے کوئی دل لگی تو نہیں — بند کر منہ، لبوں کو سی خاموش

اک تیرے دیکھنے کی حسرت میں — پھر رہے ہیں گلی گلی خاموش

جاننے والے ہنستے بولتے ہیں — بیٹھے رہتے ہیں اجنبی خاموش

تم نے پوچھا نہ مدعا دل کا — عمر ساری گزر گئی خاموش

شمع محفل میں حالِ پروانہ — کہتے ہی کہتے ہو گئی خاموش

جیسے مجھ کو بلا رہا ہو کوئی — اک صدا ہے دبی دبی خاموش

کیسی شاداب ہے زباں بندی — گلستاں میں ہے ہر کلی خاموش

تم نے پوچھا کبھی سبب اِس کا

کیوں ہے شادابِ دہلوی خاموش

سرکارِ دو عالم ہیں حسینوں کے حسیں خاص
اُن سا کوئی ہو سکتا کہیں بھی تو نہیں خاص

سجدے میں ہے سر میرا میں ہوں خاک نشیں خاص
جھکتی ہے جو اُس در پہ وہ ہوتی ہے جبیں خاص

فرصت جو غمِ دل سے ملی باغِ جہاں میں
ڈھونڈیں گے کہیں کوئی مکاں خاص مکیں خاص

یہ دیکھ کہ اب کتنے طلب گار ہیں تیرے
دل خاص، جگر خاص، نظر خاص، جبیں خاص

اس طرح تیرے تیر کو دل میں کیا مہماں
جس طرح کہ ہوتا ہے انگوٹھی میں نگیں خاص

تم زلف سنوارو تو سنور جاتا ہے عالم
کہتے ہیں تمہیں لوگ سبھی ماہِ مبیں خاص

ہر اہلِ بصیرت ترے مشتاقِ نظر تھے
جلوہ ترا دیکھا ہے کہیں عام کہیں خاص

آئینِ محبت پہ ذرا غور کریں ہم
آؤ نہ کہیں تم سے کریں بات کہیں خاص

شاد آب حسینوں کا وہ عالم کوئی دیکھے
ہوتے ہیں جہاں مل کے حسیں جبیں بہ جبیں، خاص

رکھتا ہے کون درد کے ماروں سے ربط ضبط
کرتے ہیں لوگ یاروں بہاروں سے ربط ضبط

مل بیٹھنے کا موقع جہاں بھی ہوا نصیب
ہم نے کیا ہے یاروں کے یاروں سے ربطِ ضبط

اک دو پہ ہی نہیں ہیں تیری مہربانیاں
تیرا ہر اک سے میل، ہزاروں سے ربط ضبط

دَورِ بہار میں بھی خزاں کا ہے شک ہمیں
دَورِ خزاں کو بھی ہے بہاروں سے ربط ضبط

دن کو تو ہم فراق کی گھڑیاں گنا کریں
رکھتے ہیں شب کو چاند ستاروں سے ربط ضبط

ڈر ہے کہ جل نہ جائے کہیں دامنِ اُمید
اک دل کی آگ کا ہے شراروں سے ربط ضبط

شاد آب ربط ضبط کریں اہلِ دل سے آپ
کیوں کر رہے ہیں آپ غباروں سے ربط ضبط

○

محفل کے ہر نشیب کی ہے راز دار شمع
پروانوں کے لئے نہیں اب بیقرار شمع

پروانے کے نصیب میں جلنا تھا جل گیا
جلنے سے اُس کے ہو گئی کچھ تابدار شمع

میرا نصیب میرا مقدر ہے تیرے ہاتھ
رودادِ زندگی کی ہے آئینہ دار شمع

میں روشنی حیات کی اک تجھ سے پا سکا
میری حیات کی ہے تو ہی پاسدار شمع

شامِ الم گمان ہوا آفتاب کا
دیکھ تو اِک مقام پہ تھی جلوہ بار شمع

دن کے اُجالے بخشتے ہیں روشنی تجھے
راتوں کو نور بخشتی ہے بیقرار شمع

اے شمع تو ہی جانتی ہے میرا حالِ دل
دردِ شبِ فراق کی ہے رازدار شمع

شادآب گلستاں میں نشیمن بنائیں گے
روشن کریں گے صحن میں ہم بہ بہار شمع

○

اک فسانہ ہے بیکسی کا چراغ
غم سے روشن ہے زندگی کا چراغ

جی رہا ہوں تری خوشی کے لئے
زندگی ہے تری خوشی کا چراغ

ہر قدم پر مری نگاہ میں ہے
آرزوؤں کی آگہی کا چراغ

ان چراغوں میں ہی ملے گا تجھے
فتح و نصرت کا رہبری کا چراغ

مَیں گدا ہوں فقط ترے در کا
تو ہے اور تیری بندگی کا چراغ

ہے حقیقت میں دستِ یزداں میں
آدمی اور آدمی کا چراغ

دیکھ کر تیرا عزم و استقلال
جگمگانے لگا خوشی کا چراغ

اب چراغِ وفا جلاتا چل
سامنے رکھ کے تو خوشی کا چراغ •

ہر گلِ تر نظر میں لے شادآب
ہے مری ایک تازگی کا چراغ

یا الٰہی نہ بجھے قلبِ پریشاں کا چراغ / اِس میں روشن ہے ترے تابعِ فرماں کا چراغ

ذرّہ ذرّہ تیری قدرت کا تماشائی ہے / ذرّے ذرّے میں نظر آتا ہے یزداں کا چراغ

روشنی اس کی ہواؤں سے بڑھا کرتی ہے / تیز جھونکوں سے بھی بجھتا نہیں ارماں کا چراغ

جس کی تابش سے ہے اے دوست دو عالم پُرنور / کعبۂ دل میں ہے اُس مردِ مسلماں کا چراغ

اِک چمک عظمتِ انساں کا پتا دیتی ہے / جگمگاتا ہے یہاں عظمتِ انساں کا چراغ

تم ملے، پیار ملا، گوہرِ مقصود ملا / ہے شبِ تار میں روشن دلِ سوزاں کا چراغ

اُن سے ملنا بھی تو اِک تازگیٔ ایماں ہے / میرا ایماں ہے یہی ہے مرے ایماں کا چراغ

جیسے اب منزلِ مقصود پہ آپہنچا ہوں / کچھ سہارا مجھے دیتا ہے شبستاں کا چراغ

اُن کی آنکھوں میں جو شاداب مری عزت ہے
آبرو پاتا ہے یوں بزمِ غریباں کا چراغ

جب تصور میں کوئی آکر لُبھا جاتا ہے دِل / شاد ہوتی ہیں نگاہیں جگمگا جاتا ہے دل

سجدۂ شکرِ الٰہی یوں بجا لاتا ہے دِل / آبرومندانہ آنکھوں میں جگہ پاتا ہے دِل

چشمِ ساقی سے جو ہوتا ہوں کبھی میں فیضیاب / شادمان و کامران ہو کر بہل جاتا ہے دل

حُسن کو بھی عشق کا دمساز ہونا چاہیئے / یوں سمانے کو تو کانٹوں میں سما جاتا ہے دل

دھڑکنوں میں دل کی جب محسوس ہوتی ہے کمی / ڈوبتی جاتی ہیں نبضیں بیٹھتا جاتا ہے دل

دیکھتے ہی دیکھتے شاداب کِھلتے ہیں کنول
اِس نوازش سے مہِ کامل بنا جاتا ہے دل

○

کس طرح تجھ کو بھلا دیں عظمتِ شاہانہ ہم
کل نہ ہم افسانہ تھے اور آج ہیں افسانہ ہم

کر رہے ہیں یاد پھر بھولا ہوا افسانہ ہم
سارے عالم سے نہ ہو جائیں کہیں بیگانہ ہم

کام میں لائیں گے اب تو جراتِ رندانہ ہم
اُن کے ہاتھوں سے پئیں گے چھین کر پیمانہ ہم

جادۂ عمرِ رواں کو جگمگانے کے لئے
برق سے کرتے ہیں روشن بزم ماتم خانہ ہم

بزمِ عالم سے اندھیرا دور ہوتا جائے گا
شمع تم بن جاؤ تو بن جائیں گے پروانہ ہم

کیا نہیں ہیں ہم، ہمیں ہم ہیں جدھر بھی دیکھئے
شمع ہم، پروانہ ہم، دیوانہ ہم، فرزانہ ہم

وصل کی وہ رات جس میں دل کو حاصل ہو قرار
کہہ رہے ہیں آج پھر اک رات کا افسانہ ہم

کروٹیں بدلا کیا ہے رات بھر بیمارِ غم
دیکھا کئے اک رات کا افسانہ ہم

اِک نگاہ لطف کی تھی صرف دل میں آرزو
عشق کی رَو میں چلے آئے ہیں بیتابانہ ہم

کیوں نہ ہو شاداب پھولوں کا چمن اے گلبدن
آ گئے ہیں جب چمن میں نرگسِ مستانہ ہم

○

کودا جو بحرِ عشق میں لے کر خدا کا نام
روشن ہوا ہے دہر میں اُس باوفا کا نام

یہ اور بات ہے کہ میں اُس کو نہ آؤں یاد
اب تک مری زباں پہ ہے اُس بے وفا کا نام

ترتیب دے رہا ہوں فسانہ بہار کا
تجویز کر رہا ہوں مَیں فکرِ رسا کا نام

تم ہی کہو بتاؤں تو میں کیا بتاؤں اب
اِک آشنا نے پوچھا ہے اِک آشنا کا نام

فانی ہر ایک چیز ہے اِس کائنات کی
باقی اگر رہے گا تو بس اک خدا کا نام

مجبور ہو کے کہتے ہیں الحمد شکریہ
ناکامیوں کو دیتے ہیں صبر و رضا کا نام

(بیادِ دَرؔد مراد آبادی مرحوم)

وہ درد مند دَرؔد ہے نقشِ وفا کا نام
جس نے قضا سے پوچھا ہے اپنی بقا کا نام

وہ فخرِ انجمن تھے کہ ہے انجمن کو ناز
سرگرم کارکن کو ملا ہے بقا کا نام

اے موت تو نے کر دیا کیوں دَرؔد کو جُدا
دنیا سے کیوں مٹا دیا درد آشنا کا نام

یارب عطا ہو جنّتِ فردوس میں جگہ
اپنی دعا کو دیتا ہوں تیری عطا کا نام

شاؔد آپ دَرؔد راہیِ ملکِ عدم ہوئے
روشن دلوں میں کر گئے اپنی وفا کا نام

○

اُنہیں پسند جو حالِ دلِ خراب نہیں — یہ وہ سوال ہے جس کا کوئی جواب نہیں
نظر وہ کب ہے کہ جو ڈھونڈتی نہ ہو اُن کو — وہ دل ہی کب ہے کہ جس دل میں اضطراب نہیں
مجھے یہ زعم ترے دل میں میری یاد تو ہے — یہ اور بات کہ محفل میں انتخاب نہیں
مری نگاہ میں عظمت ہے اُن سوالوں کی — تری نگاہ میں جن کا کوئی جواب نہیں
تمہارا جلوۂ رنگیں تو چار جانب ہے — ہماری چشمِ نظارا ہی کامیاب نہیں

ہر اک بشر ہے شرفیاب فیضِ ساقی سے
وہ خوش نصیب نہیں ہے جو فیضیاب نہیں

○

ملتفت کیوں نگاہِ یار نہیں — کیا مرے دل پہ اعتبار نہیں
میرا دل بھی تو اب نہیں میرا — مجھ کو اب دل پہ اختیار نہیں
جلوۂ حسنِ ماہِ دو عالم — کون سی شے سے آشکار نہیں
آدمیت وہاں کہاں ملتی — آدمی کا جہاں وقار نہیں
کر دیا اِک نگاہ نے مدہوش — میں خبردار و ہوشیار نہیں
کیا ہوا آج بزمِ ساقی میں — مے تو ہے کوئی میگسار نہیں
کس سے کہتا ئیں حالِ دل اپنا — غم تو ہے کوئی غمگسار نہیں
میرے سینے میں دل تڑپتا ہے — یہ تمہارا تو راز دار نہیں

ہم نے شاداب دیکھا گلشن میں
دامنِ گل میں کوئی خار نہیں

○

○

اے دوست اب قریب سے بھی تُو قریب ہو
دِل کو قرار ہو تری قربت نصیب ہو

وہ آدمی ہے کام کا چاہے غریب ہو
اے دوست جس کو تیری محبت نصیب ہو

مَیں اُن کے سامنے ہوں بڑا خوش نصیب ہوں
تم میرے سامنے ہو بڑے خوش نصیب ہو

مَیں تم سے کتنا دور رہوں کتنا قریب ہوں
تم مجھ سے کتنے دُور ہو کتنے قریب ہو

دردِ غمِ فراق کو نسبت تمہیں سے ہے
تم میرے چارہ ساز ہو میرے طبیب ہو

ہر ذرہ ہے لئے ہوئے اَوجِ سکندری
اُن کو پسند ہی نہیں کوئی غریب ہو

تقسیم کر رہے ہیں وہ خیراتِ حُسن کی
اے آرزوئے شوق تو بڑھ کر قریب ہو

شادؔاب! راہِ عشق و وفا میں بڑھے چلو
یہ سوچنا غلط ہے کہ منزل قریب ہو

○

جو الم سہتا ہو لیکن منہ سے کچھ کہتا نہ ہو
کیسے ہو سکتا ہے یہ وہ آدمی اچھا نہ ہو

آپ کا چاہا ہو لیکن اب مرا چاہا نہ ہو
کاتبِ تقدیر نے قسمت میں یہ لکھا نہ ہو

اِن حسینوں کی جفاؤں سے نہ گھبرا صبر کر
اِن حسینوں نے تجھے شاید ابھی جانا نہ ہو

راہِ اُلفت سے بدل جانا ہے جرمِ عاشقی
اے حقیقت کوشِ الفت میں کبھی ایسا نہ ہو

آج میخانے میں جی بھر کے پیو اے میکشو
حکم ساقی ہے کہ محفل میں کوئی پیاسا نہ ہو

اس قدر پی ہے کہ اب بیگانۂ ہستی ہوں مَیں
توڑ دوں جام و سبُو ساقی کہیں ایسا نہ ہو

آستاں پر اُن کے سر ہے عرش پر ہے یوں دماغ
سامنے ہوں وہ مرے دنیا و مافیہا نہ ہو

عکس اُن کا دل کے پیمانے میں آتا ہے نظر
دل کے پیمانے کا بھی شادؔاب اندازا نہ ہو

○

○

اِسی دردِ عشق سے ہے مرا حال عاشقانہ — تمہیں یاد ہے حقیقت مجھے یاد ہے فسانہ
جو جگر ہے چاک گُل کا تو کلی کلی فسردہ — کہ بہارِ گُل جو آئی تو بدل گیا زمانہ
جو قدم بڑھائے میں نے ملا مجھ کو میرا کعبہ — جو قریب آئی منزل مجھے مل گیا ٹھکانہ
یہ شرابِ ناب ہی تھی ہوا غم غلط جو میرا — کہ غموں سے چُور تھا میں ملا جینے کا بہانہ
میرا غم ہوا نہ افشا تھا یہی خیال مجھ کو — جو چھلک پڑا یہ دریا تو کہاں مرا ٹھکانہ

اِسی درد کی بدولت نئی زندگی ملی ہے
کوئی پیار بن کے آیا مرے دل میں غائبانہ

○

تری تلاشِ و تجسس یہاں وہاں ہے ابھی — خدا ہی جانے کہ اے دوست تُو کہاں ہے ابھی
بہت نحیف ہے کمزور و ناتواں ہے ابھی — مگر خیال کی وسعت میں تو جواں ہے ابھی
ترے خیال میں شاید سما رہا ہوں میں — یہی خیال ہے مجھ کو یہی گماں ہے ابھی
پلائے جا مرے ساقی تجھے خدا کی قسم — خیالِ سُود نہ اندیشۂ زیاں ہے ابھی
جو لکھ دیا ہے ازل سے وہ ٹل نہیں سکتا — جو نوحہ خواں تھا ابھی تک وہ نوحہ خواں ہے ابھی
تمہارے در پہ ہزاروں پناہ ڈھونڈتے ہیں — تمہیں تصورِ بیگانگی کہاں ہے ابھی

تمہیں گزرنا ہے احساس کی نگاہوں سے
یہ ہے خیال کہ شاد آب امتحاں ہے ابھی

○

○

جلوہ فرمائی بھی ہے انجمن آرائی بھی — بزم میں اہلِ نظر بھی ہیں تماشائی بھی

ہاں بجا ہے کہ بہاروں کے پیمبر ہم ہیں — ہم جو آئے تو گلستاں میں بہار آئی بھی

حسن والو ذرا تم ایک نظر تو دیکھو — عشق کی کچھ تو کرو حوصلہ افزائی بھی

میں تری یاد میں دنیا کو فراموش کروں — دیکھ لے دوست مرا صبر، شکیبائی بھی

جی رہا ہوں میں فقط تیری تمنا کے طفیل — لوگ کہتے ہیں مجھے تیرا تمنائی بھی

ہم نے شاداب وہ لمحات غنیمت جانے
جب خیالات نے لی ذہن میں انگڑائی بھی

○

مرے کاشانۂ دل میں جو تم آئے بہار آئی — مبارک باد دینے رحمتِ پروردگار آئی

ہر اک غنچہ پکار اٹھا مبارک ہو مبارک ہو — تماشا کامیاب آیا تمنا برقرار آئی

نگاہیں جگمگا اٹھیں ہوئے قلب و جگر روشن — تجلی اُن کے رُخ کی بن کے ہر دل کا قرار آئی

تمہاری یاد میں ہر گام پر محفل سجا بیٹھے — تمہاری یاد بن کر بے قراروں کا قرار آئی

محمد مصطفےٰ صلِ علیٰ کی شانِ یکتائی — بفضلِ کردگار آئی بہ عزم و اختیار آئی

پیامِ صبح دیتی ہی رہی اُس کی وفاداری — تمنا پھول کی لے کر کلی جو بے قرار آئی

قفس کو لے کے اُڑ جاؤں گا تم یہ دیکھنا ہمدم — چمن میں بھولے بھٹکے سے اگر اب کے بہار آئی

گلستاں میں مرا ہونا بھی اے شاداب لازم تھا
کہ میرے دم قدم سے ہی گلستاں میں بہار آئی

○

میں دل پہ بھروسا کرتا ہوں دل مجھ کو رسوا کرتا ہے ہر گام پہ دھوکا دیتا ہے ہر گام پہ دھوکا کرتا ہے

خوابوں کی دنیا میں اکثر ملنے کا وعدا کرتا ہے جب سامنے میں آجاتا ہوں وہ مجھ سے پردا کرتا ہے

رنگین فضا ہو جاتی ہے اس طرح اشارا کرتا ہے خاموش نگاہوں سے کوئی اظہارِ تمنا کرتا ہے

اُمید پہ دنیا قائم ہے امید بھی بر آجائے گی رفتہ رفتہ سب کچھ ہوگا کیوں دل کو میلا کرتا ہے

شاداب نظامِ گلشن میں اُس وقت ترقی ہوتی ہے
گلشن میں جو گل کھلتا ہے کوئی وہ رنگت بدلا کرتا ہے

مسکرا کر وہ ہر اک غم کو بھلا دیتی ہے اِک تجلی ہے کہ جو ہنسنا سکھا دیتی ہے

شب کی تنہائی ہے یا قہر و بلا کی دنیا حسرتوں میں مری اندھیر مچا دیتی ہے

پھر بہاروں کا سناتی ہے صبا مژدہ مجھے دِل کی دھڑکن تری آمد کا پتا دیتی ہے

تیرے غم کو جو میں سینے میں چھپا لیتا ہوں آگہی درد کے شعلوں کو ہوا دیتی ہے

جانتی ہے ترا پیغام اناالحق دنیا دار پر بھی ترا پیغام سُنا دیتی ہے

اُس کی رحمت جو کبھی جوش میں آجائے تو پھر
دِل کے ہر غنچے کو شاداب کِھلا دیتی ہے

○

غبار راہوں سے چھٹ رہا ہے کہ شاخ اُمید پھل رہی ہے
چمن میں ہر سو پھیل پھل ہے صبا بھی مستانہ چل رہی ہے
اب آ تم بھی جاؤ نظر ہے بلے چین زلیست ساری نکھل رہی ہے
جو شمع دل میں جلا گئے تھے وہ آج تک دل میں جل رہی ہے
حجاب کوئی نہیں ہے باقی ہے سامنے میرے میرا ساقی
مئے محبت چھلک چھلک کر ہر ایک ساغر میں ڈھل رہی ہے
زمانے بھر کی زبان پر اب یہ میرے اُن کے جو تذکرے ہیں
خدا ہی جانے جو منہ سے نکلی کہاں کہاں بات چل رہی ہے
جہاں بھی نقشِ قدم ملا ہے وہیں کیا مَیں نے ایک سجدہ
تمہاری یادوں کے مَیں تصدق حیات پہلو بدل رہی ہے
جنوں نوازوں نے جان دے کر جہاں میں پائی ہے سر بلندی
خودی بشکلِ عمل رہی تھی خودی بشکلِ عمل رہی ہے
یہ میری ہمت یہ میری جرأت کہ ایک طوفاں سامنے ہے
بڑھا چلا جا رہا ہوں آگے ہر اک بلا سر سے ٹل رہی ہے
یہی ہے عکسِ رُخِ حقیقت اسی سے روشن ہے اپنی عظمت
چھپا لو دامن میں شمعِ الفت ہوا بہت تیز چل رہی ہے
مَیں اُن کے جلوؤں کی ایک رنگیں فضا میں شاداب ڈھل رہا ہوں
زمانہ مجھ سے یہ کہہ رہا ہے کہ تیری دنیا سنبھل رہی ہے

○

سید خلیل حسین خلیل نقوی

نام خلیل حسین تخلص خلیل۔ نقوی سید ہیں۔ آپ کے مورثِ اعلیٰ گردیز سے متحدہ ہندوستان آئے
ریواڑی میں مستقل طور پر آباد ہو گئے۔ سید خلیل حسین ۱۵ ستمبر ۱۹۰۱ء کو سونی پت میں پیدا ہوئے۔ آپ
والدِ محترم خان بہادر سید نذیر حسین، سول سرجن تھے اور ان کا تقرر پنجاب میں تھا۔ چنانچہ ملازمت
سلسلہ میں وہ جہاں جہاں گئے خلیل ان کے ساتھ رہے۔ آپ نے ۱۹۱۸ء میں گورنمنٹ ہائی سکول
الی سے انٹرنس کا امتحان پاس کیا پھر دہلی کے سینٹ سٹیفن کالج سے ایف اے اور بی اے پاس
۔ ایم اے کے لئے ہندو کالج میں داخلہ لیا اور کامیاب ہوئے۔ ۱۹۲۶ء میں آپ کی شادی ہوئی۔
آپ کے والدِ محترم خان بہادر سید نذیر حسین دو دفعہ کرنال میں متعین رہے اور دونوں دفعہ خاصا عرصہ
ں رہے اس لئے انہوں نے کرنال میں جائیداد خرید لی اور ریواڑی سے تعلق تقریباً منقطع ہو گیا۔ ۱۹۳۶ء
، وہ کرنال ہی میں انتقال کر گئے۔

کالج کے زمانہ میں آپ کو مزاحیہ شعر لکھنے اور کرکٹ، ہاکی، ٹینس کھیلنے کا بہت شوق تھا۔ کالج سے
رغ التحصیل ہونے کے بعد آپ ایک والیٔ ریاست کے مصاحب مقرر ہوئے اور کئی سال اس پوزیشن میں رہے۔
جب پاکستان معرضِ وجود میں آیا آپ کرنال میں تھے۔ وہاں سے رخصت ہوئے تو ماڈل ٹاؤن لاہور
مستقل سکونت اختیار کی۔

ایک زمانہ میں ان کا رجحانِ طبع فلموں کی طرف ہو گیا۔ چنانچہ آپ نے کئی فلموں کے
لے لکھے، ان کی ہدایت کاری کی اور مندرجہ ذیل فلموں میں خود ایکٹنگ کی۔ مل مزدور، دردِ دل، سیر پرستان
رول عورت، سونا، شاہدہ وغیرہ وغیرہ۔

شعر و ادب کا ذوق آپ کو بچپن سے ہے۔ اور کالج میں کچھ مزاحیہ شعر بھی کہہ لیتے رہے۔ لیکن صحیح بات یہ ہے کہ آپ کی شعری و ادبی صلاحیتوں کی ترقی کے لئے سازگار فضا اور مناسب محرکات آپ کو میسر آئے۔ فلمی مکالمے بھی آپ نے لکھے۔ لیکن ظاہر ہے کہ ان میں ادب کم اور دوسری مصلحتیں زیادہ سرگرم کار ہوتی ہیں۔

آپ گزشتہ دو برس سے انجمن ترقی ادب ماڈل ٹاؤن کے رکن ہیں اور اس کے مشاعروں اور ادبی نشستوں میں انہماک سے شرکت کرتے ہیں۔ ان مشاعروں اور ادبی نشستوں کے لئے آپ نے آج ہمارے ملکی مسائل سے متعلق نہایت موثر اور کامیاب ڈرامے لکھے ہیں۔ تنقیدی مضامین رقم کئے ہیں اور طرحی غزلیں لکھی ہیں۔ آپ کی طبیعت میں لاابالی پن بہت ہے۔ اپنا کلام محفوظ نہیں رکھتے۔ "یارانِ نو" کی ترتیب کے وقت آپ سے غزلوں کا تقاضا کیا گیا تو بہ مشکل تین غزلیں تلاش کر سکے ہیں۔

آپ کا کہنا ہے کہ عمر بھر میں آپ کی شعری و ادبی صلاحیتوں کو پہلی مرتبہ انجمن ترقی ادب ماڈل ٹاؤن نے جھنجوڑا ہے اور آپ کو نظم و نثر لکھنے پر اکسایا ہے۔ آپ کو حسرت ہے کہ کاش آپ کو یہ موقع کئی سال پہلے میسر آیا ہوتا جو آپ کی مستقل ادبی تخلیقات پر منتج ہوا ہوتا۔

○

پا شکستہ ہم پہنچ سکتے نہیں منزل کے پاس
رکھ لیا ہے نقشِ منزل ہم نے اپنے دل کے پاس

ناخدا گر عافیت چاہیے تو چل منجدھار میں
ہم نے دیکھے ہیں سفینے ڈوبتے ساحل کے پاس

منتوں سے لے گیا تھا ناخدا طوفان میں
وائے طوفاں نے ہمیں لوٹا دیا ساحل کے پاس

راہ نادانی سے کھو بیٹھے کسی سے پوچھ کر
ورنہ دل تو لے ہی آیا تھا ہمیں منزل کے پاس

چارہ گر ناداں ہے کرتا ہے علاجِ دردِ دل
اور دولت کون سی رکھی ہے اہلِ دل کے پاس

واہ واہ زورِ تصور مرحبا صد مرحبا
اُن کے دل کی دھڑکنوں کو سُن رہا ہوں دل کے پاس

دیکھنا دھوکہ نہ کھا جانا سنبھل جاؤ خلیلؔ
اور بھی کچھ تیر باقی ہیں ابھی قاتل کے پاس

رُخِ بہار نہیں صحنِ گلستاں کی طرف
نگاہِ برق نہیں میرے آشیاں کی طرف

فریبِ حسن نے غافل رکھا نہیں دل سے
نظر ہماری رہی صاحبِ کماں کی طرف

دیارِ عشق سے ہم کو کیا ہے شہر بدر
قصور یہ ہے کہ دیکھا تھا آسماں کی طرف

رقیب نے بھی جگر اپنا تھام تھام لیا
اک آہ بھر کے جو دیکھا ہے آسماں کی طرف

الاٹ ہوتا نہیں ہے پلاٹ دو گز کا
مکاں سے بھیج دیا ہم کو لامکاں کی طرف

نظر ہے پہلے ہی کمزور اور ہو گا زیاں
خلیل دیکھو نہ اب شعلۂ جواں کی طرف

○

رکھتے نہیں ہیں ربط بہار و خزاں سے ہم
منسوب ہو چکے ہیں غمِ جاوداں سے ہم

صیاد رہنے دے یہ اسیری ہی خوب ہے
بیگانہ ہو چکے ہیں رہِ آشیاں سے ہم

زاہد کو کیا خبر تری رحمت کی وسعتیں
ڈرتے نہیں گناہ کے بارِ گراں سے ہم

گر کارواں گیا تو ہے کیوں ہمسفر ملول
ہے ہم سے کارواں نہ کہ ہیں کارواں سے ہم

دیکھا جو خضر کو کہ بھٹکتے ہیں رات دن
باز آئے ایسی زندگیٔ جاوداں سے ہم

غفلت شعار ہو گئے پی کر مئے حیات
کب جاگتے ہیں دیکھئے خوابِ گراں سے ہم

تر دامنی ہماری نظر سب کو آ گئی
دیکھا نہ یہ کہ تنگ ہیں اشک رواں سے ہم

ناصح رموزِ عشق سے واقف نہیں خلیل
رکھتے نہیں ہیں واسطہ سود و زیاں سے ہم

○

عبدالغفار اسد

نام عبدالغفار تخلص اسدؔ۔ آپ ۵ اگست ۱۹۴۷ء کو کرنال میں پیدا ہوئے۔ جلد ہی آپ کا گھرانا ہجرت کر کے لاہور آ گیا اور یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ چنانچہ آپ نے لاہور ہی سے انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ اور اب اعلیٰ تعلیم کی جد و جہد میں مصروف ہیں۔

مطالعۂ ادب کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ اس مطالعہ ہی نے آپ کو شاعری کے راستے پر ڈالا اور آپ کا یہ فطری جذبہ نشو و نما پانے لگا۔

آپ کا کلام مقدار میں تھوڑا ہے لیکن جو کچھ بھی ہے ستھرا ہے۔

اساتذہ میں سے میرؔ تقیؔ اور غالبؔ آپ کو بہت پسند ہیں۔ مجنوںؔ گورکھپوری اور فراقؔ سے بھی آپ متاثر ہیں۔

○

اُلفت کا انجام نہ آیا   ترکِ تعلق کام نہ آیا

ان کی نظر سے اپنی نظر تک   کوئی بھی پیغام نہ آیا

میں تھا جب تک میخانے میں   ساقی لے کر جام نہ آیا

تھک گئے ہم تو، دل سا وحشی   پھر بھی زیرِ دام نہ آیا

اتنی دھوپ تھی تیرے غم کی   کوئی سایہ کام نہ آیا

یوں تو اسدؔ نے شعر کہے پر
اندازِ الہام نہ آیا

وہ مل گئے تو مجھ کو نئی زندگی ملی   کل اُن سے ہو گئی سرِ بازار چھیڑ چھاڑ

وہ روٹھ جائیں گر تو مناتا ہوں میں اُنہیں   ہوتی ہے اُن سے پیار میں ہر بار چھیڑ چھاڑ

رندوں کے حال پر کبھی کرتا نہیں نظر   رکھتا ہے شیخ رندوں سے بیکار چھیڑ چھاڑ

بے کار چھیڑ چھاڑ سے دامن بچا اسدؔ
بے کار چھیڑ چھاڑ ہے بے کار چھیڑ چھاڑ

○

کیں دعائیں تو بہت جانے اثر ہو کہ نہ ہو
کیا خبر ہم پہ محبت کی نظر ہو کہ نہ ہو

روشنی کے لیے تُو اپنے ہی اشکوں کو جلا
کون جانے شبِ ہجراں کی سحر ہو کہ نہ ہو

وہ چلے آئے تو ہیں رختِ سفر باندھے ہوئے
اب ہمیں غم نہیں آغازِ سفر ہو کہ نہ ہو

روز و شب منزلیں آغوش کشا رہتی ہیں
راہبر کوئی سرِ راہ گزر ہو کہ نہ ہو

آؤ اُس شوخ کے کوچے کی طرف چلتے ہیں
اسد اِس سے ہمیں تسکینِ جگر ہو کہ نہ ہو

○

آج تک یاد ہے اُس شعلہ بیاں کا انداز
اُس کے انداز میں تھا برقِ تپاں کا انداز

ضبط سے کام لیا ہم نے اسد محفل میں
درد نے سیکھ لیا ضبطِ فغاں کا انداز

○

مختصر رودادِ گلشن پیش کرتے ہیں اسد
ہر گل تر آ رہا ہے اب ہمارے دل کے پاس

○

O

دوست کوئی اب اور نہ دشمن
ٹوٹ چکے ہیں سارے بندھن

برس گئے یادوں کے بادل
اشکوں سے لبریز ہے دامن

اب تو نرم ہواؤں سے بھی
تھرّانے لگتے ہیں گلشن

جب بھی سینہ جل اُٹھتا ہے
آنکھیں ہو جاتی ہیں روشن

پیاسی رہ گئی پیاسی دھرتی
بیت گیا بن برسے ساون

اُس کی یادیں گلیوں گلیوں
اُس کی خوشبو آنگن آنگن

جا کے اسدؔ اُس کی محفل میں
بڑھ جاتی ہے دل کی دھڑکن

O

سرودِ رفتہ

اے بسا شاعر کہ بعد از مرگ زاد
چشمِ خود بر بست و چشم ما کشاد
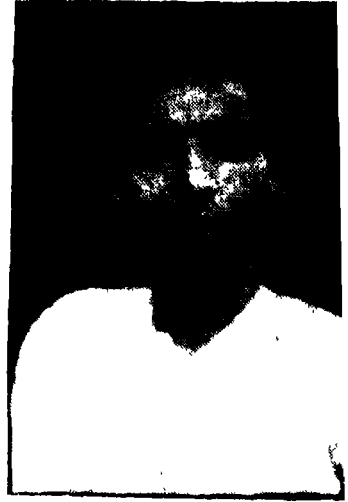
درد مرادآبادی

نام محمد ایوب خاں ۔ تخلص دردؔ ۔ ۱۹۳۳ء میں مرادآباد میں پیدا ہوئے ۔ آپ ایک افغان قبیلہ کمال زئی
و چراغ ہیں جو درباری آویزش کی وجہ سے ترکِ وطن پر مجبور ہوا اور افغانستان سے روانہ ہوکر
ہلی میں پھر مرادآباد میں شاہی آبادکار کے طور پر مستقلاً آباد ہوا ۔ اُس زمانے میں مرادآباد کا نام مرادنگر
پ کے والد کا نام محمد یعقوب خاں ہے ۔ آپ کے پڑ دادا ، دادا اور والد تینوں لعد دیگرے تینوں
فارسی میں کامل دستگاہ رکھتے تھے ۔ ان میں شاعر کوئی نہ تھا لیکن یہ سب ذوقِ سلیم رکھتے تھے
ر و سخن کے بڑے دلدادہ تھے ۔ یہاں تک کہ اپنے اپنے زمانہ میں ان میں سے ہر ایک کا حلقۂ احباب شعراؔ
شتمل تھا اور گھر میں خواتین تک کی زبان پہ اکثر شعر رہتے ۔ اس خاندان کے موجودہ دور میں درد
ب کے سب بہن بھائی شعر کہتے ہیں ۔

محمد ایوب خاں کو بچپن ہی سے شعر گوئی کا شوق رہا ۔ آپ نے پہلے رازؔ ، پھر آعدا اور اس کے بعد
لص اختیار کیا ۔ دنیائے شعر میں اب آپ صرف دردؔ تخلص سے معروف ہیں ۔ آپ کا پہلا شعر
ذیل ہے ۔ یہ آپ نے عنفوانِ شباب میں کہا ؎

جفاؤں سے محبت بھی کہیں معدوم ہوتی ہے
ابھی اُن کو محبت کھیل سی معلوم ہوتی ہے

بچپن میں آپ کو ایک دفعہ محرقہ بخار ہوا ۔ بخار چند دن بعد رخصت ہوگیا لیکن کئی مستقل امراض
نانی چھوڑ گیا ۔ ان امراض نے عمر بھر درد صاحب کا پیچھا نہ چھوڑا اور آخر ۳۳ سال کی عمر میں ۱۵ جنوری ۱۹۶۶ء
گھنٹے کی علالتی کشمکش کے بعد رحلت کر گئے ۔

دردؔ صاحب کا کلام مقدار میں بہت زیادہ نہیں لیکن جو کچھ کہا وہ خاصا بلند پایہ اور فصیح و بلیغ ہے

آپ ہر میدانِ شاعری کے کامیاب شاہسوار تھے ہر صنف میں شعر کہے ہیں ستمبر ۱۹۶۵ء میں ہندوستان نے پاکستان پر حملہ کیا تو درؔد صاحب نے دو سو شعر کی ایک طویل نظم "معرکۂ حق و باطل" کے عنوان سے کہی جو ان کی قومی غیرت، خلوص اور قادر الکلامی کی آئینہ دار ہے۔ انتقال سے صرف ایک ہفتہ پہلے آپ نے یہ نظم کتابی صورت میں شائع کرائی۔

دائمی علالت کے باوجود آپ بڑے ملنسار، متواضع، بذلہ سنج اور دقیقہ رس تھے۔ غالبؔ، انیسؔ فانیؔ، جوشؔ، جگرؔ آپ کے پسندیدہ شعرا تھے۔

درؔد مرحوم بہت سوچنے اور فکر کرنے کے عادی تھے۔ جو مسئلہ زیرِ غور ہوتا اس پر وہ بڑے خلوص اور قطعی غیر جانبداری سے سوچ بچار کرتے ایک اچھے مفکر کا یہی نقطۂ آغاز ہوتا ہے۔ آپ پر ایک ایسا دور بھی آیا جب آپ خدا تعالیٰ کی ہستی کے قائل نہیں تھے۔ چنانچہ آپ کہتے ہیں ؎

ہستیٔ کامل ہمہ اوصاف
وہم کم مائیگی کی ہے تخلیق
چھوڑ ناداں تجسسِ معبود
کر اب اپنی تفحص و تحقیق

درؔد مرحوم اس موضوع پر انجمنِ ترقیٔ ادب ماڈل ٹاؤن کے پریذیڈنٹ محترم عبدالرشید صاحب تبسمؔ سے اکثر بے تکلف تبادلۂ خیالات کرتے رہتے۔ یہ دونوں اپنا اپنا نقطۂ نگاہ ایک دوسرے پر واضح کرتے۔ تبسمؔ صاحب ہستیٔ باری تعالیٰ کے حق میں اور درؔد صاحب اس کے خلاف۔ ایک دن تبسمؔ صاحب کو درؔد صاحب کی ایک دستی چٹھی ملی جس میں لکھا تھا:۔

"آج علی الصبح آنکھ کھلتے ہی بجلی کی سی تیزی کے ساتھ یہ خیال میرے ذہن میں اترتا چلا گیا کہ قدرت کا عمل کائناتی پیمانے پر اندھے کی گھومتی ہوئی لکڑی کے مترادف نہیں ہے۔ بلکہ اس کے برعکس پسِ پردہ خاص الخاص حکمت کارفرما ہے۔ خلا میں سیاروں اور ستاروں کا ارتباط، فضائے ارضی پر ہوائی غلاف، کرۂ ارض پر مختلف التنوع وجود، ان کے تحفظ، بقا، افزائش کا اہتمام خاص مخصوص اسباب سے مخصوص نتائج کا صدور، عقل کا وجود اور اس کی طلسماتی پرواز ـــــ اس قسم کی ہزاروں باتیں "حکمت" کے وجود کا کھلا ہوا ثبوت ہیں۔ اور حکمت کا وجود حکیم کے بغیر ناممکن ہے۔ باقی رہی عقل، عقل، مخلوق کی حیثیت سے کائنات کا ایک معمولی جزو ہے۔ یہ محدود ہے۔ یہ خدا تعالیٰ اور خدا تعالیٰ کے اسرار کا احاطہ نہیں کر سکتی۔ اس لحاظ سے اس پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ یہ محدود چیز یعنی عقل مجھ سے لامحدود

(یعنی خدا تعالیٰ) کی نفی کرا رہی ہے ۔ کتنی عجیب بات ہے ۔ بہر حال آخر میرے دماغ کی تہذیب و تطہیر ہو گئی ۔ مجھے مبارک باد دیجئے ۔ یہ صورتِ حال سمجھ لینے کے بعد میری زبان پر بے ساختہ یہ شعر جاری ہوا ہے ؎

روح و روانِ زیست ہیں جانِ جہاں ہیں آپ
ملحد کو کیا بتاؤں بھلا اب کہاں ہیں آپ"

محمد ایوب خان دَرد مرحوم صرف ایک بلند پایہ شاعر ہی نہیں تھے بلکہ ایک بہترین نقاد، اچھے افسانہ نگار اور فاضل مضمون نگار بھی تھے ۔

آپ انجمن ترقی ادب کی مجلسِ عاملہ کے ایک سرگرم اور اَن تھک رکن، نہایت مخلص دوست اور ایثار پیشہ انسان تھے ۔

○

○

لوٹِ اُمیدِ اجر کی اور کسب خلوص — سچ پوچھئے تو ڈھونگ ہے زاہد ترا خلوص

صد حیف اسی کی دشمنِ جاں بنی ساز باز — وہ دل کہ جس کو سمجھے تھے سرتا بہ پا خلوص

سرمایۂ غرور ترا حسنِ پُر فریب — میری متاعِ نازِ محبت، وفا، خلوص

خوشنودیٔ حبیب ہے اب مدعائے عین — معراج پر ہے آج مرے عشق کا خلوص

جز دید و باز دید نہیں آرزوئے شوق — اِس پر بھی مشتبہ ہے مرے ذوق کا خلوص

ہوتی ہے تنگ فروز خود اپنے ہی دل کی کھوٹ — ہوتا نہیں ہے ورنہ خلوص آزما خلوص

منہ موڑنے کو موڑ تو لیں اُن سے آج ہی — کیا کیجئے مگر کہ ہے زنجیرِ پا خلوص

کام آ سکیں نہ شیخ کی معجز بیانیاں
پھر کھینچ لایا دردؔ کو میخانے کا خلوص

○

ساقی نہیں وہ داغ ہے ساقی کے نام پر — جو کر سکے نہ دستِ تہی جام کا لحاظ

دستِ کرم کے باب میں اللہ احترام — مستی میں بھی ہے دُردِ تہ جام کا لحاظ

یاں شوق کا تقاضا نہ حائل ہو تار بھی — مدِ نظر وہاں نگہہِ خام کا لحاظ

اُس سادہ لوح کی طلبِ دید دیکھنا — ایماں ہو جس کا اُن کے در و بام کا لحاظ

وہ بزم میں گواہ مری سرخمیدگی — یا مہرِ ناطقہ لبِ دشنام کا لحاظ

زاہد کی اور میری ہے افتادِ مختلف — واں خاص پر نگاہ یہاں عام کا لحاظ

دنیا نے سمجھا دانۂ لا یعنی کی کشش — یاں کھینچ لایا دستِ پسِ دام کا لحاظ

دردِ جگر سے کون نہیں ہوتا مضطرب
انسانیت مگر ہے غمِ عام کا لحاظ

○

○

کس کا یہ خونِ شوخ ہے نشتر زنِ ضمیر — بے اختیار لرزے ہے جو بار بار شمع
یہ آج کس کی نعش سرِ پائے ناز ہے — جھک جھک کے دیکھتی ہے کسے بار بار شمع
آخر کو رنگ لا کے رہا خونِ آستیں — انجامِ کار ہو کے رہی بے قرار شمع
کیا کہہ گئی نسیم کہ سنتے ہی دفعتاً — تڑپی تڑپ کے بجھ گئی امّید وار شمع
آتشِ بجاں ہیں دونوں ہی لیکن یہ فرق ہے — میں پردہ دارِ سوز ہوں، آئینہ دار شمع
میں ہی سمجھ سکا نہ بلاغت بیان کی — تھی شارحِ مآلِ شبِ انتظار شمع
دم سے مناسبت کے شبِ ہجر کٹ گئی — کہئے کہ شعلہ خو کی تھی آئینہ دار شمع

کچھ بھی نہ فیضِ مسند ہوا درد کا وجود
یوں، جل بجھا کہ جیسے سرِ رہگزار شمع

○

والئ قسمت ہیں وہی تیرہ نصیبی کے شکار — جن کے ایثار کا شاہد ہے بہاراں کا چراغ
ظلمتیں موردِ تحقیر جو ہیں، ہیں یہ وہی — جن کے دم سے ہے فروزاں ترے ایواں کا چراغ
ایک وہ ہیں کہ بنے شمعِ شبستانِ طرب — اک مرا بخت کہ ہوں خلوتِ حرماں کا چراغ
میری آزادیٔ ضو پاشیٔ افکار نہ پوچھ — اتنا آزاد ہوں جیسے کسی زنداں کا چراغ
کم نہیں خار بھی گلشن کی نظر سے دیکھو — پھول ہی محض نہیں چشمِ گلستاں کا چراغ
ہر قدم قربتِ منزل کا امیں ہوتا ہے — عزم با جہد میں روشن ہو گر ایقاں کا چراغ
مبتلائے غمِ جانسوزِ اسیری، ہستی — یوں ہے جیسے کسی مدفن گہہ زنداں کا چراغ

یوں زیاں کار ضیا پاش ہے اس دور میں دردؔ
جیسے سوزاں کسی مدفن گہہ ویراں کا چراغ

○

نہ دیکھ خاطرِ نخچیرِ نیم جاں کی طرف
پلٹ کے دیکھ تو لے تیرِ کامراں کی طرف

رکھا ہے پھر سے قدم کوئے دوستاں کی طرف
چلا ہے ذوق پھر آفاتِ ناگہاں کی طرف

کبھی کبھی تو ہوا اضطراب میں یوں بھی
چلا ہوں ساتھ ہی قاصد کے گلستاں کی طرف

عطائے ناصح ہی کی تو ہے سیہ روزی
نہ کھینچ پھر مجھے ایامِ ضوفشاں کی طرف

حسنِ جبر کی عظمت ارے معاذ اللہ
جھکے ہے برقِ فلک پیہم آشیاں کی طرف

بہ دست و بازوئے صیاد کی الٰہی خیر
کہ آ کے رہ گیا اک تیر آشیاں کی طرف

ضیاعِ وقت ہے نادان ماتمِ ماضی
پلٹ کے دھیان نہ دے سعیِ رائگاں کی طرف

ہے کون لائقِ تحسینِ کامرانی دردؔ
بڑھا تھا دل بھی تو پیکانِ جانستاں کی طرف

کوئی بھی صورتِ قرار نہیں
یعنی اب وجہِ اضطرار نہیں

خار بھی ہیں عطائے محبوبی
پھول ہی بخششِ بہار نہیں

پندِ ناصح بجا سہی لیکن
مصلحت عشق کا شعار نہیں

عشق ہے نام کار دار انجام
شغلِ گلچینیٔ بہار نہیں

ہم تو ہیں گیسوئے چمن کے اسیر
کوئی شیدائیِ بہار نہیں

میری تو بات بات پر ہے گرفت
خود کریں کچھ بھی پر شمار نہیں

کیا کسی پر اب اعتماد کریں
آپ ہی پر جب اعتبار نہیں

عشقِ گستاخ کا گلہ کیسا
حسن ہی آج باوقار نہیں

○

ہر کسی سے خوش گمانی اس طرح اچھی نہیں — ہر نظر سے جانِ جاں میری نظر ہوتی نہیں
گلستانِ حسن یہ اور اس کی یہ نیرنگیاں — یہ تبھی تک ہیں نظر جب تک نظر ہوتی نہیں
جوہرِ ذاتی ہے لازم سربلندی کے لئے — بوند پانی کی کوئی یونہی گہر ہوتی نہیں
آہ کب وہ ماورائی روپ میں ہوتے نہیں — ہائے کب میری نظر "میری نظر" ہوتی نہیں
تشنہ کامی ہی سہی، تفصیل تو لیکن بتا — ختم دو باتوں میں بات اے نامہ بر ہوتی نہیں
ہے مسلط ظلمتِ حرص و ہوا جب چار سُو — پھر تعجب کیا، نمودِ صبح گر ہوتی نہیں

کیا بتاؤں عشق کی یہ کونسی منزل ہے درد
میں تو اس جا ہوں جہاں اپنی خبر ہوتی نہیں

○

کیا بتاؤں مری خطا کیا ہے — اُن کا بندہ ہوں اور بھلا کیا ہے
اُن پہ مرنے کی دُھن سمائی ہے — میں نہیں جانتا ہُوا کیا ہے
پھر اُسی ناز سے ذرا کہنا — جاؤ بھی ہم سے واسطہ کیا ہے
زخم دل کو ابھی تو بننا ہے — زخم دل کا ابھی ہوا کیا ہے
بات دل کی تو ہوتی ہے اعجاز — تیزی یہ آہِ نارسا کیا ہے
خود ہی اپنے لئے ہوں عقدہ ہنوز — پوچھتا ہوں بھلا خدا کیا ہے

یوں جو رہتے ہو کھوئے کھوئے سے
دردؔ صاحب معاملہ کیا ہے

○

○

کیا قہر ہے ہر چیز ہے ملفوفِ تصنع
کیا قحط ہے انسان بھی انساں نہیں ملتا

اللہ رے اعجازِ غمِ دوست کہ ہم سے
اب آنکھ ملا کر غمِ دوراں نہیں ملتا

کیا جانیے کس ہیچ پہ رفتار فلک ہے
مدت سے مزاجِ غمِ دوراں نہیں ملتا

درماں تھا بنیہ تو نہ تھا دردِ نہانی
اب دردِ نہانی ہے تو درماں نہیں ملتا

ہر چند کہ میراث میں ہے جور پرستی
پر اپنا مزاجِ سرِ نازاں نہیں ملتا

مل سکتا ہے سب کچھ دلِ بے چین سکوں جس کو
وہ ہاتھ نہیں ملتا وہ داماں نہیں ملتا

عرفانِ خودی ہر کس و ناکس کو ہو کیسے
ہر شخص کو آخر سرِ نازاں نہیں ملتا

کیوں ناز کا موجب نہ ہو یہ نعمتِ عظمیٰ
ہر قلب کو داغِ غمِ جاناں نہیں ملتا

کر لیتے ہیں یوں یاد سرِ رہ کبھی مجھ کو
اب راہ میں وہ چاکِ گریباں نہیں ملتا

○

اللہ رے معجزہ نگہِ انتخاب کا
رنگ اور بھی نکھر گیا کافر شباب کا

ہے میرا ذوقِ دید کہ جوششِ نمودِ حسن
منظر ہے گوشہ گوشہ وجودِ نقاب کا

کس حوصلے سے کیجیے شکوہ حضورِ دوست
ہے کھیل کوئی دیکھنا چشمِ پُر آب کا

جب گردِ نجات سے محروم ہو گیا
پوچھا ہے حال اب دلِ خانہ خراب کا

بے ہم کسی کے دام میں آتا ہے کون دوست
میں تو اسیر ہوں ترے حسنِ سراب کا

کس شوخ کی جھلک یہ عنانگیر ہے یہاں
دلدادہ ہے ہر ایک جہانِ خراب کا

اُلجھی ہوئی ہے اُن کی نظر سے ایسے ایسے
غمزہ تو دیکھیے نگہِ بار یاب کا

میری بلا کرے غمِ محشر کہ میں تو درد
ہوں ہی ازل سے چیدہ مآلِ خراب کا

○

بہتر ہے اس سے جہل و ضلالت کی زندگی
وہ شمعِ علم جس سے ہو ظلمت کا انعکاس

اِس طفلِ خامِ عقل پہ یہ خوش گمانیاں
شہکار جس کے ہوں ابھی اندازہ و قیاس

کیسی یہ آزمائشیں کیسے یہ امتحاں
اے قادرِ حقیقی و اے بانیٔ اساس

وہ بھی تو جانتا ہے کہ ہُوں احتیاج مند
لازم ہے کیا کہ میں ہی کروں عرض و التماس

یہ کشمکش تو بیم و رجا کی عذاب ہے
للہ ایک فیصلہ اُمید ہو کہ یاس

ہیں آدمی ہی گھات میں یوں آدمی کے گرد
گِدھ تاک میں ہوں جیسے لبِ دم کے آس پاس

کونین جز تصورِ خلّاق کچھ نہیں
یہ ہیں زبورِ وآرد سے دو نقطہ اقتباس

بیمار بدستور ہے بیمار ابھی تک
پہلے کی طرح زیست ہے آزار ابھی تک

بدلی نہیں حالات کی رفتار ابھی تک
قسمت ہے وہی گردشِ پرکار ابھی تک

ناگفتنی ہے حالِ چمن زار ابھی تک
تہمت ہیں گُل و غنچہ و اشجار ابھی تک

طاری ہے بدستور شبِ تار ابھی تک
مفروضہ ہی ہیں صبح کے آثار ابھی تک

ملفوف ہیں اذہان بخاراتِ شکم میں
بے لطف ہے ذکرِ لب و رخسار ابھی تک

دستورِ زباں بندیٔ منصور ہے اب بھی
موجود ہے رسمِ رسن و دار ابھی تک

حق گوئی بدستور ہے تعذیر کی نخچیر
موہوم ہے آزادیٔ گفتار ابھی تک

کہتا ہوں بہت کچھ دلے کچھ بھی نہیں کہتا
ممنونِ کنایات ہے اظہار ابھی تک

○

آباد کیا چمن میں کوئی آشیاں نہیں
مدت سے رقصِ برق سرِ گلستاں نہیں

آلامِ جاں نگار کی پرسش کہاں نہیں
گوشہ وہ کون سا ہے جہاں آسماں نہیں

سوزِ غمِ فراق سے سیماب وش ہے دل
یہ اور بات ہے مرے رخ سے عیاں نہیں

مائل بہ لطف ہوں کہ وہ سرتا پا قہر ہوں
ہے کون سا وہ رخ کہ مرا امتحاں نہیں

تارِ نفس بھی بار تمہارے بغیر ہے
تم ساتھ ہو تو کوہِ گراں بھی گراں نہیں

ہائے وہ دورِ طرفہ کہ تھا خلد در جلو
ہائے وہ چشمِ لطف کہ اب مہرباں نہیں

مقصودِ جستجو ہے یہاں وہ درِ عظیم
جھک جاتے تھے سر آپ جھکانے جہاں نہیں

ہرجائی پن پہ آپ ہمارے نہ جائیے
یاں تو ہے جستجو کہ سر اٹھتا کہاں نہیں

کب تھا بعید قدرتِ بیداد خو سے درد
حیراں ہوں حیات مری جاوداں نہیں

○

حسنِ محبوبی و انداز و ادا کچھ بھی نہیں
میری پاکیزہ نگاہی کے سوا کچھ بھی نہیں

دردِ دل ضبط شکن اور دوا کچھ بھی نہیں
زندگی اپنی تڑپنے کے سوا کچھ بھی نہیں

ہو بصیرت تو ہے ہر ایک رکاوٹ باطل
ورنہ مجموعۂ صد دیدۂ وا کچھ بھی نہیں

زندگی تھی جو کبھی لائقِ تعبیرِ حیات
آج اک تہمتِ رنگیں کے سوا کچھ بھی نہیں

ہم تو اس ہستی کا مظہر ہیں نہیں جس کو فنا
اپنی ہستی کی فنا اور بقا کچھ بھی نہیں

منکسر طبع کبھی گاہ سراپا نخوت
گاہ پتھر بھی خدا گاہ خدا کچھ بھی نہیں

کیوں فسردہ ہے میں قربان خطا جو میرے
میری یہ بھی تو خطا ہے کہ خطا کچھ بھی نہیں

○

○

ستمگاری و دل آزاری جو پہلے تھی سو اب بھی ہے
وہ رسم ورادِ تاتاری جو پہلے تھی سو اب بھی ہے

وہی تشدّدیت جاری جو پہلے تھی سو اب بھی ہے
وہی ضحاکیت ساری جو پہلے تھی سو اب بھی ہے

زبردستوں کی خونخواری جو پہلے تھی سو اب بھی ہے
وہ کمزوروں کی لاچاری جو پہلے تھی سو اب بھی ہے

وہی سرمایہ داری ہے وہی جاگیرداری ہے
وہ سیم و زر کی عیّاری جو پہلے تھی سو اب بھی ہے

وہی تعمیر کے دعوے وہی دعووں کے منصوبے
وہ فن کاروں کی فن کاری جو پہلے تھی سو اب بھی ہے

وہی وعدوں کی ارزانی وہی الفت کی نایابی
وہ خودِ لےخام گفتاری جو پہلے تھی سو اب بھی ہے

وہی افلاس کے فاقے وہی فاقوں کی مجبوری
وہ مرگِ جنسِ خودداری جو پہلے تھی سو اب بھی ہے

○

آئے دن اک جنبشِ نو پردۂ محمل میں ہے
جانے کیا لیلائے آزادی نے ٹھانی دل میں ہے

دردِ الفت رنجِ فرقت شوق و ارماں یادِ دوست
جانے اور کیا کیا نہاں اس مختصر سے دل میں ہے

کالی کالی یہ گھٹائیں، یہ ہوائیں سرد سرد
توبہ توبہ اب مری توبہ بڑی مشکل میں ہے

اک جمودِ بے نہایت اک سکوتِ بے پناہ
کس طرح مانوں کہ روحِ زندگی محفل میں ہے

ناتوانی مشکلاتِ راہ اور رہبر تیز رو
یہ جنوں کا معجزہ ہے یا کشش منزل میں ہے

قلبِ انساں کیوں کھنچا جاتا ہے یوں دیوانہ وار
کیا نہاں کوئی حقیقت پردۂ باطل میں ہے

جوشش مدہم ہے یہاں دیوانگانِ نجد کا
اور وہاں لیلائے مطلوبہ ابھی محمل میں ہے

○

ہجومِ نور بھی ظلمت اثر ہے کیا کہیے
عجیب آج مزاجِ سحر ہے کیا کہیے

ہم اپنی قید کا الزام کیا کسی پہ دھریں
خود اپنا ذوق ہی بے بال و پر ہے کیا کہیے

وہ کشت زار کہ خرمن تھا جس کا لنگرِ عام
غضب کہ طالبِ لطفِ دگر ہے کیا کہیے

کسی کی ٹھوکروں میں اپنی عظمتوں کی ہے لاش
وہ نخوتِ سرِ خود سر کدھر ہے کیا کہیے

انہیں نیاز سے کہ ہم کو ظلم تک محبوب
یہ اپنا اپنا مذاقِ نظر ہے کیا کہیے

خدا بچالے نگاہِ بدِ طبیب سے درد
یہی تو زخم متاعِ جگر ہے کیا کہیے

مسلسل اٹھتا ہوں عرضِ غمِ نہاں کے لئے
حیات وقف ہے اک سعیِ رائگاں کے لئے

سر ایک ہے سو اسے زعمِ سرفرازی ہے
کہاں سے لاؤں جبیں تیرے آستاں کے لئے

غضب کہ دستِ اجل شل ادھر، ادھر مظلوم
ترس رہے ہیں ابھی مرگِ ناگہاں کے لئے

ملالِ رفتہ، غمِ حال، فکرِ مستقبل
یہ آفتیں مری ننھی سی ایک جاں کے لئے

عدو نہیں نہ سہی مہرباں دوست سہی
بہانہ کچھ تو ہو آفاتِ ناگہاں کے لئے

مجھے نہیں نہ سہی میرا اشتیاق تو دیکھ
سراپا گوش ہوں تیری ذرا سی ہاں کے لئے

○

وہ نیرنگیِ عنفوانِ شبابی — کہ انگ انگ ہیں محشرِ انقلابی
وہ ضو پاش چہرہ کتابی کتابی — وہ رنگِ درخشاں شہابی شہابی
وہ معصوم صورت وہ پاکیزہ سیرت — کہ شرمندہ کلیوں کی عصمت مآبی
وہ مژگاں کہ جنبش میں نشتر شعاری — وہ ابروئے پُر خم کماں ماہتابی
وہ مخمور آنکھیں ایاغِ طہورے — اور اُن میں وہ ڈورے گلابی گلابی
وہ رخسارِ رنگیں کہ وردِ شگفتہ — وہ لوحِ جبیں پارۂ ماہتابی
وہ دندانِ سیمیں کہ موتی کی لڑیاں — وہ لب غنچۂ نیم وا سے گلابی
وہ گیسوئے شبگوں کہ ظلماتِ محجوب — پئے قلبِ مشتاق خانہ خرابی
وہ پیچ و خمِ زلفِ حلقہ بحلقہ — دلوں کی جہاں سے گماں بازیابی
وہ آغوشِ رنگیں کہ جنت نگوں سر — یگانہ نصیبی وسلے باریابی
وہ نازک خرامی خرامِ نسیمی — وہ شیریں کلامی ترنگِ ربابی
وقارِ حضوری ارے اللہ اللہ — کہ لرزہ براندام افراسیابی
وہ حسنِ سراپا وحید و یگانہ — نمایاں بہر زاویہ لا جوابی
یہ ہے سحر یکتائیِ حسن ورنہ — مقید بنے اور یہ دل انقلابی

یکے از براہینِ عالی نگاہی
دلِ دردؔ کی رفعتِ انتخابی

○

○

آیا جاتا ہے تری ہستیٔ موصوف پہ حرف — اک نظر مجھ پہ بھی اے "بختِ سیہ تاب" سہی

کچھ تو ہو عمر گزاری کے لئے شغلِ حیات — سُکھ کی صورت نہ سہی دُکھ ہی کے اسباب سہی

چاہیئے پہلو بہر حال نہ ویراں رہنا — نہ سہی "برقِ تپاں خو" دلِ بیتاب سہی

فرق آجائے بھلا عزمِ جنوں میں توبہ — بادِ صرصر سہی طوفاں سہی گرداب سہی

کیا غرض تم کو کہ ہو تم تو مسرت بہ کنار — مَیں دلِ افگار سہی ماہیٔ بے آب سہی

اس قدر تو ہے کہ ہیں آئینہ دارانِ حیات — حسنِ فنی میرے اشعار میں نایاب سہی

لطف لینا ہے مجھے زحمتِ ہر گام سے دردؔ
جورِ اعدا نہ سہی رافتِ احباب سہی

○

بات سے عاری بن گیا چال سے راستی گئی — رہ گیا جسمِ آدمی، روح جو تھی چلی گئی

اچھا ہوا کہ ہو گیا قطع سرشتۂ اُمید — جان چھٹی عذاب سے روز کی بے کلی گئی

ہوتے نہ گر وہ سنگدل بنتی ہی جان و دل پہ کیوں — کیا ملا کر کے التجا منت میں بات بھی گئی

گلشنِ زیست پُر بہار آپ کے دم قدم سے تھا — آپ گئے یہاں سے کیا رونقِ زندگی گئی

زیر و زبر نظامِ زیست کر دیا انقلاب نے — وائے ہمارے حال پر اپنی نہ بے حسی گئی

مانا کہ ظلم ظلم تھا، ضامنِ شانِ دل تو تھا — بنتے ہی مرکزِ ستم ندرتِ عاشقی گئی

پا گئی موت فتح گر، دردؔ کا کیا بگڑ گیا
آپ تو چارہ ساز تھے بات تو آپ کی گئی

○

قطعات

یہ جوش، یہ تلاطمِ مخفی شراب کا — یہ صحنِ گلستاں، یہ چمن ماہتاب کا
یہ قوسِ رنگ و نور، یہ برقِ پُر اضطراب — دھندلا سا ایک عکس ہے تیرے شباب کا

○

بلبل کو چشمِ نرگسِ دلدار کی طلب — کبکِ دری کو روئے ضیا بار کی طلب
غرضیکہ ہر طبیعتِ زحمت پسند کو — ہے ایک مستِ نازِ دل آزار کی طلب

○

التفاتِ خاص کی اُمید اور صیاد سے — اس طرح ہے جیسے امرت سانپ سے پانے کی بات
تا بکے جھوٹی تسلّی، تا بکے خوش فہمیاں — کیجیے کوئی حقیقت میں قرار آنے کی بات

○

کام ذہن میں گُم نہ ہو نفس کے دام سے گزر — عارضِ لطف میں نہ کھو، لذتِ خام سے گزر
ڈھونڈ کہیں سے شاہدِ چشمِ نگاہِ کیف بار — منتِ لطفِ ساقی و شیشہ و جام سے گزر

○

تلخابۂ احساس کے جرعات کا پینا — اُف کشمکشِ ذہن کے آغوش میں جینا
ہر فرقت کی واللہ مصیبت ہے یہ نعمت — بیدار شعور و نگہِ دیدۂ بینا

○

پردۂ ہستیِ ما بین اٹھالوں تو ہنسوں — قطرۂ ذات کو قلزم میں ملالوں تو ہنسوں
منحصر اپنی خوشی اُن کی مسرت پہ ہے — ہستیِ وجہِ گرانی یہ، مٹالوں تو ہنسوں

○

○

ہے معمہ میری ہستی عہدِ حاضر کے لئے — کوئی کیا سمجھے مجھے اک عقدۂ مشکل ہوں میں
برتی ہے عجلت سی فطرت نے مری تخلیق میں — یعنی از آئندگانِ دورِ مستقبل ہوں میں

○

مخزنِ درد و الم کھول کے کیسے رکھ دوں — دلِ مجروحِ ستم کھول کے کیسے رکھ دوں
تیری معصوم سرشتی کی حقیقت کی قسم — تیری فطرت کا بھرم کھول کے کیسے رکھ دوں

○

پھر تڑپ اُٹھی معاً روحِ حزیں — پھر شب و روزِ طرب یاد آ گئے
پھر بڑھی تلخیٔ احساسِ عطش — پھر ترے عارض و لب یاد آ گئے

○

نہیں تخصیص کچھ شراب ہی کی — کسی صورت قرار آ جائے
کوئی بھی ایسی تند تر شے ہو — تلخیٔ زیست پر جو چھا جائے

○

روشنی کی ہو رمق کچھ تو سیہ و زری میں — بدرِ کامل نہ سہی کرمکِ شب تاب سہی
عالمِ یاس میں موہوم سہارا ہی سہی — واقعیت نہ سہی، کوئی حسیں خواب سہی

○

ہے پختگیٔ عہد پہ ایمان منحصر — ایماں ہے کفر بھی جو تذبذب اثر نہ ہو
کم کفر سے نہیں مگر ایمانِ شیخ جی — فی نفسہٖ اساس میں محکم اگر نہ ہو

○

نام غلام عباس، تخلص عباس۔ ۱۵/ اگست ۱۸۹۷ء کو لدھیانہ شہر کے ایک فارغ البال خاندان میں پیدا ہوئے جو قانون دانی میں خاص شہرت رکھتا تھا۔ ابتدائی تعلیم لدھیانہ کے اسلامیہ ہائی سکول میں پائی۔ یہ بند ہو گیا تو آپ کو مجبوراً مقامی آریہ ہائی سکول میں منتقل ہونا پڑا جہاں سے آپ نے بڑے امتیاز کے ساتھ انٹرنس کا امتحان پاس کیا اور آپ کا نام سکول کے آنرز بورڈ پر لکھا گیا۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے آپ نے پہلے لاہور کے اسلامیہ کالج میں اور پھر ایف سی کالج میں داخلہ لیا۔ آپ نے ایف اے اور بی اے کے امتحانات بڑے امتیاز سے پاس کئے پھر پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے ریاضی کی ڈگری امتیاز سے حاصل کی اور ملک کے صفِ اوّل کے ریاضی دانوں میں شمار ہونے لگے۔

تعلیم سے فارغ ہوتے ہی آپ کو اسلامیہ کالج لاہور کی طرف سے ریاضی کے جونیئر پروفیسر کی آسامی پیش کی گئی جو آپ نے قبول کر لی۔ ۱۹۲۲ء میں آپ اسی آسامی پر سرکاری ملازمت میں منسلک ہو گئے۔

۳۱/ دسمبر ۱۹۲۴ء میں آپ کی شادی ایک خوشحال گھرانے میں ہوئی اور آپ پر گھریلو ذمہ داریاں عائد ہوئیں۔ ۱۹۲۷ء میں آپ کے بڑے بھائی انتقال کر گئے جس سے گھر کے حالات پر گہرا اثر پڑا۔ اس زمانے میں چودھری غلام عباس کا تقرر گجرات میں تھا۔ ۱۹۲۰ء میں لدھیانہ میں گورنمنٹ کالج کا قیام عمل میں آیا تو آپ ریاضی کے سینئر پروفیسر بنا کر وہاں تبدیل کر دیئے گئے۔ آپ لدھیانہ ہی میں تھے کہ پاکستان بن گیا اور آپ ادھر آ گئے۔ اکتوبر ۱۹۴۷ء میں آپ گورنمنٹ کالج ڈیرہ غازی خان کے پرنسپل بنائے گئے تعلیمی لحاظ سے یہ ایک بہت ہی پسماندہ علاقہ تھا اور اس وقت اس کالج میں طلباء کی تعداد ۲۵ تھی۔ چند سال بعد جب آپ وہاں سے رخصت ہوئے تو طلبا کی تعداد سات سو تک پہنچ چکی تھی۔ چودھری صاحب کا

ہمیشہ یہ عقیدہ رہا کہ خدمتِ اسلام کا بہترین طریقہ مسلمان بچوں کو تعلیم کے میدان میں آگے لانا اور کامیاب بنانا ہے۔ چنانچہ آپ متحدہ پنجاب میں مسلمان طلباء کو اُن گورنمنٹ کالجوں میں جہاں آپ کا تقرر رہا زیادہ سے زیادہ تعداد میں داخل کرانے کے لئے دیوانہ وار جدوجہد کرتے رہے اور قیامِ پاکستان کے بعد بھی مسلمان بچوں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں داخلہ لینے پر آمادہ کرتے رہے۔ ۱۹۵۶ء میں آپ دیال سنگھ کالج لاہور کے پرنسپل مقرر ہوئے اور اس آسامی پر دو سال فائز رہے۔ اُس وقت اس کالج کے انتظامی معاملات ناگفتہ بہ تھے۔ آپ نے شبانہ روز محنتِ شاقہ سے انہیں درست کر دیا جس سے کالج کے نتائج اور کھیلوں کا معیار پھر بہت بلند ہو گیا۔

تعلیمی مصروفیتوں کے آخری دور میں چودھری غلام عباس پنجاب یونیورسٹی کی کئی فیکلٹیوں، کونسلوں کے رکن رہے۔ پنجاب یونیورسٹی کے فیلو مقرر ہوئے اور مختلف تعلیمی نصابوں کی تشکیل میں ایک ماہرِ تعلیم کی حیثیت سے نمایاں حصہ لیتے رہے۔ آپ تیس سال تک پنجاب یونیورسٹی اور بعض دوسری یونیورسٹیوں کے ممتحن رہے۔

ملازمت سے سبکدوشی کے بعد آپ نے صوبائی سطح پر پنشنروں کو منظم کیا اور اُن کی دقتوں اور دشواریوں کو موثر انداز میں حکومت کے سامنے پیش کرنے کے لئے پنجاب پنشنرز ایسوسی ایشن بنا ڈالی۔ وحدتِ مغربی پاکستان کے بعد اسے ویسٹ پاکستان پنشنرز ایسوسی ایشن کا نام دیا گیا۔ یہ انجمن بہت کامیاب رہی ہے۔

متحدہ ہندوستان کے مسلمانوں نے جب قیامِ پاکستان کے لئے جدوجہد کی چودھری غلام عباس اُس زمانہ میں سرکاری ملازم تھے اس لئے سیاست میں حصہ نہیں لے سکتے تھے۔ اس کے باوجود آپ کا دماغ اور دل برابر مسلم لیگ کے ساتھ تھا۔ اور آپ دامے سخنے اس کی اعانت کرتے رہے۔ جب پنجاب کو تقسیم کرنے کا معاملہ زیرِ غور آیا تو آپ نے اضلاع لدھیانہ، جالندھر، ہوشیارپور اور فیروزپور کو پاکستان میں شامل کرنے کا جواز مہیا کرنے کے لئے ایک شماریاتی دعویٰ خود تیار کیا اور مسلم لیگ کے ذریعے متعلقہ کمشن کے سامنے پیش کرایا۔ ماؤنٹ بیٹن نہرو محرر تو ضلع گورداسپور کو بھی پاکستان سے باہر رکھنے کا فیصلہ کر چکا تھا علاوہ اس شماریاتی دعوے کو کب کامیاب ہونے دیتا۔ چنانچہ یہ دعوےٰ رد کر دیا گیا۔

صفِ اوّل کے ماہرِ ریاضی دان ہونے کے باوجود آپ کو دینی علوم ومعارف کا بڑا شوق تھا۔ جن دنوں آپ گجرات میں متعین تھے وہاں سید محمد عمر شاہ مرحوم کا حلقۂ درس قائم تھا جس میں معارفِ قرآن و حدیث بیان کئے جاتے۔ آپ اِس حلقے میں شامل ہو گئے اور درس میں بلاناغہ شریک ہوتے رہے۔

یہ سلسلہ کئی دن تک جاری رہا ۔ جب آپ وہاں سے تبدیل ہو کر لدھیانہ آئے تو یہاں اُن ہی خطوط پر خود حلقۂ درس قائم کیا جو خاصا عرصہ جاری رہا ۔ اِس تمام عرصہ میں آپ قرآن کے حقائق و معارف پر غور کرتے رہے ۔ یہاں تک کہ آپ نے قرآن کی ایک جامع تفسیر لکھی جس کا مسودہ آپ کے صاحبزادوں کے پاس محفوظ ہے اور وہ اِس کی طباعت کا انتظام کر رہے ہیں ۔

شعر و ادب کا ذوق آپ کو بچپن سے ملا تھا اور آپ گاہے گاہے نظم و نثر لکھتے رہے ۔ لیکن ذوقِ شعر آپ کے قیام ڈیرہ غازی خاں کے زمانہ میں پوری شدت سے اُبھرا ۔ اُس سرزمین میں کئی عارف اور صوفی مدفون ہیں ۔ اُن کا معرفت سے پُر کلام وہاں زبان زدِ عوام ہے ۔ آپ اِس صوفیانہ کلام سے بے حد متاثر ہوئے ۔ اُن ہی دنوں آپ نے خواجہ غلام فرید علیہ رحمتہ کے مزار واقع مٹھن کوٹ کی زیارت کی تو طبیعت میں ایک انقلاب سا پیدا ہو گیا اور آپ کا اندازِ فکر یکسر بدل گیا ۔ اور شعر معنویت کے سانچے میں ڈھلنے لگے ۔

آپ کو اردو اور انگریزی کے علاوہ فارسی ادب عربی پر بھی عبور کامل تھا ۔ آپ نہ صرف ایک بہترین نثر نگار اور شاعر ہی تھے بلکہ ایک بلند پایہ مقرر بھی تھے ۔ آپ کی نگارشاتِ نثر و نظم اخبارات و رسائل بالخصوص ہمایوں، نیرنگِ خیال، ادبی دنیا میں کثرت شائع ہوتی رہیں ۔ کچھ عرصہ نیرنگِ خیال کے اعزازی ایڈیٹر بھی رہے ۔ آپ نے معاشرتی، تاریخی، ادبی، مذہبی موضوعات پر قلم اٹھایا اور بے تکان لکھا ۔ علم نجوم میں بھی آپ کامل دسترس رکھتے تھے ۔

آپ عقائد کے اعتبار سے ایک پختہ خیال شیعہ تھے ۔ آپ عقائد کی نسبت کردار کو زیادہ اہمیت دیتے اور اپنے عقائد کا اظہار زبان کی بجائے کردار کی بلندی سے کرتے ۔ آپ مذہبی بحث میں کم اُلجھتے لیکن اگر یہ بات چھڑ جاتی تو جذبات کی سطح سے بہت بلند ہو کر علمی اور منطقی رنگ میں نہایت تحمل سے اپنا نقطۂ نگاہ پیش کر دیتے ۔

چودھری غلام عباس ۱۹۵۴ء میں ماڈل ٹاؤن لاہور میں مستقل طور پر آباد ہو گئے اور اسی وقت سے یہاں کی انجمن ترقی ادب میں سرگرم دلچسپی لینے لگے ۔ ۱۹۶۰ء میں انجمن کے نئے دور کا آغاز ہوا تو محترم عبدالرشید تبسم صاحب انجمن کے صدر منتخب ہوئے اور چودھری غلام عباس وائس پریذیڈنٹ منتخب کیے گئے ۔ وفات تک آپ انجمن کے اِس عہدے پر فائز رہے ۔ انجمن کا آئین بنانے میں بھی آپ نے نمایاں حصہ لیا ۔ اور اس کے مشاعروں میں برابر شریک ہوتے رہے ۔

جولائی ۱۹۶۱ء میں آپ کو دل کا دورہ پڑا ۔ تین ماہ ہسپتال میں صاحبِ فراش رہے لیکن تندرست ہو

گئے اور ادبی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لینے لگے ۔ دسمبر ۱۹۶۲ء میں دوبارہ دل کا دورہ پڑا ۔ پھر ہسپتال میں داخل کئے گئے لیکن افاقہ نہ ہوا ۔ علاج غیر مؤثر رہا ۔ آپ کو واپس گھر لے آئے ۔ ۲ جنوری ۱۹۶۳ء کو اپنے رفقائے خاص سے آخری ملاقات کی ۔ اُس رات اہلِ خانہ نے کھانا پیش کیا تو آپ نے فرمایا ۔

"مجھے جو کچھ کھانا تھا وہ مَیں کھو چکا ۔ اب یہ کھانا میرے لئے نہیں ہے ۔"

اہلِ خانہ کے اصرار کے باوجود آپ نے کھانا نہ کھایا ۔ ۳ جنوری کی صبح آپ نے اذان سُنی تو بستر پر ہی تیمّم کر کے نماز پڑھی ۔ نماز کے بعد دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے اور اِس دعا کے دوران ہی میں اپنے مولائے حقیقی کے حضور حاضر ہو گئے ۔

بیگم، دو صاحبزادے اور ایک صاحبزادی لیڈی ڈاکٹر ایم بی بی ایس آپ کے پسماندگان ہیں ۔ صاحبزادگان چودھری ظفر عباس اور چودھری ساجد عباس دونوں انجنیئر ہیں ۔

کسی محفل میں اپنی داستاں ہوگی توکیا ہوگا
ہمارے ذکر سے محفل تپاں ہوگی تو کیا ہوگا

مزا جب ہے کہ وہ بھی سوزِ الفت سے جلیں ورنہ
چمن میں گر ہماری ہی فغاں ہوگی تو کیا ہوگا

جگر کو تھام کر بیٹھو ابھی تو ابتدا ہی ہے
ہماری داستانِ غم بیاں ہوگی تو کیا ہوگا

ہماری بے زبانی نے مرقع غم کا کھینچا ہے
زباں جب حالِ دل کی ترجماں ہوگی تو کیا ہوگا

ہمیں تو کنجِ وقت ہی غنیمت ہے کہ اچھا ہے
نصیب اپنے نہ سیرِ بوستاں ہوگی تو کیا ہوگا

ہزاروں رہ نوردانِ محبت گم ہوئے آخر
ہماری بھی اگر منزل زباں ہوگی تو کیا ہوگا

ابھی سے گردنیں خم ہیں نہفتہ ہو تو یہ عالم
تمہاری صورتِ اقدس عیاں ہوگی تو کیا ہوگا

حریمِ ناز سے قاصد پیامِ دل کشا لایا
اسیرِ خامشی اپنی زباں ہوگی تو کیا ہوگا

ہمیں تو سادگی دل کی بہت عباس بھاتی ہے
وگرنہ زندگی ہی جیستاں ہوگی تو کیا ہوگا

ناکامِ محبت برسوں میں محبوب کو قابو کر نہ سکا
کوشش تو بہت کی لفظوں نے دل رنگِ محبت بھر نہ سکا

میں سمجھوں عقل کی کوتاہی یا عشق کا افسوں ایسا تھا
جو کام سمجھ کر کرنا تھا وہ کام سمجھ کر کر نہ سکا

دنیا کے جھمیلوں میں پھنس کر انسان رہا ناشاد بہت
مرنے کی تمنا دل میں رہی پر موت سے پہلے مر نہ سکا

مشتاقِ تجلی آنکھوں کو اک جلوۂ طور نہ تھا ناکافی
من اپنا عشق میں ڈوبا تھا اک جلوے سے دل بھر نہ سکا

جو عشق کا مسلک مان چکا منصور انا الحق کہتا گیا
شبلی کی محبت خاک ہوئی پیماں وہ پورا کر نہ سکا

جو عشق میں پختہ کار ہوئے وہ راہ سے اپنی کم بھٹکے
تبریز صنم تو سہہ ہی گیا پر موت سے ہرگز ڈر نہ سکا

گلشن میں فراواں ساماں تھا گلچیں نے دامن بھر ہی لیا
کچھ میں ہی تہی اندیش رہا شبنم سے پیالہ بھر نہ سکا

یا سجدہ میں آتش بجھ ہی گئی یا قیس کا پہلو خالی تھا
تاروں کی فسردہ محفل کو آہوں سے فروزاں کر نہ سکا

عباس جنوں تو لاکھ کئے دل اپنا رہا بت کا دلدادہ
کعبے میں جا کر ٹک ہی سکا نہ یہ دیر میں جا کر مر ہی سکا

○

نہ تھی زبانِ زدِ خلائق یہ حکایتِ یگانہ — ترے حُسن کی کہانی مرے عشق کا فسانہ

مجھے یاد ہیں وہ دن بھی کہ بہ اضطرابِ پیہم — کسی سنگِ بے ستوں پر تھے سجود والہانہ

تھی جنوں کی یہ بھی منزل کہ وفورِ بیخودی میں — اُسے خود ہی توڑ ڈالا جو گھڑا تھا آشیانہ

جو بغور میں نے دیکھا تو کھُلا یہ راز آخر — تری زندگی کہانی ترا حسن اک فسانہ

مجھے کام کیا خرد سے کہ خرد حریف اپنی — میں وہ بے خرد ہوں ایسا مرے کام ابلہانہ

یہ ہے سرگزشتِ آدم کہ سفر میں زندگی کے — کہیں دامِ کم نگاہی کہیں گردشِ زمانہ

یہ فریبِ جاہ و زر تھا کہ سرودِ دلربا میں — کسی دل کے پھانسنے کا انہیں مل گیا زمانہ

جو غلامِ ابنِ حیدر ہے غریب اور بے زر

اُسے زیر کر سکے گی نہ شماتتِ زمانہ

○

نگاہِ حسرت تو ڈھونڈتی ہے بہارِ الفت کا وہ زمانہ — عدیلِ سینا چمن چمن تھا، چمن کا نقشہ تھا ساحرانہ

یمِ محبت سے مَیں نے چن کر صدف میں دل کی تھے پال رکھے — مرادِ دل کے کچھ ایسے موتی کہ رشکِ ہر تھا دانہ دانہ

عزیز تر ہے متاعِ الفت انہیں پیارا ہے یہ اثاثہ — لٹا ہوا قافلہ ہو جن کا عروج جن کا ہوا فسانہ

یہی جہاں میں رہی نشانی یہی ہے صحرا جہاں کہ مجنوں — عمارتِ سنگِ حسن لیلےٰ کا ڈھونڈتا تھا وہ آستانہ

بہارِ خنداں چمن میں آئی کمیں میں صیاد بھی تھا بیٹھا — بڑی بلا تھی قفس میں رہنا چمن کا چھوٹا جو آشیانہ

اگر کسی کی نگاہِ الفت دلِ حزیں کا بنے مداوا — سوادِ صحرا میں سوزِ دل کا بنا سجاؤں میں شادیانہ

نہیں ہے عبّاس اِس جہاں میں کسی پہ اب اعتماد باقی

فنا کا چرچا جہاں ہو ہر دم وفا کا پیماں ہو اک فسانہ

○

○

زندہ ہے دل کسی کی نظر کے ساتھ ساتھ   جیسے حباب موجۂ دریا کے ساتھ ساتھ

مجنوں دیارِ عشق میں مر کر بھی زندہ ہے   اڑتا ہے گردِ ناقۂ لیلےٰ کے ساتھ ساتھ

بے چارگی نے دل کی کیا اس کو مضمحل   ہمزاد ہوتا تھا مسیحا کے ساتھ ساتھ

کچھ سوزِ دل ہمارا ستاروں سے پوچھئے   کیا ملتہب تھا یہ شبِ یلدا کے ساتھ ساتھ

تاثیر ہے یہ سحرِ مخالف کی ایک تِل   گرمِ ستیز عارضِ رعنا کے ساتھ ساتھ

تم بھی قفس کو توڑ کر زنداں سے [illegible]دیو   بادِ بہار، گردشِ دنیا کے ساتھ ساتھ

کچھ گامزن ہیں راہِ محبت میں ہم سفر
عباس نیمجاں ہے مسیحا کے ساتھ ساتھ

○

اے صاحبِ لولاک! نظر ایک اِدھر بھی   روشن ہو مرے سینے میں ایماں کی سحر بھی

مَیں کشتۂ عصیاں ہوں مرا حال بُرا ہے   تُو شمسِ رسالت بھی نبوّت کا قمر بھی

تنویرِ ہدایت سے مرا دل ہو منوّر   تا رُوکشِ خورشید ہو یہ خستہ جگر بھی

جاری ہیں جو آنکھوں سے تری یاد میں آنسو   اعجاز سے بن جائیں وہ رحمت کے گُہر بھی

حاصل تمہیں وہ قرب کہ پایا نہ کسی نے   پہنچے ہو جہاں جلتے ہیں جبریل کے پر بھی

یٰسین ہو، طٰہٰ ہو، مزمّل ہو، مدثّر   ہو باعثِ تکوینِ نبوّت کا ثمر بھی

قدرت کا ہے شہکار تری ذاتِ یگانہ   بے مثل جہاں میں ترے قرآں کا اثر بھی

عبّاسِ دل افگار ہے دیدار کا طالب
اے صاحبِ تقدیر! نظر ایک اِدھر بھی

○

حور تھی یا نور کی تصویر عریاں ہو گئی
یا دسپس کی رفتہ رفتہ سوزِ پنہاں ہو گئی

چارہ سازی درد کی منتِ کشِ درماں بنی
یہ وہ سوزش ہے کہ خود ہی اپنا درماں ہو گئی

بستہ بر پا طائروں کو ہمصفیرانِ چمن
اک صدائے صبحگاہی گریہ ساماں ہو گئی

پہلے ہی کچھ کم نہ تھی تاریکیِ ہجر و فراق
آسماں پر کیوں دُمِ دُمدار عریاں ہو گئی

بجھ چکی تھی آخرِ شب شمعِ فانوسِ حیات
آج کیوں پھر شام کے ڈھلتے فروزاں ہو گئی

بے سبب بیچارگی دل کی بہ بینِ غم نہیں
اہلِ دل کو کثرتِ غم صبحِ خنداں ہو گئی

جنسِ اخلاص و محبت جس قدر نایاب ہے
اُس قدر جنسِ دغا دنیا میں ارزاں ہو گئی

شکوۂ اہلِ وفا عباس بے جا دہر میں
سازکی جب ہر صدا صوتِ پریشاں ہو گئی

اب کس کے انتظار میں دل بیقرار ہے
صبحِ بہار مثلِ خزاں ناگوار ہے

شامِ غمِ فراق کی افسردہ شمعِ دل
بزمِ سرود و ساز میں بھی سوگوار ہے

کمبخت ہے جنوں کی کبھی عقل کا فسوں
اس کشمکش میں دامنِ دل تار تار ہے

مرہم علاجِ آبلہ پائی نہ کر سکا
صد شکر چارہ ساز سہی نوکِ خار ہے

پیکِ بہار لایا نویدِ سمن تو کیا
اپنا جگر بھی مثلِ چمن داغدار ہے

عباس ساتھ دے نہ سکے اہلِ درد بھی
کس کا گلہ یہ گردشِ لیل و نہار ہے

نام سید علی اختر تخلص اختر ۔ زندگی زندہ دلی کا نام ہے ۔ اس نظریئے پر عمل پیرا ڈاکٹر سید علی اختر کی ہستی تمام عمر عزیز و احباب کی نظروں میں تحسین و ستائش کا مرکز بنی رہی ۔ وہ بچپن سے ہی خرابیٔ صحت اور مصیبت و آلام کا شکار رہے مگر نہ صرف خندہ پیشانی اِن مصائب کو جھیلتے رہے بلکہ علم و ادب کے شوق اور طبعی شگفتہ مزاجی کو بھی برقرار رکھا ۔

آپ شاہجہانپور (یو پی) میں ۱۸۹۴ء میں پیدا ہوئے ابھی انٹرنس کا امتحان پاس نہیں کیا تھا کہ ماں اور باپ دونوں کا سایہ سر سے اُٹھ گیا ۔ چھوٹے چھ بہن بھائیوں کی ذمہ داری اور نگہداشت کے باوجود اپنی تعلیم اور شوقِ ادب کو جاری رکھا ۔ ۱۹۲۴ء میں آگرہ میڈیکل کالج سے ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کی اور ضلع الہ آباد میں ملازم ہو گئے ۔ ملازمت مل جانے کے بعد ذرا یکسوئی ہوئی تو میدانِ شعر و ادب نے محفلِ سخن کا شائق بنا دیا اُن کے پیشے کی سختی اور مقراض و نشتر کی قطع کاری اِن لطیف جذبات کو پارہ پارہ کر دیتی اتنا وقت بھی نہ ملتا کہ چاکِ داماں کی بخیہ گری کر سکیں تاہم میز پر ڈاکٹری کی کتب سے زیادہ مشہور شعرا کے دیوان نظر آتے اور فرصت کے وقت اُن سے دل بہلاتے ۔ وہ اپنی زندہ دلی اور شگفتہ مزاجی سے ہمیشہ اپنے گھر بار اور مجلسِ احباب میں رونقِ محفل بنے رہتے ۔

ملکی انقلاب کے بعد ۱۹۴۷ء میں پاکستان آنا ہوا تو لاہور کے سر گنگا رام ہسپتال میں متعین ہوئے سخت ڈیوٹی کے باوجود مشقِ سخن جاری رہی ۔ اِس دَور میں بھی جبکہ وہ بے حد کم فرصت تھے اور صحت بھی پوری طرح ان کا ساتھ نہیں دے رہی تھی ۔ ڈاکٹروں کے ڈنر اور دوسری پارٹیوں میں اُن سے ایک نہ ایک غزل سُنانے کا شدید تقاضا ضرور ہوتا ۔ ماڈل ٹاؤن میں رہائش اختیار کی تو کوٹھی ۱۰۳ اسی میں انجمنِ ترقیٔ ادب کے منعقد ہونے والے مشاعروں میں متواتر شرکت

جواب دے گئی تھی اور غور و فکر پر بھی قابو نہ رہا تھا۔ اس کے باوجود طرحی غزل کہتے اور مشاعرے میں شرکت بھی کرتے۔ اتفاق دیکھئے کہ ۱۵ر نومبر ۱۹۶۴ء کو ہونے والے مشاعرہ کے لئے طرح مصرع یہ تھا۔
"جان سے ہم بھی گزر جائیں گے سوچا ہے یہی"۔ آپ اسی مصرع پر غزل کہتے کہتے ۱۳ر نومبر ۱۹۶۴ء کو اس محفلِ دنیا سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے۔ اُن کی یہ آخری اور ادھوری غزل ہمیں زندگی بھر خون کے آنسو رلائے گی انہوں نے جو کہا اس پر عمل کر دکھایا۔ وہ ان شاعروں میں سے نہیں تھے جو لفظی طور پر ہزار بار مر کر بھی زندہ رہتے ہیں۔ وہ سچے شاعر تھے۔ باعمل۔

○

○

کشتۂ تیغِ ستم ہوں درِ جاناں کے قریب — جاں گئی خوبئ تقدیر سے درماں کے قریب

آشیانہ کی مرے آج الٰہی ہو خیر — برق گرتی نظر آتی ہے گلستاں کے قریب

کب کمی پر ہے ابھی سلسلۂ شوقِ فنا — سر بکف سینکڑوں ہیں شمعِ فروزاں کے قریب

پھر بہار آئی مبارک ہو تمہیں اہلِ جنوں — چاک پھر آیا نظر آج گریباں کے قریب

قید سے چھوٹ کے بھی اپنی رہائی معلوم — لوگ زنجیر لیے ہیں درِ زنداں کے قریب

آشیاں باغ میں ہو میرا کہاں ایسے نصیب — اب بنایا ہے نشیمن درِ بستاں کے قریب

خلشِ زخمِ جگر میں نہ کمی ہونے پائے — مجھ کو رہنے دو ابھی اور نمکداں کے قریب

شاہ جی اب تو قدم آگے سنبھل کر رکھیے
خطرۂ جاں ہے ذرا چاہِ زنخداں کے قریب

○

پھولوں میں ہے یہ اور کسی کی نظر کا فیض — ظاہر میں کہتے ہیں اسے شمس و قمر کا فیض

ویرانہ ایک لمحہ میں گلزار ہو گیا — ذرّے چمک اُٹھے یہ ہے کس کی نظر کا فیض

زخمی ہوا جگر تو نہ محفوظ دل رہے — حاصل ہو کاش اِس کو بھی تیرِ نظر کا فیض

نامِ خدا شمار حسینوں میں ہو گیا — تم دیکھنا ذرا یہ ہماری نظر کا فیض

سائل ہی بن کے بیٹھ گئے اُن کی راہ میں — حاصل ہو ہم کو بھی ذرا اُس رہگذر کا فیض

رہتا تھا تشنہ کام سکندر کو دیکھیے — کچھ کام آ سکا نہ جنابِ خضر کا فیض

آتش بجاں جو رہتے ہو دن رات شاہ جی
معلوم ہوتا ہے ہمیں تیرِ نظر کا فیض

○

نامِ خدا ہے مجھ کو بہاروں سے ربط ضبط
آنکھوں کو ہے کسی کے نظاروں سے ربط ضبط

ہرگز بڑھا نہ شعلہ عذاروں سے ربط ضبط
اچھا نہیں ہے شوخ نگاروں سے ربط ضبط

اک جلوہ گاہِ حسن سے ہے مری راہ و رسم
بڑھنے لگا ہے مجھ کو بہاروں سے ربط ضبط

گو ہو چکا ہے ترکِ تعلق مگر ہنوز
رہتا ہے اب بھی شوخ نگاروں سے ربط ضبط

جس طرح خار و گل میں تعلق ہے اُس طرح
دورِ خزاں کو بھی ہے بہاروں سے ربط ضبط

نامہ کا میرے اب تو جواب آئے گا ضرور
پیدا کیا ہے نامہ نگاروں سے ربط ضبط

تنہائیاں ہیں مونس و غمخوار اب مری
رکھتا ہے کون ہجر کے ماروں سے ربط ضبط

کرتے ہیں وہ رقیبوں سے باتیں کھلی کھلی
لیکن ہے میرے ساتھ اشاروں سے ربط ضبط

کچھ کیجیے آپ ہی دلِ ناکام کا لحاظ
کرتا کوئی نہیں دلِ بدنام کا لحاظ

پینے پہ میں جو آؤں تو پی جاؤں خُم بہ خُم
مینا ہے کس شمار میں کیا جام کا لحاظ

میری وہ چلنے دیتا نہیں بزمِ ناز میں
کب تک کروں رقیبِ سیہ فام کا لحاظ

رکھتا ہوں شوقِ مے تری رحمت کی آس پر
رکھ لے مرے رحیم ذرا نام کا لحاظ

ساقی کی تھا نظر میں تو رہتا تھا جام پُر
اب کون ہے کرے جو مرے جام کا لحاظ

آتا ہے کوئی پردہ نشیں گاہے بام پر
رکھتا دلِ حزیں سحر و شام کا لحاظ

کیا کچھ نہ کہہ گیا ہوں خلافِ مزاجِ یار
رہتا کہاں جنوں میں ہے انجام کا لحاظ

تشنہ لبی کو میری یہاں پوچھتا ہے کون
ساقی نے بھی کیا نہ مرے جام کا لحاظ

مشہور ہو گیا ہوں زمانہ میں شاہ جی
رکھنا پڑے گا اب تو مجھے نام کا لحاظ

پایا ہے تیرے در پہ جبیں سائی کا صلہ
منسوب ہو گئے ہیں ترے آستاں سے ہم

اُستاد کی غزل پہ کہیں کس طرح غزل
آئے ہیں ایسے چوٹی کے شاعر کہاں سے ہم

رنجش ہماری ہو گئی گر پاسباں سے
اُٹھ جائیں کیا بتاؤ درِ مہرباں سے ہم

کھوئے گئے ہیں ایسے رہِ عاشقی میں ہم
واقف نہیں ہیں اپنے بھی نام و نشاں سے ہم

پیدا جو کی کلام میں کچھ گرمیٔ بیاں
مشہور ہو گئے ذرا آتش بیاں سے ہم

قاصد نہ کر سکے گا بیاں مدعائے دل
اُن سے کہیں گے حالِ دل اپنی زباں سے ہم

ہم بھی شکار ہیں کسی تیرِ نگاہ کے
لیکن یہ بات کیسے نکالیں زباں سے ہم

اے کاش تیرے ظلم و ستم ہنس کے سہہ سکیں
دو چار ہو رہے ہیں دلِ ناتواں سے ہم

اہلِ سخن کی بزم میں پڑھتے تو ہیں غزل
کیسے کریں مقابلہ اہلِ زباں سے ہم

درباں ہم سے رکھتا ہے پرخاش کیا کریں
جائیں بتا کدھر کو ترے آستاں سے ہم

ہر چند ہم کو عشق میں ناکامیاں ملیں
لیکن نہ باز آئیں گے عشقِ بتاں سے ہم

کرلیں ہم اُس سے ترکِ تعلق تو ناصحا
لائیں گے ایسا حُسن کا پیکر کہاں سے ہم

کہتے تھے یہ رُخی کی کریں گے شکایتیں
بیٹھے ہیں اُس کے سامنے بستہ دہاں سے ہم

مذہب یہی ہم نے عشق کا جب کر لیا قبول
رکھیں تو کیسے واسطہ سود و زیاں سے ہم

وہ چند ساعتیں کہ تھیں جو حاصلِ حیات
اب اُس بہارِ رفتہ کو لائیں کہاں سے ہم

روزِ ازل کسی نے لگائی تھی دل میں آگ
جلتے ہیں آج تک اُسی سوزِ نہاں سے ہم

ایمان بھی گنوا دیا، دولت بھی۔ شاہ جی
اُس بُت کے عشق میں گئے دونوں جہاں سے ہم

○

جنوں کی جب بیاباں میں بھی حیرانی نہیں جاتی میرے گھر کی نہ جائے خانہ ویرانی نہیں جاتی
دلِ مجروح خوں گشتہ چکیدہ از سرِ مژگاں جگر کی دیکھئے خوں نابہ افشانی نہیں جاتی

○

مری میت پہ آکر ہائے کس حسرت سے کہتے ہیں تمہارے خونِ ناحق کی پشیمانی نہیں جاتی
بہت ہمت شکن ہے گو غرورِ حسنِ عالم سوز نیازِ عشق کی پھر بھی تو ارزانی نہیں جاتی

○

نہ ہوتا حسن گر عریاں نہ عشق آتا سرِ منظر کبھی حسنِ ازل کی ہائے عریانی نہیں جاتی
گلستاں میں اثر ہے یہ مری نغمہ سرائی کا نواسنجانِ گلشن کی غزل خوانی نہیں جاتی

○

ہوئی ہے وحشتِ صحرا بہارِ زندگی اپنی نہیں معلوم پھر کیوں گھر کی ویرانی نہیں جاتی
ہر اک موجِ غمِ پنہاں بھی یکسر رشکِ طوفاں ہے مرے دریائے رنج و غم کی طغیانی نہیں جاتی

○

جنوں ہے انتہا پر خود فراموشی کا عالم ہے جو نظروں میں رہی صورت وہ پہچانی نہیں جاتی
نہ ہو کچھ بھی نوشاہ صاحب نہیں پیری مریدی کم
تمہارے حلوہ مانڈے کی فراوانی نہیں جاتی

○

رگِ تاک

کس قدر اے مَے تجھے رسمِ حجاب آئی پسند
پردۂ انگور سے نکلی تو میناؤں میں تھی

چودھری بشیر احمد

چودھری بشیر احمد خان ایک بلند پایہ ادیب، اچھے شاعر اور بہترین نقاد ہیں۔ آپ موضع بھور کا ہلوان تحصیل پسرور ضلع سیالکوٹ کے ایک نہایت معزز گھرانے میں یکم جون ۱۹۰۰ء کو پیدا ہوئے۔ آپ کے والد محترم چودھری غلام احمد صاحب پابندِ صوم وصلوٰۃ اور اہلِ دل بزرگ تھے۔ وہ سرکاری ملازمت میں تھے اور لدھیانہ، دہلی وغیرہ میں متعین رہے۔ چودھری بشیر احمد خان ہر جگہ ان کے ہمراہ رہے۔ آپ کی ابتدائی ذہنی تربیت آپ کے والدِ بزرگوار ہی کے فیضانِ نظر سے ہوئی۔ ۱۹۱۲ء میں وہ انتقال فرما گئے۔

چودھری بشیر احمد خان نے انٹرنس کا امتحان گورنمنٹ ہائی سکول سیالکوٹ سے پاس کیا۔ انٹرنس پاس کرنے کے بعد آپ نے اسلامیہ کالج لاہور میں داخلہ لیا اور وہاں سے ۱۹۲۲ء میں بی اے پاس کیا۔ کالج میں آپ کو عربی کے مضمون اور شعر و شاعری سے بہت شغف رہا۔ ۱۹۲۵ء میں آپ نے لاء کالج لاہور سے ایل ایل بی کا امتحان کیا اور لاہور ہی میں وکالت کی پریکٹس شروع کردی۔ آپ پانچ سال تک وکالت کی پریکٹس کرتے رہے پھر پی سی ایس (جوڈیشیل) کے امتحانِ مقابلہ میں شریک ہوگئے جس میں نمایاں کامیابی حاصل کی اور ۱۹۳۰ء میں سب جج بنا دیئے گئے۔

دس سال تک آپ سب جج رہے اور بھیرہ، مظفر گڑھ، جگادھری، دہلی وغیرہ میں آپ کا تقرر رہا۔ ۱۹۴۰ء میں آپ مرکزی حکومتِ ہند کے محکمہ سپلائی میں چلے گئے۔ ۱۹۵۵ء میں آپ پاکستان کے محکمہ سپلائی سے پلاننگ کمشن میں منتقل ہوئے اور ۹ نومبر ۱۹۵۷ء کو آپ پاکستان انڈسٹریل کریڈٹ اینڈ انوسٹمنٹ کارپوریشن کے جسے اختصار سے پک اک کہا جاتا ہے ڈپٹی منیجنگ ڈائریکٹر لاہور ریجن مقرر ہوئے۔ تاحال آپ اسی عہدے پر فائز ہیں اور ماڈل ٹاؤن لاہور میں مستقل رہائش رکھتے ہیں۔

چودھری بشیر احمد خان کا حلقۂ احباب ہمیشہ بہت وسیع رہا ہے۔ اعلیٰ معاشرتی حلقوں میں آپ

کا بہت احترام کیا جاتا ہے ۔ آپ کی گفتگو میں تنقید کا پہلو اور خود اعتمادی کی جھلک نمایاں ہوتی ہے طبیعت میں فراخی اور نظر میں وسعت ہے ۔ آپ کی پیدائش یکم جون کو ہوئی ۔ علمِ نجوم کی زبان میں آپ کا بحیثیت مجموعی کردار آفتاب اور عطارد کا کامیاب ترین و حسین امتزاج ہے ۔

چودھری صاحب شعر کے حسن و قبح ، صنائع بدائع ، وزن ، بحر ، سے پوری طرح واقف ہیں ۔ خود شعر کہہ سکتے ہیں اور کہہ لیتے ہیں لیکن آپ کو شعرا کی صف میں شریک ہونے سے اس لیے احتراز ہے کہ آپ کبھی کبھار جو کچھ کہتے ہیں وہ شاذ کے ذیل میں آتا ہے اور شاذ کے ذیل میں آنے والا سخن آپ کے نزدیک پختہ شاعر نہیں ہوتا ۔ شعر پر آپ کی تنقید سمینہ معیاری اور بے لاگ ہوتی ہے ۔ اصنافِ شاعری میں سے آپ کو غزل پسند ہے ۔ اور غزل میں حسرت موہانی کا انداز زیادہ مرغوب ہے ۔

آپ کو ہزار ہا شعر زبانی یاد ہیں ۔ جن کے برمحل استعمال کی بدولت بعض دفعہ بے کیف سے بے کیف محفل بھی رنگ پر آجاتی ہے ۔ آپ پابند صوم و صلوٰۃ اور اہلِ دل ہیں ۔ مذہبی کتب اور شعر و شاعری کا مطالعہ آپ کا خاص شغف ہے ۔ فلاکت زدہ شعرا و ادبا کی دامے درمے مدد کرتے رہتے ہیں ۔ تعمیری نقطۂ نظر رکھنے والا اندازِ زندگی آپ کو بہت پسند ہے ۔ وہ خواہ کسی کا ہو ۔

آپ انجمن ترقی ادب ماڈل ٹاؤن کے وائس پریذیڈنٹ ہیں اور اس کے معاملات میں ہر لحاظ سے گہری دلچسپی لیتے ہیں ۔

○

شیخ اعجاز احمد

شیخ اعجاز احمد ایک بہترین نقادِ نظم و نثر، بلند پایہ ادیب، شاعر، ادب دوست اور ادیب نواز آدمی ہیں شعر کہنے میں کم کم۔ جو کچھ کہتے ہیں خوب کہتے ہیں لیکن شعراء کے زمرہ میں شمار ہونے میں انہیں تامل ہے۔ اعجاز تخلص کرتے ہیں۔

شیخ اعجاز احمد ۱۸۹۹ء میں سیالکوٹ میں ایک نہایت معزز کشمیری خاندان میں پیدا ہوئے۔ آپ شاعرِ مشرق ڈاکٹر اقبال کے بھتیجے ہیں آپ کے والدِ محترم شیخ عطا محمد مرحوم ایم ای ایس میں انجنیر تھے۔ ڈاکٹر اقبال اور شیخ عطا محمد سگے بھائی تھے۔ ڈاکٹر صاحب کو اپنے بھائی شیخ عطا محمد سے بے حد محبت تھی۔ ایسی محبت جس کی مثال عام بھائیوں میں کم ملتی ہے۔ حقیقت میں وہ انہیں اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ ڈاکٹر اقبال نے بھائی سے اپنی محبت کا اظہار اشعار میں بھی جابجا کیا ہے چنانچہ ڈاکٹر صاحب جب بیرسٹری کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے عازمِ انگلستان ہونے لگے تو دہلی میں حضرت نظام الدین اولیا کے مزار پر حاضر ہوئے اور ایک بڑی پُرسوز دعا کی جو بانگِ درا میں "التجائے مسافر" کے عنوان سے درج ہے۔ اس دعا میں ڈاکٹر صاحب نے خدا تعالیٰ سے اپنے بھائی شیخ عطا محمد مرحوم کے لئے بالفاظ ذیل التجا کی ؎

وہ میرا یوسفِ ثانی، وہ شمعِ محفلِ عشق　　ہوئی ہے جس کی اخوت قرارِ جاں مجھ کو
جلا کے جس کی محبت نے دفترِ من و تو　　ہوائے عشق میں پالا کیا جواں مجھ کو
ریاضِ دہر میں مانندِ گل رہے خنداں　　کہ ہے عزیز تر از جان وجانِ جاں مجھ کو

شگفتہ ہو کے کلی دل کی پھول ہو جائے
یہ التجائے مسافر قبول ہو جائے

اسی طرح ڈاکٹر اقبال ایک دوسری نہایت پُرسوز نظم "والدہ مرحومہ کی یاد میں" جو بانگِ درا میں شامل ہے ۔ اپنی والدہ مرحومہ و مغفورہ سے اپنے اس بھائی کے متعلق فرماتے ہیں ؎

عمر بھر تیری محبت میری خدمت گر رہی   مَیں تری خدمت کے قابل جب ہُوا، تُو چل بسی

وہ جواں قامت میں ہے جو صورتِ سروِ بلند   تیری خدمت سے ہوا جو مجھ سے بڑھ کر بہرہ مند

کاروبارِ زندگانی میں وہ ہمسم پہلو مرا   وہ محبت میں تری تصویر، وہ بازو مرا

تجھ کو مثلِ طفلکِ بے دست و پا روتا ہے وہ   صبر سے ناآشنا صبح و مسا روتا ہے وہ

تخم جس کا تُو ہماری کشتِ جاں میں بو گئی
شرکتِ غم سے وہ اُلفت اور محکم ہو گئی

شیخ عطا محمد کا انتقال ۱۹۴۰ء میں ہوا ۔

شیخ اعجاز احمد کی زیادہ ذہنی تربیت اپنے گھر ہی میں ہوئی جس کی فضا نہایت پاکیزہ اور ماحول صیقل گر فکر و نظر تھا ۔ مذہب و معاشرت کے مبادی آپ نے وہیں سے سیکھے ۔

باقاعدہ تعلیم کے لئے آپ سیالکوٹ کے مشن سکول میں داخل ہوئے اور وہیں سے ۱۹۱۴ء میں انٹرنس کا امتحان پاس کیا ۔ شیخ اعجاز احمد کے چچا ڈاکٹر اقبال کے استاد میر حسن مرحوم اسی سکول میں ٹیچر تھے ۔ آپ اُن کے شاگرد رہے ۔ اور اُن کے فیضانِ صحبت سے خوب استفادہ کیا ۔

اعلیٰ تعلیم کے لئے شیخ اعجاز احمد لاہور آ گئے اور یہاں کے اسلامیہ کالج میں داخلہ لیا ۔ تعلیم کالج کے دوران آپ نے تقریر و تحریر میں خوب نام پیدا کیا اور مارٹن ہسٹاریکل سوسائٹی کے سیکرٹری رہے ۔

اسلامیہ کالج لاہور سے بی اے پاس کرنے کے بعد آپ لاہور ہی کے لا کالج میں داخل ہو گئے اور ۱۹۲۱ء میں وکالت کی ڈگری حاصل کی ۔ اب آپ سیالکوٹ واپس چلے گئے اور وہاں وکالت کی پریکٹس کرنے لگے ۔ ۱۹۲۶ء میں آپ سب جج بنا دیئے گئے جسے اب سول جج کہتے ہیں ۔

کچھ عرصہ بعد لاہور ہائی کورٹ نے شیخ اعجاز احمد کو کمرشل ٹریننگ کے لئے چھ مہینے کے واسطے بمبئی بھیجا ۔ ۱۹۳۵ء میں آپ دہلی کے کمرشل جج لگائے گئے ۔ برطانوی حکومت ہند کا پایۂ تخت، ہندوستان کا معاشرتی مرکز اور ملکی و غیر ملکی صنعت کاروں کا مستقر ہونے کی وجہ سے دہلی کو خاص اہمیت حاصل تھی ۔ اس لئے وہاں کمرشل جج کا عہدہ قطعی طور پر غیر معمولی حیثیت رکھتا تھا ۔ ساتھ ہی تحریص اور لالچ کا میدان بہت وسیع تھا ۔ لیکن

آپ نہ صرف اِس میں کامیاب رہے بلکہ وہاں اس عہدے پر آپ کے چھ سال فائز رہنے سے خود اِس عہدے کا وقار بلند سے بلند تر ہو گیا۔

یوں تو آپ کے بے مثال انصاف کے بیسیوں واقعات کی گونج متحدہ ہندوستان کے گوشے گوشے میں اکثر سنائی دیتی رہی لیکن ایک واقعہ نے دہلی کے پورے معاشرے پر نہایت گہرا اثر کیا جس کا تذکرہ کئی سال تک دہلی کی ہر مجلس، ہر گلی کوچے میں ہوتا رہا۔ بات یہ تھی کہ مسلمانانِ دہلی کے ایک قبرستان کی وقف زمین کے ایک حصے پر ایک بہت بڑے تاجر نے قبضہ کر رکھا تھا۔ زمین بہت قیمتی تھی اور رقبہ خاصا وسیع تھا۔ اس معاملہ میں اس تاجر کی حمایت کے لئے اُس کے پیچھے کئی خان بہادروں اور بڑے بڑے سرمایہ داروں کی قطار کھڑی تھی۔ جن کے رسوخ کا سکّہ دہلی سے بمبئی تک چلتا تھا۔ اُن کے مقابلے میں آنے کی کسی میں جرأت نہ تھی۔ مگر کسی غریب نے نالش دائر ہی کر دی۔ مقدمہ شیخ اعجاز احمد کے سپرد ہوا۔ سماعتِ مقدمہ کے دوران سامعین اور تماشائیوں کا یہ تاثر تھا کہ انصاف کی یہ کرسی ایسی ہے کہ خود ملکِ معظم بھی اس پر بیٹھ جائے تو وہ مجبوراً فیصلہ خان بہادروں ہی کے حق میں دے گا انہیں کون ناراض کر سکتا ہے۔

کئی طویل سماعتوں کے بعد شیخ اعجاز احمد نے اس مقدمے کا فیصلہ تاجر کے خلاف سُنایا تو دہلی سے لے کر بمبئی تک تمام سرمایہ دار طبقہ سناٹے میں آ گیا۔ غیر متوقع فیصلے پر دہلی کے تمام اخبارات نے خاص ضمیمے شائع کئے۔ مسلمان غربا نے ہر بازار اور ہر کوچے میں جلوس نکالے۔ ہزاروں اور سینکڑوں کی تعداد میں مسلمان گروہ در گروہ دیوانہ وار اللہ اکبر کے نعرے لگاتے پھرے۔ کئی گروہوں نے جھنڈوں سے سرمایہ داری کے بُت بنا کر بازاروں میں جلائے اور وہ غل غپاڑہ ہوا کہ پولیس کو نظم و ضبط قائم رکھنا مشکل ہو گیا۔

شیخ اعجاز احمد چھ سال بعد دہلی سے امرتسر تبدیل ہوئے۔ وہاں تھوڑے عرصہ بعد فوڈ ڈیپارٹمنٹ میں لے لئے گئے۔ تقسیم ملک پر حکومتِ پاکستان نے آپ کو مرکزی فوڈ ڈیپارٹمنٹ کا مستقل جائنٹ سیکرٹری مقرر کیا۔ ۱۹۵۴ء میں آپ اس آسامی سے ریٹائر ہوئے اور پی آئی ڈی سی کے سیکرٹری بنا دیئے گئے وہاں سے آپ ۱۹۵۷ء میں ریٹائر ہوئے تو اقوامِ متحدہ نے اپنی تنظیم ایف اے او (فوڈ اینڈ ایگریکلچر آرگنائزیشن) کی طرف سے آپ کو حکومتِ پاکستان کا ایڈوائزر مقرر کر دیا۔ اِس وقت آپ اسی عہدے پر فائز ہیں۔

شیخ اعجاز احمد نہایت پاکیزہ کردار، وسیع النظر، راست گفتار اور فراخ مشرب انسان ہیں۔ ان کے ان ہی اوصاف کی وجہ سے شاعرِ مشرق ڈاکٹر اقبال مرحوم کو اپنے اِس بھتیجے سے بے حد محبت تھی۔

چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے اپنی وصیت کے ذریعے اپنے بچوں کے جو تین ولی مقرر کئے تھے۔ اُن میں ایک شیخ اعجاز احمد تھے۔ دوسرے دو ولی چودھری محمد حسین اور منشی طاہر الدین تھے۔

شیخ اعجاز احمد ایک بلند پایہ ادیب اور شاعر ہیں۔ مگر انہیں تمام فنونِ لطیفہ سے گہرا فطری لگاؤ ہے ممکن ہے ان سب کی پوری ٹکنیک پر آپ کو پورا عبور حاصل نہ ہو مگر ان کے متعلق آپ کی رائے ہمیشہ درست تسلیم کی گئی ہے۔ ذوق، ایک وجدانی چیز ہے۔ ٹکنیک سراسر اکتسابی ہے۔ وجدان کبھی غلطی نہیں کرتا۔

آپ کے قیام دہلی، امرتسر، کراچی کے دوران شعرا اور باکمال جم غفیر ہمیشہ آپ کے گرد وپیش رہا۔ اور آپ کی پسند کو اپنی نظم ونثر کی صحت اور فصاحت و بلاغت کے لئے سند سمجھا۔

شیخ اعجاز احمد مستقل طور پر کراچی میں مقیم ہیں۔ مگر اپنے فرائض کی بجا آوری کے لئے اور بعض دوسری وجوہ کے باعث لاہور آتے رہتے ہیں۔ آپ گذشتہ تین سال سے انجمن ترقی ادب ماڈل ٹاؤن سے منسلک ہیں اور اس کی مجلس انتظامیہ کے ممبر ہیں۔ اس کے کئی انعامی مشاعروں میں آپ جج کے فرائض بھی سرانجام دے چکے ہیں۔ شعر و ادب سے آپ کے غیر معمولی لگاؤ کا اندازہ اس حقیقت سے ہو سکتا ہے کہ انجمن ترقی ادب کے مشاعرہ میں شرکت کی خاطر دو دفعہ آپ اپنا غیر ملکی دورہ دو ایک دن کے لئے ملتوی کر دیتے رہے۔

مرزا اصلاح الدین

مرزا اصلاح الدین انجمن ترقی ادب ماڈل ٹاؤن کے ایک ممتاز اور سرگرم رکن ہیں۔ انجمن کے مشاعروں اور ادبی نشستوں میں باقاعدگی سے شریک ہوتے اور انعامی مشاعروں میں جج کے فرائض انجام دیتے رہے ہیں۔ آپ سول سب جج ہیں۔ پہلے لاہور میں تقرر تھا۔ اب پاکپتن تبدیل ہو گئے ہیں۔

مرزا صاحب کے اجداد مغل شہنشاہ شاہجہان کے زمانہ میں بخارا سے وارد ہندوستان ہوئے اور لاہور میں مقیم ہو گئے۔ وہ دو بھائی تھے۔ مرزا ساقی بیگ اور مرزا باقی بیگ۔ جلد ہی مرزا باقی بیگ نے دلی کا رخ کیا اور وہاں جا آباد ہوئے۔ مرزا ساقی بیگ لاہور میں رہ گئے۔

مرزا باقی بیگ دلی جا کر شاہجہان کے دربار سے منسلک ہو گئے اور قطب مینار کے آس پاس کے علاقہ میں جسے مہرولی کہتے ہیں شاہی جاگیر پائی۔ اس جاگیر سے متعلق شاہی فرامین ابھی تک اس خاندان کے پاس موجود ہیں۔ وہ جاگیر ۱۸۵۷ء تک اس خاندان کے پاس رہی۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد انگریزی حکومت نے اس جاگیر کا الحاق کر لیا۔

مغل حکومت نے مرزا باقی بیگ کو لاہور کا کوتوال مقرر کیا۔ دو ہزاری منصب عطا کیا اور داروغہ فیل خانہ بنا دیا۔ پھر انہیں باقی خان کا خطاب ملا۔ ان کے پوتے مرزا حمید الدین 'بخشی' چہارم مقرر ہوئے اور شش ہزاری کا منصب پایا۔ ایک دفعہ اورنگ زیب عالمگیر پر شیر نے اچانک حملہ کر دیا۔ مرزا حمید الدین موجود تھے۔ انہوں نے طپنچے سے شیر کا کام تمام کر دیا اس پر انہیں طپنچۂ عالمگیری کا خطاب ملا۔ ۱۸۵۷ء کے غدر میں مرزا اصلاح الدین کے اکثر بزرگ موقع پر کام آئے۔ جو بچے انگریز نے انہیں پھانسی پر لٹکا دیا جو زندہ رہ گئے انہوں نے بھاگ کر ریاستوں میں پناہ لی۔ چنانچہ وہ لوگ ۱۹۴۷ء تک ہندوستان

کی ریاستوں میں ملازمت کرتے رہے۔ آپ کے پردادا خان بہادر مرزا رشید الدین خاں ریاست بھرتپور اور بعد میں راجپوتانہ کی ریاست قرولی میں کونسل آف منسٹرز کے رکن رہے۔ آپ کے دادا مرزا بشیر الدین خاں ریاست بھرتپور سے منسلک رہے اور ۱۹۲۹ء میں ریٹائر ہوئے۔ آپ کے والدِ محترم نے رڑکی سے انجینئرنگ کی ڈگری لی اور ریاست ہائے گوالیار، دتیہ، جھانسی، ٹونک میں انجینئر رہے۔ ان کا تقرر گوالیار میں تھا جب مرزا صلاح الدین تولد ہوئے۔

مرزا صلاح الدین ۲۳ ستمبر ۱۹۳۲ء کو گوالیار میں پیدا ہوئے۔ آپ ابتدا میں اپنے دادا کے پاس ریاست بھرتپور میں رہے اور وہیں نجی طور پر ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ آپ کے استاد کا نام عبدالعزیز تھا۔ انہوں نے صرف آپ میں محنت کا جذبہ اور مطالعہ کا شوق ہی پیدا کر دیا بلکہ آپ کی تعلیم کی بنیاد پختہ کر دی جس کے بعد آپ امتحانوں میں ہمیشہ نمایاں کامیابی حاصل کرتے رہے۔ ۱۹۴۰ء میں آپ نے دلی کے جامعہ ملیہ میں داخلہ لیا۔ اُس زمانہ میں اس کے پرنسپل بھارت کے موجودہ نائب صدر ڈاکٹر ذاکر حسین تھے۔ ان کی شخصیت اور ذاتی توجہ نے مرزا صلاح الدین پر گہرا اثر ڈالا۔ کچھ عرصہ آپ نے نیا ہیڑہ میں تعلیم پائی۔ یہ قصبہ چتوڑ گڑھ سے اٹھارہ میل ہے۔ یہاں سے آپ حیدر آباد دکن چلے گئے جہاں آپ کے نانا کے سسرال تھے۔ حیدر آباد کی فضا آپ کو بہت پسند آئی اور وہاں سکول میں داخل ہو گئے۔ آپ وہاں مدرسہ عالیہ (نظام کالج) میں زیرِ تعلیم تھے کہ ۱۹۴۸ء میں بھارت نے حیدر آباد پر قبضہ کر لیا۔ اس پر آپ کراچی چلے آئے جہاں آپ نے پارسی ہائی سکول میں داخلہ لے لیا۔ اِس سکول میں آپ کا قیام مختصر رہا مگر اس کے پرنسپل مسٹر بہرام سہراب رستم جی اور وائس پرنسپل مسٹر مینوالہ کی توجہ نے آپ کے ذوق و وجدان کو خوب ابھارا یہیں سے آپ نے انٹرنس پاس کیا اور سندھ مسلم کالج کراچی میں داخلہ لے کر بی اے اور ایل ایل بی کے امتحانات پاس کئے۔ کچھ عرصہ کراچی میں وکالت کی پریکٹس کرنے کے بعد آپ پی سی ایس (جوڈیشل) کے امتحانِ مقابلہ میں شریک ہو گئے۔ اس میں نمایاں کامیابی حاصل کی اور سب جج بنا دیئے گئے۔ سمندر میں تیرنا اور مچھلی پکڑنا آپ کے محبوب مشغلے رہے۔ آپ کراچی میں سکاؤٹس ایسوسی ایشن کے ممبر تھے۔

شعر و ادب سے آپ کا لگاؤ بچپن ہی سے ہے۔ آپ کے اِس ذوق کو اُجاگر کرنے اور دوام دینے میں آپ کے محترم استاد عبدالعزیز کا بڑا حصہ ہے۔ یہ نیا ہیڑہ سکول میں ٹیچر تھے اور خود ایک اچھے شاعر تھے۔ وہ اپنے شاگردوں میں شعر خوانی کا جذبۂ مسابقت پیدا کرنے کے لئے کئی پروگرام بناتے رہتے اور سکول میں مشاعرے بھی منعقد کراتے۔ اُس زمانہ میں مرزا صلاح الدین خاصے شعر کہتے رہے۔ آپ اختر تخلص

کرتے تھے۔

اردو شعراء میں آپ کو غالب، اختر شیرانی، جگر، جوش بہت پسند ہیں۔

مرزا صلاح الدین کا اصول زندگی یہ ہے کہ خود زندہ رہو اور دوسروں کو زندہ رہنے دو۔ دوسروں کے لئے وہی کچھ پسند کرو جو اپنے لئے پسند کرتے ہو۔ آپ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے اس قول سے سو فی صد متفق ہیں اور یہی آپ کا فلسفۂ حیات ہے۔

"کسی مذہب کی پیروی محض یہ سمجھ کر کرنا کہ صرف اس کی پیروی سے ہی نجات حاصل ہو جائے گی، جہالت ہے۔"

آپ کا پختہ خیال ہے کہ مذہب ایک ذریعہ ہے اخلاق و کردار بلند کرنے کا اگر کوئی شخص اچھے سے اچھے مذہب کا پیرو ہوتے ہوئے بھی اپنا اخلاق و کردار بلند نہ کر سکے تو صرف اس مذہب کی پیروی اسے نجات کا مستحق نہیں بنا سکتی۔ اس کے برعکس اگر کوئی شخص خراب سے خراب مذہب کا پیرو ہو یا کسی مذہب کی پیروی نہ کرے لیکن اس کا اخلاق و کردار بلند ہو تو وہ جنت کی توقع کر سکتا ہے۔ مذہب رسوم کو نہیں کردار کو جنم دیتا ہے۔ اور جنت کردار سے ملتی ہے رسوم نہیں۔

مرزا صاحب شیریں گفتار، متحمل مزاج، بلند نظر اور دور بین انسان ہیں۔

○

سیّد محمد کہف الوری کیف

نام محمد کہف الوریٰ عرف محمد اسلم کیف ۔ کیف صاحب بیک وقت مصور، شاعر، ادیب اور موسیقار ہیں ۔ لیکن جس فن میں آپ نے کمال حاصل کیا اور جسے ذریعۂ روزگار بنایا وہ مصوّری ہے ۔ آپ ایک بڑے مقدّس گھرانے کے چشم و چراغ ہیں ۔ آپ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدّث دہلوی ، حضرت شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی، حضرت خواجہ باقی باللہ کے نسب سے ہیں ۔ آپ کے دادا کا نام مولوی محمد حسین تمنّا تھا جن کی ایک بہن کی شادی نواب اسمٰعیل علی خان والیٔ جھاجھر سے ہوئی ۔ نواب اسمٰعیل علی خان ۲۲ گاؤں کے مالک تھے ۔ غدر میں یہ انگریز کے زیرِ عتاب آئے تو رشتہ داری کی بنا پر مولوی تمنّا صاحب کی تلاش بھی شروع ہوگئی ۔ مولوی تمنّا صاحب یک دم روپوش ہوگئے اور حیدرآباد دکن میں پناہ لی ۔ دس سال بعد کچھ امن ہوا تو بیوی بچوں کی تلاش میں نکلے ۔ دورانِ سفر سکندرآباد ضلع بلند شہر کی ایک مسجد میں اپنے ہی بیٹے سے، جو اب بڑا ہو چکا تھا اور ان کو پہچانتا نہیں تھا، بڑے ڈرامائی انداز میں ملاقات ہوگئی اور ان کے بیوی بچے مل گئے ۔ کچھ عرصہ بعد ان کے ہاں ایک بچہ پیدا ہوا جس کا نام الطاف حسین رکھا گیا ۔ یہ کیف صاحب کے والد تھے جو انٹرنس کا امتحان پاس کرنے کے بعد فنِ سپہگری کے شوق میں ملٹری میں ملازم ہوگئے اور رجمنٹ میں بحیثیت صوبیدار مقرر ہوئے ۔ ۱۹۰۲ء کی جنگِ چین میں یہ مسٹر چرچل کے ہمراہ تھے ۔ پہلی جنگِ عظیم کے اختتام پر انہیں پنشن مل گئی اور سب رجسٹرار بنا دیئے گئے ۔ ۱۹۲۴ء میں حکومتِ برطانیہ نے عرب ممالک میں بعض خدمات ان کے سپرد کیں ۔ جن کے صلہ میں انہیں خان صاحب کا خطاب ملا اور انہیں وہاں اعلیٰ سطح پر مسلمانوں کی خدمت کرنے کے بعض نایاب موقع بھی مل گئے

ان کے پانچ بچے ہیں ۔ کیف صاحب ان میں سب سے چھوٹے ہیں ۔

سید کیف الوریٰ عرف محمد اسلم کیف ــــــــــ دہلی میں پیدا ہوئے ۔ آپ کے گھر والوں کا ارادہ تھا کہ

پ انجینئر بنیں ۔ چنانچہ حسبِ مطلوبہ ابتدائی تعلیم کے بعد آپ ٹیکنیکل سکول میں داخل کئے گئے ۔ آپ انجینئرنگ کی
لیم تین سال حاصل کر چکے تھے کہ دہلی کے شہرہ آفاق مصور نذیر حسین صاحب سے آپ کی ملاقات ہوگئی ۔
لہ وکٹوریہ کے زمانہ میں لندن میں مصوری کی ایک عالمی نمائش ہوئی تھی جس میں نذیر حسین کو سونے کا میڈل ملا
نا اور ملکہ وکٹوریہ نے انہیں چار سال کے لئے اپنا استاد مقرر کیا تھا ۔ کیف صاحب نے نذیر حسین کا احترام
رتر تک و احتشام دیکھا تو انجینئرنگ کی طرف سے دل سرد ہو گیا اور مصوری کا شوق کا لگا ۔ چنانچہ آپ نے
ینئرنگ کی تعلیم چھوڑ دی اور مصوری میں شاگردی کے لئے نذیر حسین کی طرف رجوع کیا ۔ نذیر حسین نے آپ
شاگرد بنانے سے انکار کر دیا ۔ آپ دل برداشتہ ہو کر میرٹھ کے محمود حسین پینٹر کے شاگرد بن گئے ۔ وہاں
ائن بورڈ بنانے سیکھے ۔ اتنے میں نذیر حسین کا دل پسیج گیا اور انہوں نے کیف صاحب کو اپنی شاگردی میں
لیا ۔ لیکن استاد شاگرد کا یہ تعلق زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا اور آپ کو اپنے ذوق ہی کا سہارا لینا پڑا ۔ اب
کو طب پڑھنے کا شوق دامنگیر ہوا ۔ اور آپ حکیم ناصر نذیر فراق کے شاگرد بن گئے ۔ حکیم صاحب نے
پ کے مبادی سکھانے کے بعد آپ کو اپنے بیٹے حکیم ناصر خلیق فگار دہلوی کے سپرد کیا کہ وہ آپ کو ستار
انا سکھا دے ۔ انہوں نے فرمایا کہ ستار کے تاروں کے ارتعاش اور نبضِ انسانی میں گہری مشابہت ہے
با ب حکیم بننے کے لئے پہلے نباض کامل بننا ضروری ہے اور نباضِ کامل اس وقت بن سکو گے جب ستار
تاروں کا ارتعاش سمجھ سکو گے ۔ چنانچہ کیف صاحب طب میں تو کامل نہ ہو سکے مگر انہیں گانے اور ستار
نے کی بڑی مہارت ہوگئی ۔ اور ساتھ ہی شعر و ادب کا ذوق بیدار ہو کر آپ کے رگ و ریشے پر مستولی
با ۔ اب آپ نے خوب غزلیں اور نظمیں لکھیں اور رسائل میں شائع کرائیں اور اخبار ناطق دہلی کے ایڈیٹر
گئے ۔ ان مصروفیتوں میں وقت کا ضیاع زیادہ اور مستقبل کے سنورنے کی امید کم تھی ۔ گھر والوں نے
ت کی تو شعری، ادبی، صحافتی سرگرمیاں چھوڑ کر پھر مصوری کی طرف رجوع کیا اور بڑی محنت شاقہ سے
مصوری میں کمال حاصل کر لیا ۔ ابھی آپ نسبتاً چھوٹی عمر کے تھے کہ فنِ مصوری میں آپ کو قبول عام کی
مل گئی ۔ ۱۹۳۳ء میں آپ وائس ریگل لاج شملہ میں بلائے گئے اور وائسرائے کے آرٹسٹ مقرر ہوئے ۔
راجوں مہاراجوں نے بھی آپ کا رُخ کیا ۔ اہلِ فن نے آپ کے ہاتھ چومے اور کئی شہزادے، راجمار
دیاں اور راجکاریاں مصوری میں آپ کی شاگرد بن گئیں ۔ ۱۹۴۷ء میں آپ ہجرت کر کے پاکستان آئے
ل ٹاؤن لاہور میں مستقل سکونت اختیار کی ۔
آپ کی شادی حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلوی علیہ رحمتہ کے خاندان میں سید محمد سلیم الحق حقی دہلوی
شہزادی انور جہاں صاحبہ سے ہوئی ۔ وہ بھی ایک بلند پایہ ادیبہ اور شاعرہ ہیں اور انجمن ترقیِ ادب

ماڈل ٹاؤن کی رکن ہیں ۔ وہ پردہ کی پابند ہیں ۔ انجمن کے کئی پانزدہ روزہ مشاعروں میں شرکت کر کے اپنا کلام پیش کر چکی ہیں اور کئی مطبوعات کی مصنف ہیں ۔

کیف صاحب نے اپنے رنگ میں ملکی خدمت بھی بہت کی ہے ۔ آپ لمبا عرصہ خاکسار تحریک سے منسلک رہے ہیں ۔ آپ اس تنظیم کے مختلف عہدوں پر فائز رہے جیسے سالارِ معاونین ، ناظمِ بکلاد خاص ، حاکم اعلیٰ ، خزانچی وغیرہ وغیرہ اور اس تنظیم کے خلافِ قانون قرار دیئے جانے پر خاصے پریشان کئے گئے ۔

لمبے عرصہ سے آپ نے انارکلی لاہور میں کیف سٹوڈیو قائم کر رکھا ہے ۔ وہاں مصوری کرتے ہیں ۔ آپ کا شمار پاکستان کے چند کامیاب ترین مصوروں میں ہے ۔ انجمن ترقی ادب ماڈل ٹاؤن لاہور کے مشاعروں میں بلاناغہ شریک ہوتے ہیں اور اس کے باقاعدہ ممبر ہیں ۔

○

خلیل الرحمٰن خاں

محمد خلیل الرحمٰن ادیب ہیں ۔ شاعر نہیں ۔ آپ کا اصلی وطن فرخ آباد سے بیس میل دُور موضع مرائے اگدہ ہے ۔ وہاں آپ کے آباؤ اجداد کی خاصی زرعی زمین تھی ۔ آپ کے والد محترم شمس الہدیٰ اہلِ ذوق تھے ۔

خلیل صاحب ۳ جنوری ۱۹۳۰ء کو اپنے آبائی وطن میں پیدا ہوئے ۔ دس سال کی عمر میں اپنے چچا مولوی محمد حسین کے ساتھ بیتیا ، ضلع چمپارن ، بہار چلے گئے جہاں اُن کا کاروبار تھا ۔ آپ نے وہیں ابتدائی تعلیم پائی اور کرانسٹ راجہ ہائی سکول بیتیا سے انٹرنس کا امتحان پاس کیا ۔ ۱۹۴۴ء میں آپ کے چچا کا کاروبار لکھنؤ منتقل ہوا تو ان کے ہمراہ آپ بھی لکھنؤ آ گئے اور لکھنؤ کرسچین کالج سے ایف اے پاس کیا ۔ لکھنؤ یونیورسٹی میں بی اے کا داخلہ لیا تھا کہ ملک تقسیم ہو گیا اور اپنے خاندان کے ہمراہ ۱۹۴۷ء میں کراچی چلے آئے ۔ یہاں فکرِ معاش ہوئی تو آپ نے پاکستان کی مرکزی وزارتِ مواصلات کے ریلوے ڈویژن میں ملازمت کر لی ۔ لیکن کراچی کی آب و ہوا موافق نہ آئی ۔ ۱۹۵۱ء میں آپ لاہور آ گئے اور ماڈل ٹاؤن میں رہائش اختیار کر لی ۔ یہاں کچھ عرصہ محکمہ مردم شماری ریلوے میں ملازمت کی لیکن کچھ زرعی زمینیں میسر آ جانے پر نوکری ترک کر دی ۔

آپ نے ۱۹۵۳ء میں پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل پاس کیا اور ۱۹۵۵ء میں بی اے کر لیا ۔

آپ کو ادب کا شوق بچپن ہی سے رہا ۔ سکول کے زمانہ میں یہ زیادہ اُجاگر ہوا ۔ ہائی سکول بیتیا میں مولوی عبدالحکیم ارمان اردو اور فارسی کے ٹیچر تھے ۔ وہ خود ایک اچھے شاعر اور ادیب تھے ۔ اور نوح ناروی کے تلامذہ میں سے تھے ۔ ان کے علاوہ سکول کے بعض دوسرے اساتذہ بھی ادیب اور شاعر تھے ۔ سکول میں مشاعرے ہوتے ۔ ادبی مجلسیں جمتیں اور تنقیدی نشستیں ہوتیں ۔ اِس فضا

میں خلیل صاحب کی ادبی صلاحیتوں کو خوب فروغ ملا اور آپ مضامین لکھنے لگے ۔ زیادہ مطالعہ اور مشق سے مزید پختہ کار ہو گئے اور تنقیدی مقالات، معاشرتی مضامین اور ادبی نگارشات کی تخلیق کرنے لگے ۔ انجمن ترقی ادب ماڈل ٹاؤن کے آپ سرگرم رکنِ مجلسِ انتظامیہ اور خازن ہیں ۔

کنور مقصود احمد خاں

کنور مقصود احمد خان انجمن ترقیِ ادب کے ایک بانی رکن اور سب سے پہلے صدر ہیں۔ آپ شعر و ادب کا نہایت عمدہ ذوق رکھتے ہیں۔

کنور مقصود احمد خان ۱۱ جنوری ۱۹۳۱ء کو پانی پت ضلع کرنال میں پیدا ہوئے۔ آپ بڈھانسی ضلع بلند شہر کے ایک نومسلم راجپوت گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ کے جدِ امجد راجہ لال خان نے حضرت مجددِ الف ثانی کے دستِ مبارک پر اسلام قبول کیا اور ان کے بعد سے یہ خاندان لال خانی خاندان کے نام سے مشہور ہوا جس نے دُنیوی اور دینی دونوں اعتبار سے بڑی ترقی کی۔ اس خاندان کے دو افرادِ سرکارِ واجد علی خان اور سرکارِ احمد علی خان نقش بندی سلسلے کے بڑے بزرگوں میں شمار ہوتے ہیں۔ دُنیوی اعتبار سے بھی اس خاندان نے بڑا نام پیدا کیا اور اس کے متعدد ارکان نے نواب، سَر اور ستارۂ ہند کے اعزاز حاصل کئے مثلاً سر نواب فیاض علی خان بہادر ستارۂ ہند آف پہاسو اور نواب سر احمد سعید خان ستارۂ ہند آف چھتاری وغیرہ وغیرہ۔

آپ نے علی گڑھ میں تعلیم مکمل کی اور تکمیلِ تعلیم کے فوراً بعد پاکستان چلے آئے۔ شعر و ادب کا ذوق فطری ہے اور ماڈل ٹاؤن میں انجمن ترقیِ ادب کے قیام میں آپ کی کاوشوں کو بڑا دخل ہے۔ آپ شروع سے اب تک انجمن کی مسلسل خدمت کر رہے ہیں اور اس کی مجلسِ انتظامیہ کے رکن ہیں۔

○

پروفیسر شفیع سرور ایم اے

میاں شفیع سرور گورداسپور کے ایک بڑے معزز زمیندار خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ کے والد بزرگوار میاں محمد دین زمینداری کرتے تھے اور زرعی اجناس کے کمشن ایجنٹ بھی تھے۔

میاں شفیع سرور ۱۱ اکتوبر ۱۹۱۶ء کو گورداسپور میں پیدا ہوئے۔ گھر کا ماحول نہایت پاکیزہ اور مذہبی تھا۔ آپ کے والد کی یہ تمنا تھی کہ آپ کو قرآن حفظ کرایا جائے اور محض دینی تعلیم دلا دی جائے۔ چنانچہ آپ کو قرآن حفظ کرانے کی غرض سے ایک حافظ مقرر کر دیئے گئے۔ حافظ صاحب نہایت سخت مزاج آدمی تھے۔ شفیع سرور نے اُن سے قرآن تو پڑھ لیا لیکن اس سے آگے دل نہ جما۔ آپ کے جو ہم عمر بچے سکول میں داخل تھے وہ آ کر بتاتے کہ کس طرح اُن کے استاد نرمی اور محبت سے پڑھاتے ہیں تو شفیع سرور کے دل میں حافظ صاحب کی درشتی کے خلاف اور بھی بغاوت پیدا ہو جاتی۔ آخر آپ کو گورنمنٹ ہائی سکول گورداسپور کی تیسری جماعت میں داخل کرا دیا گیا جس کا ماحول آپ کو بہت پسند آیا اور آپ جلد ہی کلاس میں چوٹی کے طالب علم شمار ہونے لگے۔ ۱۹۳۲ء میں آپ نے اس سکول سے انٹرنس کا امتحان پاس کیا اور اعلیٰ تعلیم کے لئے لاہور آ گئے۔

لاہور آ کر آپ نے گورنمنٹ کالج کی ایف ایس سی کلاس میں داخلہ لیا اور کلاس میں خوب چمکے۔ ایف ایس سی پاس کرنے کے بعد آپ نے اسی کالج سے بی ایس سی زوالوجی آنرز کے ساتھ پاس کیا۔ زوالوجی آنرز میں آپ یونیورسٹی بھر میں اوّل آئے اور گورنمنٹ کالج کے رول آف آنرز میں آپ کا نام لکھا گیا ساتھ ہی سب سے بڑا انعام ملا۔

گورنمنٹ کالج لاہور میں قیام کے دوران آپ تقریر و تحریر کے مقابلوں میں شریک ہونے اور

ابتدا حاصل کرنے پر انعامات حاصل کرتے رہے ۔ کالج کی ڈی بیٹنگ ٹیم کے ممتاز رکن تھے ۔ زبان پر خوب عبور تھا ۔ کئی انعامات جیتے ۔ کالج میگزین "راوی" میں اردو اور انگریزی مضامین لکھتے رہے جنہیں بہت سراہا جاتا رہا ۔ آپ کالج کی رسومنگ ، تیراکی ٹیم کے بھی ممبر تھے ۔

۱۹۴۰ء میں میاں شفیع سرور نے پنجاب یونیورسٹی سے ایم ایس سی کا امتحان پاس کیا اور محکمہ زراعت کے شعبہ ریسرچ میں ملازم ہو گئے ۔ جلد ہی آپ کو محکمہ زراعت نے گورداسپور میں اپنے ریسرچ سنٹر کا آفیسر انچارج لگا دیا ۔ گورداسپور میں ایک بہت بڑا زراعتی فارم تھا ۔ شوگر کین کے کیڑوں کی ریسرچ آپ کے سپرد ہوئی ۔ آپ نے اس فرض کو خوب نبھایا اور اس ریسرچ کے نتائج پر چار کتابیں لکھیں ۔ پھر آپ نے دیمک کی ریسرچ کی اور اس پر پانچ کتابیں تصنیف کیں ۔

اکتوبر ۱۹۴۵ء میں آپ نے اس آسامی سے استعفیٰ دے دیا جس دن آپ کا استعفیٰ منظور ہوا عین اُسی دن آپ کو گورنمنٹ کالج ملتان میں جونیئر لیکچرار ان زوالوجی کی آسامی پیش کی گئی جو آپ نے اُسی وقت قبول کر لی اور ملتان چلے گئے ۔ ۱۹۴۷ء میں آپ ملتان سے تبدیل ہو کر سینئر لیکچرر کے طور پر گورنمنٹ کالج لاہور میں آ گئے جہاں اگست ۱۹۵۰ء تک رہے ۔

اب آپ کو گورنمنٹ انٹرمیڈیٹ کالج لائل پور کا پرنسپل بنا دیا گیا اور درس و تدریس کے ساتھ انتظامی فرائض بھی شامل ہو گئے ۔ مارچ ۱۹۶۲ء میں آپ گورنمنٹ کالج سرگودھا کے پرنسپل مقرر ہوئے اور سرگودھا آپ کا مستقر ٹھہرا ۔ اِس وقت آپ اسی آسامی پر فائز ہیں اور سرگودھا ہی میں مقیم ہیں ۔

میاں شفیع سرور کا وجود سائنس اور ادب کا ایک حسین امتزاج ہے ۔ جہاں آپ نامور سائنس دان ہیں وہاں بہترین ادیب بھی ہیں ۔ دماغ اور دل یا زیادہ صحیح الفاظ میں اوراک وجذبات کا توازن جس کی مثال میاں شفیع سرور ہیں بہت ہی نادر اور کمیاب ہے ۔ ادب کا ذوق آپ کا فطری جذبہ ہے ۔ گورنمنٹ کالج لاہور کی طالب علمی کے زمانہ میں آپ بلند پایہ تنقیدی اور معاشرتی مضامین کالج میگزین "راوی" اور دوسرے اردو رسائل میں لکھتے رہے ۔ محکمہ زراعت کے ریسرچ آفیسر کے طور پر گورداسپور میں متعین ہوئے تو وہاں کی ادبی مجلس "بزم ضیائے ادب" کو زندہ کیا ۔ اُس کی سرگرمیوں میں جدت اور تیزی پیدا کی جس سے اُس کے زیر اہتمام باقاعدگی سے مشاعرے ہونے لگے ۔ پھر یہ مشاعرے آل انڈیا مشاعروں کی صورت اختیار کر گئے یہ ۱۹۴۰ - ۴۵ء کی بات ہے ۔ پانچ سال بعد گورداسپور سے رخصت

ہوئے تو ملتان پہنچے ۔ وہاں پہنچتے ہی آپ نے ایمرسن کالج میں مجلسِ اقبال کی بنا ڈالی اور اُسے پروان چڑھایا ۔ وہاں بھی جلد ہی آل انڈیا مشاعرے منعقد ہونے لگے ۔ میاں شفیع سرور ۱۹۴۷ء میں ایمرسن کالج ملتان سے ترقی پا کر لاہور آ گئے لیکن مجلسِ اقبال اب بھی ایمرسن کالج میں موجود ہے ۔ اب آپ گورنمنٹ کالج سرگودھا کے پرنسپل ہیں ۔ آپ کے دم سے اب سرگودھا میں خوب ادبی ہنگامے برپا رہتے ہیں ۔ اس کالج میں مجلسِ اقبال پہلے سے موجود تھی ۔ اس میں آپ نے نئی زندگی ڈالی ۔ پھر ایک نئے ادبی ادارے "مجلسِ علم و ادب" کو جنم دیا جس کے ذمے زیادہ تر یہ کام ہے کہ وہ سائنس کے مضامین کو اردو میں منتقل کرے ۔ چنانچہ میگزین "ضیا بار" کا ایک سپیشل نمبر بھی اس سلسلہ میں شائع کیا ۔ سرگودھا اگرچہ لاہور سے خاصا دور ہے لیکن وہاں نہایت خوش گوار ادبی سرگرمیاں خوب زوروں پر ہیں ۔ ان ادبی سرگرمیوں میں میاں شفیع سرور کا بڑا حصہ ہے ۔ آپ ادبی مجلسوں کی صدارتیں کرتے ہیں ۔ وہاں کے شعرا و ادبا کی نگارشات پر تعارفیے لکھتے ہیں ۔ ادبی مشورے دیتے ہیں ۔ ممتاز شعرا و ادبا کو کالج میں بلاتے ہیں ۔ ان کے ساتھ "مد شامیں" منائی جاتی ہیں ۔

میاں شفیع سرور نے کالج میں ایک مجلسِ قرآن قائم کر رکھی ہے ۔ جس کا اصل مقصد طلبا میں اسلامی سیرت پیدا کرنا اور انہیں قرآن کے مطالب سے محبت سکھانا ہے ۔ چنانچہ ہر صبح پورے کالج کو آدھ گھنٹہ درسِ قرآن دیا جاتا ہے ۔ پھر کالج میں چالیس چالیس لڑکوں کے گروپ بنائے گئے ہیں ۔ ان گروپوں کو مجلسِ قرآن باقاعدہ قرآن پڑھاتی ہے ۔ اس مقصد کے لئے دو مولوی ہمہ وقتی مقرر ہیں ۔ یہ مولوی صاحبان قرآن پڑھاتے ہیں اور درس بھی دیتے ہیں ۔ میاں شفیع سرور کی یہ سکیم بہت کامیاب رہی ہے ۔ طلبا میں ایک خاصی تعداد ایسی پیدا ہو گئی ہے جو قرآن پڑھنے اور درسِ قرآن سننے کے لئے دیوانہ وار کھنچی آتی ہے ۔

میاں شفیع سرور کا خیال ہے کہ ہماری معاشرتی زندگی میں غیر معمولی ہیجان اور اعصابی تناؤ اس لئے ہے کہ افرادِ قوم کے سامنے کوئی مقصد، کوئی نصب العین، کوئی منزلِ مقصود نہیں ہے ۔ بلکہ اُن پر زندگی ہی کا مقصد واضح نہیں ۔ آپ کے خیال میں پہلے افرادِ قوم کو مقصدِ زندگی کا علم ہونا چاہیئے اور یہ بات انہیں قرآن ہی بتا سکتا ہے ۔ دوسرا کوئی ذریعہ نہیں ۔ موجودہ حالات میں قوم کی راہنمائی قرآن اور درسِ قرآن ہی کر سکتا ہے ۔

ادبی بحث میں آپ کو تاریخ اور مذہبیات سے گہری دلچسپی ہے ۔ افسانوی ادب سے آپ کو لگاؤ ہے ۔ مگر نسبتاً کم ۔ شعرا میں آپ کو غالب ، اقبال ، اصغر گونڈوی بہت پسند ہیں ۔ افسانوی ادب میں آپ کرشن چندر کے بڑے دلدادہ ہیں ۔ آپ کا خیال ہے کہ ادیب کو ملک کے معاشرتی تقاضوں کا علم ہونا چاہیئے ۔ یہ ادیب کا فرض ہے کہ وہ معاشرے کی اصلاح اپنے ذمہ لے ۔ دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہے کہ ادیب کا سوشل ریفارمر ہونا نہایت ضروری ہے ۔ اگر ادیب ، سوشل ریفارمر نہیں تو وہ کچھ بھی نہیں ۔ کرشن چندر اس لئے ایک عظیم ادیب ہے کہ معاشرے کی برائیوں پر قلم اٹھاتے وقت وہ کسی کا لحاظ نہیں کرتا ۔ پھر اس میں سلیقہ ہے شستگی ہے ۔ وہ معاشرے کی برائیوں کا تجزیہ کرتے وقت ابتذال اور عریانی پر نہیں اتر آتا ۔

میاں شفیع سرور کا خیال ہے کہ ہمارے ادیب ملک کے تقاضوں کے مطابق نہیں لکھ رہے ۔ ان کی بہت بڑی اکثریت اصلاح معاشرہ کی طرف توجہ نہیں دے رہی ۔ وہ سوشل ریفارمر نہیں ۔ آپ کا خیال ہے کہ ہمارے ادبا نے ملک کے تقاضوں کے مطابق جو تھوڑا بہت ادب پیدا کیا ہے اس میں عبدالرشید تبسم کے افسانے جن کا مجموعہ حال ہی میں " دوست اور دشمن " کے نام سے شائع ہوا ، ممتاز مقام رکھتے ہیں ۔

آپ گذشتہ ایک سال سے انجمن ترقی ادب ماڈل ٹاؤن لاہور کے باقاعدہ رکن ہیں ۔

○

امجد معصوم

محترم امجد علی خان معصوم کا تعلق مالیر کوٹلہ کے ایک معزز زمیندار خاندان سے ہے جس کے بیشتر افراد مالیر کوٹلہ میں اہم فوجی اور غیر فوجی عہدوں پر فائز رہے۔ ۱۹۲۳ء میں وہیں آپ کی ولادت ہوئی۔ ابتدائی تعلیم مالیر کوٹلہ میں حاصل کی۔ اور مشاعروں میں شرکت کا آغاز وہیں سے کیا۔ اِن مشاعروں نے آپ کے ادبی ذوق کو جلا بخشی اور آپ کو بچپن ہی سے شعروادب کا دلدادہ بنا دیا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد لاہور آگئے اور یہاں سے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔

مختلف موضوعات پر مضامین لکھنے کا سلسلہ آپ نے کالج کے زمانے سے ہی شروع کر دیا تھا۔ پہلے کالج میگزین میں مضامین لکھتے رہے۔ پھر مختلف ادبی رسائل میں ان کے افسانے اور مضامین شائع ہونے لگے۔ آپ انجمن ترقی ادب ماڈل ٹاؤن کے ساتھ گذشتہ دس برس سے منسلک ہیں۔ اُس وقت سے ہمیشہ اس کے سرگرم رکن رہے ہیں۔ انجمن کی مختلف تنقیدی مجالس میں آپ مضامین اور افسانے پڑھ چکے ہیں۔ اِن کی نگارشات پر اہلِ ذوق نے ہمیشہ خراجِ تحسین ادا کیا ہے۔